



1670

Mohd. Yousuf  
Sindery M. A. Library  
A. M. U., Amritsar.  
Date.....



قند اردو  
QAND-I-URDU

REVISED EDITION

FOR

*High School Examination, 1926. U. P. and  
Matriculation Examination 1926 of the  
Punjab Province, Lahore.*

BY



Allahabad :

PRINTED AT AND PUBLISHED BY :

**Anwar Ahmadi Press.**

1st Edition 500 ]

1923.

[Price 1/

*All rights reserved.*



008

M.A. LIBRARY, A.M.U.



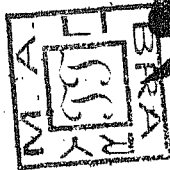
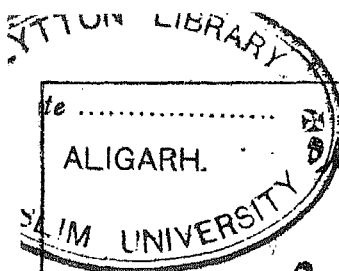
U4731

31  
OFF  
F441  
26-9-87 Y

87  
100 ✓  
RE-ACCESSIONED

CHECKED-2002  
Tasir

17



# قتدار و

مؤلفہ

ناب مولوی حافظ جمال الدین احمد جعفری زمینی

مدرس عربی و فارسی گورنمنٹ انٹر میڈیٹ کالج آباد

رکن انجمن ترقی اردو حیدر آباد دکن

منشی محمد اسماعیل صاحب منیر کے اہتمام سے

طبع انوار احمدی الہ آباد میں طبع ہوا

قیمت فی جلد غیر

(تمام حقوق محفوظ ہیں)

۵۰۰

## ناظرین ہائے سکین

میں نے ۱۹۱۶ء میں یہ انتخاب مٹرکیولیشن کے لئے  
 تیار کیا تھا جس کو ممبران الہ آباد یونیورسٹی اور پنجاب  
 یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ نے پسند فرمایا ہیں اُن  
 حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چونکہ اس کے  
 بعض مضامین پنجاب یونیورسٹی کے نصاب اُردو میں بھی  
 موجود تھے اس لئے میں نے اس سال اس میں ترمیم کی۔  
 سرسید کا ایک مضمون نکال کر دوسرا اس کے بجائے رکھ دیا  
 اور مولوی عبدالعلیم شرر کے کل مضامین نکال کر اس سے  
 بہتر اور مضامین اضافہ کر دئے۔ اور ڈاکٹر اقبال کی دو اور بہت  
 نظمیں اضافہ کر دیں۔ اب مجھے امید ہے کہ یہ انتخاب پنجاب  
 یونیورسٹی کے لئے بھی پہلے سے زیادہ مفید ثابت  
 ہوگا۔ اور ہائی اسکول اگزامنیشن کے لئے بھی ممبران  
 انٹر میڈیٹ بوڈ الہ آباد اس کو پسند فرمائیں گے۔  
 ناچیز مؤلف

# فہرست مضامین قند اردو

## شہ

صفحہ	عنوان مضامین	صفحہ	عنوان مضامین
۴۱	ملشی غلام غوث بیخبر	۱	میرامن دہلوی
۴۲	سج اور دوپہر اور شام ہونے کا معنی (از نقاب بیخبر)	۲	پچھلے دہائی کی سیر (از باغ و بہار)
۴۵	شہید کی انشا سے بہار بیخبر کی تقریظ (از نقاب بیخبر)	۴	مرزا رجب علی بیگ تھوڑ
۴۸	خط مولوی غلام امام شہید کے نام (از نقاب بیخبر)	۷	شہزادے کے بدر ہونے کے بعد قتل گاہ
۴۹	مولوی محمد حسین آزاد	۱۳	جلا کی سرگزشت (از فائدہ عیاش)
۵۰	بیچ بھاشا پیر علی فارسی زبانوں نے کیا لکھا (از نقاب بیخبر)	۱۴	مرزا اسد اللہ خاں خاکی
۱۱۱	شہریت عام اور بقاعہ دوام کا دربار (از نیرنگ خیال)	۱۶	رحمت (از اردو سے مٹلی و غور ہندی)
۱۳۳	مولوی وکلاء اللہ دہلوی	۳۲	مولوی غلام امام عفتہ
۱۳۴	عقبت چیزوں میں شان الہی نمایاں ہے (از معلم الاخلاق)	۳۵	روحہ سماج گنج کی تعریف (از انشا سے بہار)
۱۳۶	گھر کی تربیت (از مسلم الفضائل)	۴۲	رقعہ تعلیم و تربیت (از انشا سے بہار)
		۴۳	بنیاد یہ خزاں
		۴۵	ڈاکٹر سید سید احمد خاں
		۴۵	انکسور و تربیت (از تہذیب الاخلاق)
		۴۵	پتی مدو آب کرنا (ایضاً)
		۵۵	نہارا ہوا زمانہ (از تہذیب الاخلاق)

صفحہ	عنوان مضامین	عنوان مضامین
۱۴۵	مولوی نذیر احمد دہلوی	غالب کی اردو نشر پر۔ (از یادگار غالب)
۱۴۶	انگریزوں کی عظمت کی اصلی وجہ۔	(از ابن الوقت)
۱۵۱	نذیب اور عقل۔ (از ابن الوقت)	میر انیس کی شاعری کے خصوصیات
۱۵۶	کارخانہ عالم۔ (از ابن الوقت)	(از مواہب)
۱۶۵	ہمارے تعلیم۔ (از کچہر)	مولوی عبدالحکیم شرر عباسی
۱۶۰	پینڈت رتن ناتھ ور شرشار	خاموش آسمان۔ (از داکٹر)
۱۶۰	گھنٹہ کا محرم۔ (از فسانہ آزاد)	سکندر کا تابوت۔
۱۶۵	تہمت کی بہار۔ (از فسانہ آزاد)	کچھ عورت۔
۱۶۶	برائے کی دھوم۔ (از فسانہ آزاد)	فیروز کوہ کی گھاٹیاں۔ (از ماہ ملک)
۱۸۰	خواجہ الطاف حسین حالی	چاندنی رات سسنان بیلان اور
۱۸۳	مجاورہ اور روزمرہ۔ (از مقدمہ)	ایک سوار۔ (از ملک لغز اور درجن)
	شعر و شاعری	مولوی عبدالرشید دہلوی
۱۸۶	نیچرل شاعری۔ (از مقدمہ شعر و شاعری)	منازل حیات (از منازل السائرہ)

صفحہ	عنوان مضامین	عنوان مضامین
۲۵۵	مرزا محمد رفیع سودا	خواجہ میر درد
۲۶۰	تھیانہ۔	نثریات۔
۲۶۷	نثریات۔	رباعیات۔

صفحہ	عنوان مضامین	صفحہ	عنوان مضامین
۳۲۵	امیر سلامت علی دہیر	۳۲۴	امیر محمد تقی میر
۳۳۵	سچ کا سان	۳۲۶	غزلیات -
۳۳۶	شہید آباد	۲۸۲	شیخ امام بخش ناسخ
۳۳۸	گھوڑے کی تقریب	۲۸۲	غزلیات
۳۳۹	منشی امیر اللہ تسلیم	۲۹۱	خواجہ حیدر علی آتش
۳۴۰	محمد از نالہ تسلیم	۲۹۳	غزلیات
۳۴۱	نالہ عاشقانہ تسلیم	۲۹۴	شیخ محمد ابراہیم ذوق
۳۴۲	محمد باری تالی - از شام غریبان	۳۰۰	قصائد -
۳۴۵	خواجہ الطاف حسین حالی	۳۰۴	سہرا -
۳۴۵	منظرہ واعظ و شاعر	۳۰۶	غزلیات -
۳۵۲	رباعیات -	۳۱۱	مرزا اسد اللہ خاں غالب
۳۵۳	ڈاکٹر محمد اقبال ایم - اس کے	۳۱۱	قصائد -
۳۵۵	شعب اور شاعر	۳۱۲	صفت ائمہ -
۳۵۵	ستارہ	۳۱۴	قطعہ -
۳۵۶	قرآنہ	۳۱۴	غزلیات -
۳۵۶	نیا سوال -	۳۱۹	میر میر علی انیس
۳۵۷	ایک آئینہ -	۳۲۰	شہادت -
۳۵۸	راز ہستی -	۳۲۱	منظرہ درخت -
۳۵۹	سید اکبر حسین آبادی	۳۲۳	منظرہ سینی سین -
۳۶۰	غزلیات -	۳۲۶	رزنیہ -
۳۶۱	رباعیات -	۳۲۷	انفرت دنیا و محبت حق -

## مَعْدَرِ نَاطِرِین

آج کل آردو زبان کے جس قدر انتخابات مقرر ہوئے ہیں اور ہائی اسکول انجمنیں میں جاری ہیں ان کو دیکھ کر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ ان کلاسوں کے لئے ایک ایسا انتخاب ہونا چاہئے جس سے طلباء کے سلسلے آردو زبان کی ابتدا سے آج تک کے تغیرات کا ایک نقشہ کھینچ جائے اور مضامین ایسے دلچسپ ہوں کہ طلباء اس کو مشغول سے پڑھیں اور نیچے کے درجوں سے کسی قدر مشکل ہوں جس سے ان کا استعداد میں ترقی ہو اور اس قدر کلام کا انتخاب لیا جائے جو دو سال کی تعلیم کے لئے کافی ہو۔ لہذا تمام باتوں کا خیال کر کے یہ انتخاب تیار کیا گیا۔

اس میں پہلے میرا من و ہوا اور مہرور لکھنؤی کے کلام سے ٹھوڑا ٹھوڑا انتخاب اس غرض سے کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ابتدا میں دہلی اور لکھنؤ کی تحریک کا کیا رنگ تھا۔ اس کے بعد اور لوگوں کے کلام کا انتخاب رکھا گیا ہے۔ اس کی ترتیب میں قدیم و تاجریہ مضمونوں کے ساتھ وفات کے اعتبار سے کی گئی۔ غالب سے سب سے اوّل وہ شخص ہیں جنہوں نے انشا پر نفاذی کا رنگ پلٹا۔ مہر سید نے آردو نثر کو قدیم شاہراہ سے بھڑکے ساوگی پیدا کر دی۔ اور آردو زبان میں مضمون نویسی اور کچھ دھجی کی راہ کھول دی۔ اور آردو زبان کی ترقی اور اس کی بقا کے لئے کوئی امکاں تدبیر آٹھانی

رکھی۔ آزاد کا کوئی خاص رنگ نثر میں نہیں ہے۔ مگر اُن کو  
 نثر لکھنے میں ایسی کامل قدرت تھی کہ رنگین اور سادہ۔  
 سنان اور مشکل۔ ہر طرح کی عبارت لکھ سکتے تھے اور جس رنگ  
 کی عبارت لکھتے تھے دل آویز ہوتی تھی۔ حالی اگرچہ نثر میں کسی  
 خاص طرز کے موجد نہیں مگر ان کا رنگ تحریر سرسبز اور آزاد کے  
 بعد سب پر فوق پڑ گیا۔ مولوی مزیہ احمد دہلوی کا کلام دہلی  
 کی زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ شہر ناول اور خیالی مضامین یا  
 مناظر قدرت یا کسی سین کے عمدہ پہرے میں ادا کر سکتے تھے  
 بادشاہ ہیں۔ شبلی نعمانی کا طرز تحریر سادہ ہے اور اس قدر  
 دل آویز کہ قابل رشک ہے۔ نہڑت، رنگ، نائید، شہر، جدید طرز  
 شاعرانہ تالیسی کے موجد ہیں۔ مولوی ذکاء اللہ کی زبان میں اگرچہ  
 کوئی خاص بات نہیں مگر سادگی اور بسیاختہ پن اور طراخت کا  
 پٹھانہ زیادہ ہے اور جس قدر آزاد زبان میں ان کی تصنیفات ہیں  
 کسی اور کی نہیں مگی۔ منشی غلام غوث بیخبر غالب کے ہم عصر ہیں  
 ان کے قدم قدم چلتے ہیں۔ شہید رنگین عبارت لاجواب لکھتے  
 ہیں۔ مولوی سعید الرشید صاحب نے زندگی کے منازل کا ایک سچا  
 فوٹو آرا ہے کہ قابل دید ہے۔

نظم میں شعراء اردو کے ارکان ثلاثہ کے کلام سے پہلے انتخاب  
 لایا گیا۔ اس کے بعد اور شعرا کا۔ یہ امر مسلم ہے کہ فارسی طرز  
 کے زوردار قصائد ابتداء سہودا کے برابر اور آخر زمانہ میں  
 ذوق سے بڑھکر کسی نے نہیں لکھے۔ نصرت جو ایشیائی شاعری



کا جزو اعظم ہے میر درد سے بہتر آج تک کوئی نہیں لکھ سکا۔ زبان  
 کی سلاست جیسی میسر تھی میر میں ہے کسی کو نصیب نہیں ہوئی  
 اور سودا۔ میر۔ درد۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے محض شاعری ہی  
 نہیں کی بلکہ زبان کو تمام عیوب سے پاک و صاف کیا۔ ناسخ اور  
 آتش کو بھی زبان کی خدمت میں وہی رتبہ حاصل ہے۔ جو سودا  
 میر۔ درد کو تھا۔ انہوں نے جو عیوب باقی رہ گئے تھے ان کو درست  
 کر کے زبان کو نہایت فصیح و بلیغ بنا دیا۔ اُس وقت سے لکھنؤ میں یہی  
 زبان جاری ہو گئی۔ ان کا کلام لکھنؤ کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔  
 غالب سے بڑھ کر فلسفیانہ کلام کسی نے نہیں لکھا۔ انیس اور دہیر  
 نے نظم اردو میں جس قدر وسعت دی اور اردو زبان کو جس قدر  
 اُسے مدد پہنچی آخر زمانہ میں کسی سے نہیں پہنچی۔ صدہا جدید  
 مجاورے ایجاد کئے۔ صدہا جدید الفاظ زبان میں داخل کر دیے۔ امرت  
 تسلیم کی فتویاں راجواب ہیں۔ حالی نظم میں طرز جدید کے موجد اور  
 مسلم الثبوت استاد ہیں۔ اقبالی حالی کے نظم بقدم چلتے ہیں اور  
 اس زمانہ میں ان کا طرز نہایت مقبول ہے میر اکبر حسین اپنے  
 طرز خاص میں مسلم الثبوت استاد ہیں۔  
 اس انتخاب میں کہن لوگوں کا کلام یا گیا ہے ان کے حالات  
 اور ان کے خصوصیات بھی لکھے گئے ہیں جس سے طلباء کو کلام کے  
 سمجھنے کا ایک مذاق پیدا ہو جائیگا۔ ناظرین سے امید ہے کہ اگر کہیں وقت  
 و لغزش پائیں تو اصلاح فرمائیں۔ ہدف ملامت نہ بنائیں۔ فقط  
 ناچیز جمال الدین احمد جعفری زمینی کات اللہ

## بسم اللہ الرحمن الرحیم میرامن دہلوی

بڑے نامور اور خاندانی شخص گذرے ہیں جن شعر میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔  
اپنی طبیعت کی موزوں سے آپ شاعر بن گئے۔ خود فرماتے ہیں کہ میری آرزو  
مکملاتی ہے۔ کیونکہ میں ولی کا روٹا اور میں کا پرورش یافتہ ہوں۔ انکے آبا و  
اجداد ہمایون بادشاہ کے عہد سے شنایانِ مغللیہ کی خدمت میں بااعزاز و  
صاحبِ جاگیر و مناصب رہے۔ سلطنتِ مغللیہ کے زوال کے بعد جب ولی کے گرد  
و خراج میں جاؤں کا عمل ہو گیا۔ تو سورجِ مل جاٹ نے اُن کی جاگیریں ضبط  
کر لیں۔ اور احقر شاہِ گزالی نے انکا ٹھکانہ بارناخت و تاراج کر دیا۔ اس وقت  
مجبوراً آپ نے اپنا وطن چھوڑ کر پُرب کا رخ کیا۔ کچھ روز عظیم آباد قیام کر کے  
تہلاش روزگار کلکتہ پہنچے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں کلکتہ کے مشہور قلعہ  
فورٹ ولیم میں سرکارِ انگریزی کی طرف سے ایک کالج اُن انگریزوں کی تعلیم  
کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ جو ولایت سے ایٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہو کر ہندوستان  
آیا کرتے تھے۔ محض ان میں لارڈ ولزلی نے گل گراؤنٹ صاحب کو اس کالج  
کا پرنسپل مقرر کیا۔ صاحب موصوت کو ہندوستانی زبان کی تدوین کا خاص شوق تھا  
انھوں نے خود بھی انگریزی زبان میں قواعد آرو لکھی اور ٹوکشری تیار کی۔ اور  
قابلِ مصنفوں سے نثر آرو میں کتابیں لکھوائیں۔

منشی میر بہادر علی صاحب نے ڈاکٹر گل گراؤنٹ صاحب بہادر کے  
زہد و انگویش کر دیا۔ انھوں نے قدر افزائی فرمائی۔ بے روزگاری کی شکایت دفع

ہوائی اور کلمہ آپ کا مسکن ہو گیا سنہ ۱۱۷۰ میں ڈاکٹر کل گرائسٹ صاحب کی  
فرائض سے آپ نے قصہ چہار درویش مصنفہ امیر خسرو دہلوی فارسی سے  
اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام باغ و بہار رکھا ان کی زبان صاف اور سلیس  
اور عام فہم ہونے کے علاوہ اس زمانہ کی روز مرہ اردو اور محاورات دہلی کا نہایت  
صحیح نمونہ ہے۔

## انتخاب از باغ و بہار پہلے درویش کی سیر

یہ سرگذشت میری ذرا کان دھر سنو      چکو فلک نے گردیا زیرو نہ سنو  
جو کچھ کہ پیش آئی ہے شدت مرے تئیں      اس کا بیان کرتا ہوں تم سربسرسنو  
اسے یاروں! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز  
کا ملک الشجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا  
پہپاری اُن کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید و فروخت  
کے واسطے مقرر تھے۔ اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کے گھر میں موجود  
تھے۔ اُن کے یہاں ڈولر کے پیدا ہوئے۔ ایک تو یہی فقیر جو کھنی سیلی پہنے ہوئے  
مرشدوں کے حضور میں حاضر اور بولتا ہے۔ اور دوسری ایک ہن۔ جس کی قبلہ گاہ  
نے اپنے جیتے جی ایک مشر کے سوداگر بچے سے شادی کر دی تھی۔ وہ اپنی سسرال  
میں رہتی تھی۔ غرض جس کے گھر میں اتنی دولت ہو اور ایک لڑکا ہو اس کے  
لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے۔ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چور سے ماں باپ کے سایہ  
میں پرورش پائی۔ اور پڑھنا لکھنا۔ سپاہگری کا کسب و فن سوداگری کا بھی کھانا

روزانہ سیکھنے لگا۔ چوڑھ برس تک شاہیٹ خوشی اور بے فکرگی میں گزری۔ کچھ دنیا  
 کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یکا یک ایک ہی سال میں والدین تھکے الٹی سے  
 مر گئے۔ عجب طرح کا غم ہوا! جس کا بیان نہیں ہو سکتا کیبارگی میٹم ہو گیا۔  
 کوئی سر پر بوڑھا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن روپا کرتا۔ کھانا  
 پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں جوں توں کر کے گزرے۔ چہلم میں اپنے بیگنا  
 چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی سب نے فقیر کو باپ کی  
 کپڑی بندھوائی۔ اور سمجھایا۔ دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آتے ہیں۔ اور  
 اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے۔ پس صبر کرو۔ اپنے گھر کو دیکھو۔ اب باپ کی  
 جگہ تم سوار ہوئے۔ اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار ہو یا تسلی دیکر وسعت  
 ہوئے۔ گناہتے۔ کاروباری نوکر چاکر۔ جتنے تھے۔ آں کر حاضر ہوئے ندیں دیں  
 اور بولے۔ دیکھو نقد و جنس کی اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجئے۔ کیبارگی جو  
 اس دولت بے انتہا پر نگاہ پڑی۔ آنکھیں کھل گئیں۔ دیوانخانے کی تیاری کو  
 حکم کیا۔ فرمائشوں سے فرش فروش بچھا کر چھت پر دے چلوں نہ تکلف کی  
 لگا دیں۔ اور اچھے اچھے خدمتگار چوہدار نوکر رکھے۔ سکھار سے ذوق برق  
 کی پوشاکیں بنوا دیں۔ نفع مند پر تکب لگا بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے پھانگے  
 مفت کھانے پینے والے۔ چھوٹے خوشامدی آکر آشنا ہوئے۔ اور مصاحب  
 بنے۔ ان سے آٹھ پر صحبت ہونے لگی۔ ہر طرح کی باتیں اور ڈٹلیں۔ وہابی  
 شاہی اوصاف اور سنی کرتے۔ اور کہتے۔ اس جوانی کے عالم میں عیش کیجئے۔  
 غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج  
 بھٹک گیا۔ شراب۔ تاج اور چوے کا چرچا شروع ہوا۔ پھر تو یہ نوبت پہنچی۔  
 کہ سوداگری بھول کر تماش بینی اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور

رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی۔ جو جس کے ہاتھ پڑا۔ الگ کیا۔ گویا ٹوٹ چادی۔  
 کچھ خرچ نہ تھی۔ کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے؟ کہاں سے آتا ہے؟ اور کدھر جاتا ہے؟  
 مالی مفلت دل بے رحم۔ اس ور خرچی کے آگے اگر گنج قاروں ہوتا تو بھی وفا  
 نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں یکبارگی یہ حالت ہوئی۔ کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی  
 باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کالی زوئی کھاتے تھے۔ اور چچا بھر خون  
 اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے۔ کافور ہو گئے۔ بلکہ راہ باٹ میں اگر  
 کہیں ملاقات ہو جاتی۔ تو آنکھیں پُرا کر منہ پھیر لیتے۔ اور نوکر جاکر خدمتگار  
 دہلے۔ دھچکٹ خاص بردار رٹا بٹھانے سب چھوڑ کر نہ رے گئے۔ کوئی  
 بات کا پوچھنے والا نہ رہا۔ جو کہے یہ کیا تھا حال ہوا۔ سوائے غم و افسوس  
 کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھنڈیاں میسر نہیں۔ جو چبا کر پانی پیوں  
 ڈو تیرے فاقے کڑا کے کھینچے۔ تاب بھوک کی نہ لاسکا۔ ناچار بے حیائی کا  
 برفقہ منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا۔ کہ بہن کے پاس چلے۔ لیکن یہ مشرم دل میں  
 آتی تھی۔ کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا۔ نہ خالی خط  
 لکھا۔ بلکہ اس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی کے اور اشتیاق کے جو لکھے  
 ان کا جواب بھی اس خواب خرگوش میں نہ بھیجا۔ اس شرمندگی سے جی تو  
 نہ چاہتا تھا۔ پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا۔  
 جوں توں پایادہ۔ خالی ہاتھ۔ گرتا پڑتا۔ ہزار محنت سے دے منزل کاٹ کر  
 ہمیشہ کے شہر میں جا کر۔ اس کے مکان پر پہونچا۔ وہ ماں جانی میرا حال دیکھ  
 بلائیں لے اور گلے مل کر بہت رُوئی۔ تیل۔ کالی۔ ماش۔ ٹکے مجھ سے حد سے  
 کئے۔ کہنے لگی۔ اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا۔ لیکن بھینا! تیری یہ کیا  
 صورت بنی؟ اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر

بچکا ہو رہا۔ بس نے جلدی خاصی پوشاک سلوا کھام میں بھیجا ہنا دھو کر  
 وے کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کے  
 مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات۔ حلوا سوہن۔ پستہ مغزی ناشتہ کو۔  
 اور تیسرے پہر۔ میوے خشک و تر۔ پھل پھلاری۔ اور رات دن دواؤں  
 وقت پلاؤ۔ نان۔ قلعے۔ کباب۔ تحفہ تحفہ۔ مزے دار منگوا کر اپنے رو برو  
 کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسے تصدیق کے بعد جو یہ آرام  
 پایا۔ خدا کی درگاہ میں ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے  
 کہ پانچ اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔ ایک دن وہ بس جو بجائے والدہ کے  
 میری خاطر داری رکھتی تھی۔ کہنے لگی: اے بیٹا! تو میری آنکھوں کی پہلی  
 اور ماں باپ کی سوئی سنی کی نشانی ہے تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔  
 جب مجھے دیکھتی ہوں بارغ بارغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا۔ لیکن مرد  
 کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد  
 کھٹو ہو کر گھر بیٹا ہے۔ اس کو دنیا کے لوگ طعنہ منادیتے ہیں۔ خصوصاً۔  
 اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے۔ اپنے  
 باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوی کے ٹکڑوں پر آپڑا ہے یہ نہایت بے عزتی  
 اور میری تمھاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لالچ لگنے کا ہے۔ نہیں  
 تو میں اپنے چڑی کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں۔ اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب  
 یہ صلاح ہے۔ کہ قصد سفر کا کرو۔ خدا چاہے۔ تو دن پھرے۔ اور اس حیرانی  
 اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔ یہ بات منکر مجھے بھی عزیز  
 آتی۔ اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا۔ اچھا اب تم ماں کی جگہ جو جو کہو  
 سو کر دوں۔ میری مرضی پلگر گھر میں جا کر پچاس توڑے انہری کے اھیل اور

نوبتوں کے ہاتھ میں لوگوں کے آگے لارکھے۔ اور بولی: ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے۔ تم ان روپیوں سے جس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر اکان دار کے حوالے کر کے دستاویز پکڑ لکھوا لو اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو۔ اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجیو۔ یا آپ بیچو؟ میں وہ نقد بیکر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری کا خرید کر کے ایک برٹے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت و خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے چہار ہزار ہونکر روانہ ہوا۔ اور فقیر نے ٹھکنی کی راہ لی چلنے کی تیاری کی۔ جب رخصت ہونے لگا۔ بہن نے ایک سربا بھاری جوڑا اور ایک گھوڑا چٹاؤ سازی تواضع کیا۔ اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنی سے لٹکا دیا۔ اور چھانگل پانی کی ٹنکار بند میں بندھوا دی۔ اہم ضامن کا روپیہ میرے ہاتھ پر باندھا۔ وہی کاٹیکہ مانگنے پر لگا کر آٹھویں کر بولی۔ سوداگر نے تھیں خدا کو سونپا۔ بیٹھ دکھائے جاتے ہو۔ اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔ میں نے فاختہ خیر پڑھکر کہا۔ تمہارا بھی اللہ حافظ ہے میں نے قبول کیا؟ وہاں سے مکمل کر گھوڑے پر سوا ہوا۔ اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرنا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

## مرزا رجب علی بیگ تہرور

مرزا اصغر علی کمندوی کے بیٹے آغا توارش حسین خاں توارش کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مذاق سخن رکھتے تھے۔ اردو نثر اچھی لکھتے تھے۔ واحد علی شاہی دور کے مشہور نثر اور مقفی نگار تھے۔ شگورج صحبت۔ گلزار ہرور۔

انشائے سرور۔ سرور سلطانی۔ فسانہ عجائب ان کی تصانیف سے یادگار  
ہیں انکی بہترین تصنیف فسانہ عجائب ہے۔ یہ طرز انشاء اس زمانہ میں تمام مقبول  
تھی۔ لیکن اب بالکل مردہ و افسوس ہے۔ فسانہ عجائب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا  
ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کا انفا پر واز اس رنگ میں بھی کیا رنگیں پیدا کر سکتا ہے۔  
ساتھ ہی اسکے یہ بات بھی اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ کہ اس طرز کا میدان کس قدر  
رنگ ہے اور زمانہ حال کی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے کس قدر ناقابل ہے +

## انتخاب از فسانہ عجائب شاہزادہ کے بندر ہونے کے بعد قتل گاہ جانے کی سرگزشت

جس وقت تاجر ماہ سے شایع اکرم کو نہا خانہ مغرب میں چھایا۔ اور شخصہ  
چرخ چہارم نوخیزی کو مشرق سے نکل آیا۔ سو اگر نماز صبح پڑھنا تھی برسلو  
ہوا۔ کمر میں پیش قبض رکھ۔ گود میں بندر کو بٹھا۔ مرنے پر کمر مضبوط باندھ کر  
چلا۔ بندر سے کہا۔ پریشان نہ ہو۔ جب تقریر سے اور اصراف کثیر سے کام نہ  
منگے گا۔ جو بن پڑے گا۔ وہ کروں گا۔ اپنے چیتے جی تجھے مرنے نہ دوں گا۔ توکل  
مردان جان دار۔ مرنے بعد از سر من کن فیکون شد۔ شدہ ہاشد۔  
سو اگر کاسرات سے سراسیمہ باشم و ائم آگے بڑھنا۔ کہ خلقت نے چاروں طرف  
سے گھیر لیا۔ بندر لوگوں سے مخاطب ہو کر یہ کہنے لگا۔ میر سموز  
بڑی ظہیرہ یا شریر چمیدہ ہوں جس رنگ میں ہوں میں عرض سخت رسیدہ ہوں  
اسے اہل بزم۔ میں بھی مرقع میں دہر کے تصویب ہوں۔ وے اسب حسرت گزیدہ ہوں



صیاد اپنا دم اٹھا لے کہ جوں صبا ہوں تو چن میں پر گل عشرت نہ چیدہ ہوں  
 بسے آہ و نالہ مجھ سے نہ آگے چلو کہ میں بچھڑا ہوں کارواں سے مسافر جریہ ہوں  
 غم ہوں الم ہوں درد ہوں سوز و گداز ہوں سب اہل دل کے واسطے میں آفریدہ ہوں  
 صاحبو! دنیا کے دول - نیرنگی زمانہ سفلہ پرور ہو قلبوں - عبرت و دید کی  
 چاہے - گرما گرم آئند و روند کا بازار ہے - کس و ناکس جنس نا پائدار ہو دل و لب  
 کا خریدار ہے - اپنے کام میں مصروف قضا ہے - جو شے ہے فنا ہے - معاملات قضا  
 و قدر سے ہر ایک ناچار ہے - یہی مسئلہ جبر و اختیار ہے - کوئی کیسی عداوت  
 میں ہے - کوئی کسی کا شیدا ہے - جیسے دیکھا آزاد نہ پایا - کسی نہ کسی بکھرے  
 میں مبتلا ہے - ایک کو اتنا شو جھتا نہیں - کیا لین دین ہو رہا ہے - سود کی  
 امید میں سرسریاں ہے - سڑی ہونے کا سووا ہے - اس کی قدرت ناطقہ دیکھو  
 مجھ سے بے زبان ناچیز کو یہ تکلف گویائی عنایت کیا - تم سب کا سامعوں  
 میں چہرہ کھدیا - باتیں سنے کو ساتھ چلے آتے ہو - جدائی میری شاق ہے -  
 جو ہے مشتاق ہے - حال زار پر رحم کھا آسو بھاتے ہو - یہ رحیمی کی صفت  
 ہے - شان قمار کی دیکھو! اسی تقریر کی مہموم سے ایک ظالم شوم سے مجھ  
 مظلوم کا مقابلہ ہوتا ہے - یقین کامل ہے - وہ اقتل کرے گا - بے گناہ کے  
 خون سے ہاتھ بھرے گا - سناؤ اؤ جبر فی الدارین ہوگا - تب اُسے آرام و چین  
 ہوگا - یہ گویائی گویا پیام مرگ تھا - دنیا جاے آزمائش ہے - سقیہ جانتے ہیں  
 یہ مقام قابل آرام و آسائش ہے - دو روزہ زیست کی خاطر کیا کیا سازو  
 سامان پیدا کرتے ہیں! فرعون بے سامان ہو کر زمین پر پاؤں نہیں دھرتے  
 جب سر کو اٹھا - آنکھ بند کر چلتے ہیں - خاکساروں کے سر چلتے ہیں -  
 آخر کار حسرت و ارمان فقط لے کر مرتے ہیں - جان اُس کی جستجو میں

ٹھوٹے ہیں۔ جو شے ہاتھ آئے دقت سے جمع ہو۔ پریشانی و مشقت سے پس  
 رہے۔ خشک سے جھوٹ جاے یاس و حسرت سے پھر سر پر ہاتھ دھیر روتے  
 ہیں۔  
 نسخ

دنیا اک زال بیسوا ہے بے مہر و وفا و بے حیا ہے  
 مروتوں کے لئے یہ زن ہے بزن دنیا کی عروپے دین کی دشمن  
 رہتی نہیں ایک جاہل جہم کہ پھرتی ہے رنگ نر و گھر گھر  
 در انجام شاہ و گدا۔ دو قمر کفن اور تختہ تابوت کے سوا نہیں۔ کسی نے اوی  
 یا محمودی کا دیا۔ یا تحریر کر بلا۔ کسی کو گزی گاڑھا بیسہ ہوا۔ بھد کرب و بلا  
 اس نے صندل کا تختہ لگایا۔ اس نے ہیر کے پھیلوں میں چھپایا۔ کسی نے  
 بعد دفن سنگ مرمر کا مقبرہ بنایا۔ کسی نے مرمر کے گور گرٹھا پایا۔ کسی کا  
 مزار مٹھا۔ نقش۔ رنگا رنگ ہے۔ کسی کی مانند سینہ جاہل گور تنگ ہے۔  
 حسرت دنیا سے کفن چاک ہوا۔ بستر دونوں کا فرش خاک ہوا۔ نہ ہیر  
 سمور و قائم کا فرش بچھا سکا۔ نہ فقیر پھٹی شطرنجی اور ٹوٹا پوریا لاسکا  
 بعد چندے جب گروین چنچ نے گنبد گرایا۔ اینٹ سے اینٹ بجایا۔ تو  
 ایک نے نہ بتایا کہ دونوں میں یہ گور شاہ ہے۔ یہ کھد فقیر ہے۔ اس کو  
 حرکت جوانی نصیب ہوئی۔ یہ استخوان بوسیدہ پر ہے۔ ستویہ بھی خوش نصیب  
 تک کمانی والے گور گرٹھا کفن پاتے ہیں۔ نہیں تو سینکڑوں چھاتی پر ہاتھ  
 رکھ کر مرجاتی ہیں۔ لوگ در گور رکھ کے چلے آتے ہیں۔ کہتے۔ ہلی۔ جہیل۔ کوٹے  
 بوٹیاں نوحی نوحی کر کھاتے ہیں۔ دامن وشت۔ عریاں کفن۔ گور بے چارے۔ حرا  
 کا صحن ہوتا ہے۔ یاس و حسرت کے سوا کوئی نہ سہاٹے روتا ہے۔ تختہ  
 چھٹ کوئی پائنتی نہ ہوتا ہے۔ سالما مقبروں کی عمارت عالی اور سادہ سالما

کی دیکھا بھالی میں سر بیچ الیہ ہے۔ ہزاروں رنج گور پہ چراغ غریباں کی  
 دید میں ٹپٹے بٹھائے سے۔ طرفہ نقل ہے کہ والی وارث اُن کے سر پر سلطنت  
 مسند حکومت پر شب و روز جلوہ افروز ہے۔ مگر تنہیہ غافلوں کو قدرت  
 حق سے گنبدوں میں آشیانہ زاغ و دغین۔ دیناروں پر مسکن بوم شوم  
 قبروں پر کھٹے ٹوٹے دیکھے میسر

مزار غریباں تاسف کی جا ہے! وہ سوئے ہیں پھرتے جو کل جا بجاتے  
 رنگ چمن صرب خراں دیکھا۔ ڈھلا ہوا حسن گلگشاں دیکھا۔ اگر گل  
 نچلے پر جون ہے۔ بہار ہے۔ غور کیا۔ نو پہلوے فانی میں نقشہ سے زیادہ  
 خلش خار ہے۔ سینہ نگار ہے۔ دنیا میں دن رات زق زق بق بق ہے۔  
 کوئی چھپے کرتا ہے۔ کسی کو قلق ہے۔ نوش کے ساتھ گزند نیش ہے۔ ہر رہرو  
 کڑی منزل درپیش ہے، "مؤلف

بہل کو خنناں میں جان کھوئے دیکھا جیٹا کو سر ٹپک کے روتے دیکھا  
 گلچیں کی بھی نیند اڑ گئی یکا سرور جواہل دول کھئے اُن کو سوئے دیکھا  
 قاتوں صدا ہے فرخ سحر کے رنج اُٹھائے۔ کبھی دم نہ مارا۔ شکوہ لب پر  
 نہ لائے۔ برسوں ندائے اللہ اکبر کے صدے سے شکوہ کیا۔ چپ رہے مہینوں  
 گجر کی آواز سے دم بند کیا۔ قلق جی مہیا۔ تالہ نہ بند کیا۔ شہر ہے۔ تو وصل  
 مہرباں خواب شب تھا۔ لطف اُٹھا عین غضب تھا۔ تمام عالم کی خوب  
 سیر کی۔ کبھی محرم محرم میں مسکن رہا۔ گاہ توھوئی۔ مالی کمشت و دیر کی۔  
 عالم سے آمیت۔ حدیث۔ وعظ و پند سنا۔ ناغوس برہمن سن سر دھنا۔ وہ  
 بدکیش۔ مانع ملت صنم لطف دیت حق نفس کا دشمن تھا۔ یہ کوئی ادب  
 رخنہ پر دلا اہل ایمان و دین کا رہزن تھا۔ تامل کیا۔ تو ان دونوں سے دور

حسد بغض بیز ہونا معلوم۔ اپنے نزدیک اٹکا انجام بخیر ہونا معلوم۔ والد اعظم  
یہ لوگ کیا سمجھتے؟ خود اچھے کھڑے اور کو بڑا سمجھتے۔ مطلب کی بات ہی بات  
دونوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ بایں والدائی اُن سے خدا سمجھتے؟ مولف  
اپنے کو بڑا بڑے کو اچھا سمجھتے۔ کبھی یہ بڑی سمجھ ہے اچھا سمجھ  
”دنیا فقط رہگزر ہے۔ ہر دم مثال تار نفس در پیش سفر ہے۔ تار نیست  
ہزاروں مقصد ہے۔ ڈر ہے۔ مرنے کے بعد باز پرس کا خطر ہے۔ کسی طرح انسان  
کو مضر نہیں۔ کوئی نفع ہے؟ جس کی تلاش میں ضرر نہیں۔ حاصل کار یہ ہے۔  
دنیا میں جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم کرے۔ تا مقدور کسی کی خاطر نہ برہم کرے۔“  
وگر نہ شعر

نیم شبے آہ زندہ پیر ز ال دولت صد سالہ کند پائمال  
”دل شکستہ کی دلداری۔ پائمال آہ کی مددگاری کرے۔ ہوا و ہوس جو  
دل سے دور ہو جائے تو مال سے پاکمال سے عجب و شغوت نزدیک نہ آئے۔  
عنایت ایزدی پر قائم ہو۔ جسکے ہر نعمت۔ سیاسی خدمت کر کے منتیات کا  
ناتج ہو۔ بچ کا حامل رہے۔ سب رنگ میں مثال ہے۔ زمانے کے کردہات سے  
گمراہے نہیں۔ صحبت غیر حبس سے نفرت کرے۔ تو بدنامی پاس آئے نہیں۔  
دولت کا اعتبار کیا؟ مفلسی سے تنگ و عار کیا؟ ایک دن مرنے ہے۔ جینا۔  
مستعار ہے۔ اس پر کس کا اختیار ہے؟ فیک عمل کا خیال رکھے۔ کہ قید تہی  
مرشت کا نام ہے۔ رہائی یہاں سے انجام ہے۔ شعر  
کسی کا مرگ پر اے دل نہ کیجے چشم تر نہ گز۔ بہت سارے اپنے چہرے چہرے ہیں  
”عمر مختصر کی تمنا اور حشمت خسروانہ! خزانہ قیرون کی فکر میں ہر ایک  
صباح و مسافر قیل و توار ہے تحصیل لا حاصل۔ کوشش اس امر میں سرسبز

بیکار ہے۔ بقول۔ تاسع

ہاتھ آتی ہے کب علم و ہنر سے دولت ملتی ہے فضا اور قدر سے دولت  
جو علم و ہنر رکھتے ہیں وہ ہیں محروم مالوں ہے بل احمق و خرسے دولت  
رُکے کا جمع ہونا۔ جو ہر کی تلاش میں دن کا جاگنا۔ چاندی سونے کی  
امید میں رات کا نہ سونا۔ جنہیں میسر ہر بار ہے۔ انہیں مفارقت دنیا کا گوارہ  
ہے۔ اور یہ کلام ہے "مؤلف"

پاں کے جانے سے جی اُچھتا ہے کیا ہی دلکش سرے فانی ہے  
دسلف سے اہل کمال دنیا کے مال سے محروم رہے۔ جو سزاوار حکومت  
تھے وہ محکوم رہے "حافظ"

اہلماں را ہمہ سرب زکباب و قذاست قوت دانا ہمہ از خون جگر می بینم  
اسپ تازی شدہ خروج بزیر بالال طوق زبیں ہمہ در گردن خرمی بینم  
لیکن کبھی صبح عشرت ہے۔ گاہ اہم کی شام ہے۔ دنیا عجب مقام ہے نہ  
امیر ہونے کچھ عرصہ۔ نہ فقیر ہونے کچھ دیر ہے۔ اس کا گاہ بے ثبات میں  
عجب اندھیر ہے "سودا"

سے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار رکھتا نہیں یہ ہاتھ عنال کا بیک قرار  
جتنے ظولید بیچ کئی دن کا ذکر ہے ہرگز عرقی و غری کا نہ تھا شمار  
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سوچی سے کفش پاؤں گھٹائے ہیں آؤ چار

اب جب وعدہ آپہنچا۔ تو نہ رویہ کام آتا ہے۔ نہ نوبت ظفر موج سے چمک  
ہوتا ہے۔ نہ تمہیں چار بچاتا ہے نہ کوئی آشنا دوست آڑے آئے نہ عزیز و  
اقربا بچ ملک اہست سے چھڑائے۔ اگر یہی امر مانع قضا و قدر ہوتے۔  
جمشید و کاؤس۔ دارا و سکندر بعد حسرت و افسوس جان نہ کھوتے۔

نیک عمل کرے۔ تو وہ ساتھ جاتا ہے۔ احتیاج کسی کی بر لائے۔ یا بند کچھ  
 دے۔ یہ البتہ کام آتا ہے۔ وگرنہ دنیا سراسر۔ زندگی بدتر از جواب ہے۔ پابند اسکا  
 خراب۔ ترک کرنے والا نایاب ہے۔  
 ترک دنیا کا سوچ کیا فاسخ کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

شعر  
 اس گلشن ہستی میں عجب سیر ہے لیکن جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا  
 ”الامتنقصا عقل یہ ہے کہ عالم اسباب میں کسی کا پابند نہ ہو۔ العقل خطر  
 نہ رکھے۔ ہمیشہ اس نے بھلے سے برائی کی ہے۔ جو گیا یہاں سے۔ یعنی جہان  
 گذراں سے۔ اسکا شاکی تھا۔ بادشاہ سے فقیر تک۔ جوان سے پیر تک حقیقت  
 میں نفس امارہ سخت ناکارہ ہے۔ اس کو برکت پچھاڑے۔ گرو ہوا وہو  
 سے دامن چھاڑے۔

شعر  
 دیوانہ پاش تاغم تو یگراں خورند آں را کہ عقل بیش غم روزگار پیش  
 آدمی کو لازم ہے۔ وہ بات پیدا کرے۔ تا صفحہ دنیا پر چندے بہ نیکی  
 نام یاد رہے۔

شعر  
 اس طرح جی کہ بعد مرنے کے یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے  
 ”دنیا میں کسی سے دل نہ لگائے۔ کہ یہ کارخانہ بہت بے ثبات ہے۔ وصل سے  
 فرحت ہجر سے مصیبت اپنے سر پر نہ لائے۔ کہ مرجائے کی بات ہے معشوق با وفا  
 عشق کی طرح تا پیدا ہے۔ اور پڑوفا ہر جانی ہر جا مہتا ہے۔ خواہش کا انجام کاہش  
 ہے۔ مٹتا دل سے دور کرنے میں جان کی آسائش ہے۔“ مولف۔

کبھی نہ چین سے رہنے دیا مٹانے شراب و خستہ میں اس دل کی آرزو سے ہوا  
 مگر وائے غفلت ابہائے نادانی کہ جب نشاے جوانی کا موسم پیری میں خوار آتا

ہے۔ اسوقت آدمی سر پر ہاتھ دھر کر روتا ہے۔ وقت از دست رفتہ و تیر از پشت  
جنتہ کب پاتھ آتا ہے۔ ہاچار ہو کفن افسوس کل کے پچھتا تا ہے۔ گذشتہ را  
صلوات کند کے دل کو سمجھاتا ہے۔

آدمیوں کو بندہ کی تقریر دل خراش پر اثر سے عبرت و حیرت حاصل تھی۔  
بسی فیضیت و پند۔ نگاہ کلام رنگین و دلچسپ بادل درد مند۔ کبھی سخنان  
چشم فدا سنا چلا جاتا تھا اہل دل طبیعت گداز سے روتے ساتھ آتے تھے  
ہر فقرہ پر درد پر ضبط نہ ہو سکتا تھا چلاتے تھے۔ خلق خدا جنازہ کی طرح ہاتھی  
کے ہمراہ تھی۔ ایک عالم کے لب پر ناسے تھے۔ فغان و آہ تھی۔ اسی سامان  
سے ملک کے جھرو گئے تھے پہونچے۔

## حجم الدولہ - ویر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر

ان کا خاندانی سلسلہ آخر سیلاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ ان کے دادا  
شاہ عالم کے زمانہ میں واپسی آئے۔ یہاں فوج کے ایک معزز عہدے پر سرفراز ہوئے۔  
شاہ عالم کے بعد ان کے والد عہدہ اللہ بیگ خاں کھٹو جاکر نواب آصف اللہ  
موجودہ کے دیار میں پہونچے۔ چند روز بعد حیدر آباد میں جا کر نواب  
نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں تین سو سوار کی جمیعت سے ملازم رہے۔ کسی  
برس کے بعد ایک خانہ جنگی کے کچھڑے میں یہ صورت بھی بگڑی۔ وہاں سے گھر آئے۔  
اور ابور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی بڑائی میں نہ  
گئے۔ اس وقت مرزا کی ۵ برس کی عمر تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں حقیقی چچا مرزا  
کی طرف سے اکبر آباد میں صوبہ دار تھے۔ انھوں نے اس کو بہت کم دامن میں لیا۔

ہرزا چچا کے سایہ میں پرورش پائے تھے مگر انھان پر ہے کہ مرگ ناگمانی میں وہ بھی مر گئے۔ بزرگوں سے لاکھوں روپیہ کی جائیداد چھوٹی مٹی۔ قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے؟ وہ امیر زادہ جو شاہانہ دل و دماغ لیکر کیا تھا۔ اس کو اسی ملک سخن کی حکومت اور مغلان کی دولت پر قناعت کر کے غیر بادِ مال سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدریس اور وسیلے در بیان آئے۔ مگر سب کھیل بکر بچ گئے۔ بولی کی نگاہی کے بعد زیادہ مصیبت پڑی۔ اس وقت راجہ پور تشریف لے گئے۔ نواب صاحب رام پور نے ۱۱ روپیہ مہینہ مقرر کروایا۔ مگر ہرزا وہاں زیادہ نہ رہ سکے۔ پھر بولی واپس آئے۔

ہرزا۔ اہل ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ اردو ان کی مادری زبان نہ تھی مگر اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا۔ کہ اس زبان کے مسلم الیوت استاد ہو گئے۔ تصنیفات اردو میں تقریباً ۱۰۰۰ شعر کا ایک انتخابی دیوان ہے۔ کہ سلسلہء میں مرتب ہو کر چھپا۔ ان کے کام میں بڑی بائیں خصوصیت کی پائی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی و نکما شہوہ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی مشق زیادہ تھی۔ اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا۔ اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولنے نہیں۔ لیکن جو شعر نکل گئے ہیں۔ وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔

اردو زبان میں رقعات کے دو مجموعے ان کے مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ ایک مجموعہ ہندی اور دوسرا اردو کے محلی۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے۔ گویا آپ سانسے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ اس میں بھی فارسی کی ترکیب اور محاوروں کا استعمال کر گئے ہیں ان خطوط کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے۔ کہ ظرافت کے چٹکے۔ اور لطافت کی شوخیان اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ انھیں کا ایجاد تھا۔ کہ آپ مزایا۔ اور اردوں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں۔

ہرزانے ۴۷ برس کی عمر میں اس جہان فانی سے انتقال کیا۔



## انتخاب از رقعات

### ۱۔ بنام مرزا حاتم علی۔ مہر

مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے۔ کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجریں وصال کے مرے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے؟ اتنا تو کہو۔ کہ یہ کیا بات تمھارے جی میں آئی ہے؟ برسوں ہو گئے۔ کہ تمھارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیر و عافیت لکھی۔ نہ کتابوں کا پیورا بھجوایا۔ ہاں مرزا تھتہ نے ہاتھ پرش سے یہ خبر دی ہے۔ کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے آغاز کے دے آیا ہوں۔ اور انھوں نے سیاہ قلم کی کوجوں کی تیاری کی ہے۔ یہ تو بہت دن ہوئے۔ جو تم نے خبر دی ہے۔ کہ دو کتابوں کی طلانی لوح مرتب ہو گئی ہے۔ پھر اب ان دو کتابوں کی جلدیں بن جانے کی کیا خبر ہے؟ اور ان پانچ کتابوں کے تیار ہونے میں درنگ کس قدر ہے؟ مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ تمھاری چالیس کتابیں بعد منہائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمھارے پاس پہنچ جائیں گی۔ آپ حضرت ارشاد کریں۔ کہ یہ سات جلدیں کب آپس کی۔ ہر چند کاریگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو۔ مگر ایسا کچھ لکھو۔ کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے۔ ان تینتیس جلدوں کے ساتھ۔ یا دو تین روز آگے ہیچے یہ سات جلدیں آپ کی عنایتی بھی آئیں۔ تا خاص و عام میں جا بجا بھیجی جائیں۔ میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا۔ انھوں نے لکھ لیا۔ ان

دونوں کے گھر اُٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوئے۔ اُنہیں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوئے۔ کہ ایک فقیر۔ کہ وہ خوش آواز بھی ہے۔ اور زمرہ پرور بھی ہے۔ ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا۔ یقین سمجھنا۔ کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں۔ اور صلہ میں اس کے اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔ غزل

درومیت کش دوا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا میرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	اک تماشاً ہوا بگلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں	تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم آن کے آنے کی	آج ہی گھر میں گوریا نہ ہوا
کیا وہ تھروو کی خدائی تھی	بندگی میں مرا بھسلا نہ ہوا
جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی	حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
دخم گردب گیا لبو نہ تھا	کام گر ترک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل رستانی ہے	سے کے دل وستان روا نہ ہوا
کچھ تو پڑھے کہ لوگ کہتے ہیں	آج غالب غزل سرا نہ ہوا

جواب کا طالب غالب

بندہ پرور! آپ کا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ دوا دیتا۔ کتنا شتاب لکھتا ہوں۔ مطالبہ مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے۔ پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے۔ کہ بایں کئی خطوں میں تمکو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بے درو پر دل آیا ہے۔ تو شکایت کی کیا گنجائش ہے؟ بلکہ یہ غم تو نصیب دوستان درخور افزائش ہے۔ بقول

غالب علیہ الرحمۃ بیہشت

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو؟  
 نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟  
 ہے ہے حسن مطلع اسے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیسا کم ہے؟  
 ہوا تو دوست جس کا دشمن اس کا آسمان کیوں ہو؟  
 افسوس ہے کہ اس غزل کے اور اشعار یاد نہ آئے۔ اور اگر خدا نخواست  
 باشد غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد ہو۔ ہم اس بوجھ کو مروانہ اٹھا رہے  
 ہیں۔ تم بھی اٹھاؤ اگر مرو ہو۔ بقول غالب مرحوم۔ شعر  
 دلا یہ درد و الم بھی تو مفتنم ہے کہ آخر نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے  
 سحر ہوگی۔ خبر ہوگی۔ اس زمین میں وہ شعر۔ یعنی شعر  
 تمھارے واسطے دل سے مکاں کوئی نہیں بہتر جو آنکھوں میں تھیں رکھوں تو ڈرتا ہوں نظر ہوگا  
 کتنا خوب ہے! اردو کا کیا اچھا اسلوب ہے۔ قصیدہ کا مشتاق ہوں خدا  
 کرے جلد چھاپا جائے تو ہمارے دیکھنے میں بھی آئے۔

کیا کہئے۔ بھلا کہئے۔ یہ زمین ایک بار یہاں طبع ہوئی تھی۔ مگر بحر اور  
 ہی تھی۔ وہ غزل یہ ہے۔ غزل

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہتے	تھیں کہو کہ جو تم پوں کہو تو کیا کہتے
کہید وطن سے پھر تم کہ ہم تگر ہیں	مجھے تو خوف ہے کہ جو پچھ کہو بجا کہتے
نہیں ذریعہ راحت جزا رحمت پر کیاں	وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دگشا کہتے
جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنے	جو ناسرا کہے اس کو نہ ناسرا کہتے
کہیں حقیقت جاں کا ہی مرض کہتے	کہیں مصیبت ناسازی دوا کہتے

کبھی شکایت نہ گراں نہیں کیجئے  
 کہیں حکایت صبر گریز پاکئے  
 رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے  
 کٹے زباں تو خنجر کو مرجھا کئے  
 نہیں بہار کو فرصت نہو بہار تو ہے  
 طراوت چمن و غولبی ہوا کئے  
 سفینہ جب کہ کنارے پہ آگیا پہاڑ  
 خدا سے کیا ستم و جور نا خدا کئے  
 اور وہ جو فاعلان - فعلان - فعلان - یہ بحر ہے - اس میں ایک قطعہ  
 ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا - تقریب یہ ہے کہ مولوی کرم حسین صاحب  
 ایک میرے دوست تھے - انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ  
 اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھے کہا کہ "اس کی کچھ تشبیہات  
 نظم کیجئے" میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے تو دس شعر کا قطعہ کہہ آگئے دیا - اور  
 محلہ میں وہ ڈلی ان سے لی - وہ قطعہ لکھتا ہوں - قطعہ  
 ہے جو صاحب کے کف دست پہ چکنی ڈلی  
 غامہ انگشت بدشاں کہ اسے کیا لکھئے  
 تہر مکتوب عزیزان گرامی لکھئے  
 مسی مالیدہ سر انگشت سیماں لکھئے  
 خاتم دست سیلماں کے مشابہ لکھئے  
 اختر سوختہ قییس سے نسبت دیجئے  
 حجر الاسود دیوار حرم کیجئے فرض  
 وضع میں اُسکو اگر مانئے قاف تریاں  
 کہوں اسے قفل در گنج محبت لکھئے  
 کہوں اسے تکتہ پیرا ہن لیلا کھئے  
 بندہ پرور کے کف دست کو دل کیجئے دلی

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے  
 ناطقہ سر بگ سیاں کہ اسے کیا کہئے  
 حرز بازوے شکر فغان خود آرا کہئے  
 داغ طرہ جگر عاشق شیدا کہئے  
 سر پستان پر یاد سے مانا کہئے  
 خال مشکین رخ و گلش لیلا کہئے  
 ناقہ آہوے بیابان ختن کا کہئے  
 رنگ میں سبزہ نو خیز مسیحا کہئے  
 کیوں اسے مردک ویدہ عتقا کہئے  
 کیوں اسے نقش پے ناقہ سلما کہئے  
 اور اس چکنی شہادی کو سویدا کہئے

آپ کے خطا کے جواب نے انجام پایا۔ اب میرا دردِ دل سنتو۔ بر خورِ دار  
نشی شینو تراش نے میرے دو خطوں کا جواب نہیں لکھا۔ اور وہ خطوط  
جواب طلب تھے۔ تم آنکو میری دعا کرو۔ اور کہو کہ درمیاں میرا کلام بند ہے  
اُس مطلبِ خاص کا جواب جلد لکھو۔ یعنی اگر وہ کتاب بن چکی ہے۔ تو  
بھیجو۔ اور اگر اُس کے بھیجنے میں دیر ہے۔ تو یہ لکھ بھیجو کہ وہ سیاہ  
قلم کی لوح ہے یا طلائی فقط

جواب کا طالب غالب

بہت سے غم گیتی شراب کم کیا ہے غلام سانی کوثر ہوں محکوم غم کیا ہے  
سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی یقین ہے ہلکو بھی لیکن اب آپ ہم دم کیا  
علاقہ محبت اذلی کو حق مان کر اور حقوق غلامی جناب مرتضیٰ علی کو  
سچ جان کر ایک بات اور کہتا ہوں کہ بنیانی اگرچہ سب کو عزیز ہے۔ مگر  
شکوائی بھی تو آخر ایک چیز ہے۔ مانا کہ روشناسی اُس کے اجارے میں آئی  
ہے۔ یہ بھی دلیل آشنائی ہے۔ کیا فرض ہے کہ جب تک دید و دید نہ ہوئے  
اپنے کو بیگانہ نہ یکدگر سمجھیں؟ سلام کے جواب میں خط بہت بڑا احسان  
ہے۔ خدا کرے وہ خط جس میں میں نے آپ کو سلام لکھا آپ کی نظر  
سے گذر گیا ہو۔ اچانا اگر نہ دیکھا ہو۔ تو اب ہرگز اطمینان سے لیکر پڑھ  
لیجئے گا۔ اور خط کے لکھنے کے احسان کو اُس خط کے پڑھ لینے سے دو بالاً  
سیجئے گا۔ ہاے میجر جان جا کو ب! کیا جوان مارا گیا ہے؟ سچ اُس کا یہ  
شینو تھا۔ کہ اردو کی فکر کو مانع آتا۔ اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی عادت  
دلوٹا۔ بندہ پرورد یہ بھی انھیں میں سے ہے۔ کہ جن کا میں مانتی ہوں۔  
ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کو یاد کروں؟ اور کس سے فریاد کروں؟ چوں

تو کوئی غنوار نہیں۔ اور مڑوں تو کوئی عزادار نہیں۔

غزلیں آپ کی دیکھیں۔ سبحان اللہ۔ چشم بد دور! اردو کی راہ کے  
تو سالک ہو۔ گویا اس زبان کے مالک ہو۔ فارسی سے بھی یہ خوبی میں کم  
نہیں۔ مشق شرط ہے۔ اگر کسے جاؤ گے۔ لطف پاؤ گے۔ میرا تو بقول  
طالب آعلیٰ اب یہ حال ہے ۵

لب از گفتن چنان بستم کہ کوئی دہن بر چہرہ زخمی بود و بہ شد  
جب آپ نے بغیر خط کے بھیجے مجھ کو لکھا ہو۔ تو کیونکر مجھ کو اپنے خط کے  
جواب کی نہ مٹا ہو پہلے اپنا حال لکھئے۔ کہ میں نے سنا تھا۔ آپ کہیں کے  
صدرا میں ہیں۔ پھر آپ اکبر آباد میں کیوں تادم نشین ہیں؟ اس ہنگامہ  
میں آپ کی صحبت حکام سے کیسی رہی۔ فقط

جواب کا طالب غالب

## مولوی عبدالرزاق صاحب شاکر کے نام

قبلہ۔ پہلے معنی ابیات بے معنی تھے۔ شعر

نقش خریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا  
ایران میں رسم ہے۔ کہ داو خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے  
سامنے جاتا ہے۔ جیسے مشعل دن کو جلانا۔ یا خون آلودہ کپڑا یا سنس پر  
لٹکا کر لیجانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے۔ کہ نقش کس کی شوخی تحریر کاغذی  
ہے؟ کہ جو صورت تصویر ہے۔ اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ  
مثل تھوڑا اعتبار محض ہو۔ مروجہ بیخ و بطل و آزار ہے۔ دوسرا شعر  
شوق ہر رنگ رقیب سرو ساں نکلا قیس تصویر کے پردے میں بھی عیاں نکلا

رقیب بمعنی مخالفت۔ یعنی شوق سرو سماں کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں نوکا پڑا پھرتا تھا۔ تصویر کے پردے میں بھی نوکا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر باتن عریاں ہی پہنچتی ہے۔ جہاں پہنچتی ہے۔ ۵۔  
 زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب تیر بھی سیدہ بسمل سے پر افشاں نکلا  
 یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں۔

نہیں ذریعہ راحت جراحہ پکیاں وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دکشا کہنے  
 یعنی زخم تیر کی تو کین بسبب ایک رخنہ ہونے کے۔ اور تلوار کے زخم کی تحمین بسبب ایک طاق سا ٹھہل جانے کے۔ زخم نے داد نہ دی۔ تنگی دل کی کیا داد دیتا ہے وہ تو خود ضیق مقام سے گھبرا کر پر افشاں اور سرسبز مکمل گیا۔

نامہ غالب کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے دہلی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا۔ سن لیتا ہے عبارت لکھ نہیں سکتا۔ لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہموطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ نوکٹ علمی ہی نہیں رکھتا۔ اب دہلی سے پوچھ لیتا ہے۔ اہل دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو آٹکا شاگرد پتا تا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ واسے اس بیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزو و قار ہو! رسالہ اس کا قاطع بیان دہلی پہنچ کر ڈھونڈو نہ لگا۔ اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچے گا۔ جناب مستطاب میر قاسم علی خاں صاحب صادق القول ہیں۔ میرے گھر آئے

ہونگے۔ دروازہ بند پایا ہوگا۔ مگر ایک حدیث ہے کہ حضرت میں اور میرے بھائی  
 مرزا علی بخش خاں میں بہت ربط و اتحاد تھا۔ اور وہ مرحوم خدائے  
 پیام زاد۔ کذب و گزاف میں ضرب ایشل تھا۔ اس تصور سے اگر اس محلے کے  
 سچ جاننے میں تامل کروں تو میرا تامل بیجا نہ ہوگا۔ بہر حال میرا سلام  
 کہئے گا۔ والسلام۔

### منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

رکھو غالب مجھے اس درد نواں میں تھا آج کچھ درد مرے دل میں سوا اٹھتا ہے  
 بندہ پروردگار کو پہلے یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر کریم حسین صاحب  
 کی خدمت میں میرا سلام کہنا۔ اور یہ کہنا کہ اب تک چیتا ہوں۔ اور اس سے  
 زیادہ میرا حال عجیب بھی معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی قہر کی جناب میں میرا  
 سلام کہنا۔ اور یہ میرا شعر میری زبان سے بڑھ دینا۔ شعر  
 شرط اسلام بود در زین ایمان بالغیب اے تو غالب ز نظر مہر تو ایمان من است  
 تمھارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا۔ کہ اُس کے دو دن یا تین دن کے  
 بعد دوسرا خط پہونچا۔ صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو۔ اور وہ  
 اُس میں بے تکلف عمر بسر کرے۔ اُس کا نام عیش ہے۔ تمھاری توجہ مفراط  
 بطرف شعر و سخن کے تمھاری شرافت نفس اور حشمت طبع کی دلیل ہے۔ اور  
 بھائی یہ جو تمھاری سخن گستری ہے۔ اُس کی شہرت میں میری بھی تو  
 نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور  
 اگلے کئے ہوئے اشعار سب پھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے  
 ڈیڑھ شعر یعنی ایک منقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ



جب دل اٹکنے لگتا ہے۔ تو دہل بار یہ مقطع زبان پر آ جاتا ہے شعر  
 زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گزری تھی ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے  
 پھر جب سخت گھبراتا ہوں۔ اور تنگ آتا ہوں۔ تو یہ مصرع پڑھ کر چپ  
 ہو جاتا ہوں۔ مصرع اے مرگ ناگماں مجھے کیا انتظار ہے پیہ کوئی نہ سمجھے  
 کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ چھو ہے۔ اسکا  
 بیان تو معلوم۔ مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریزوں کی قومیں  
 سے جو ان سیاہ روتھالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اس میں میر کوئی امید  
 گاہ تھا۔ اور کوئی میرا شفیق تھا۔ اور کوئی میرا دوست۔ اور کوئی میرا پار۔  
 اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز۔ کچھ دوست۔ کچھ شاگرد  
 کچھ معشوق۔ شوہر سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا  
 ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو۔ اس کو زلیست  
 کیونکر نہ دشوار ہو؟ اے اتنے پار فرے کہ جواب میں مرونگا۔ تو میرا کوئی  
 رونے والا بھی نہوگا۔ فقط

## میر حمدی کے بھائی میر سرفراز حسین کے نام

نور چشم راحت جان میر سرفراز حسین جیتے رہو۔ اور خوش رہو بھائی  
 دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا۔ جو پوسے پیروں یوسفؑ نے یعقوبؑ  
 کے ساتھ کیا تھا۔ میاں یہ ہم تم بڑے ہیں۔ یا جوان ہیں۔ توانا ہیں۔ یا  
 ناتواں ہیں۔ بڑے پیش قیمت ہیں۔ یعنی بہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا  
 جھٹنا کتنا ہے۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ یاد رکھنا فساد ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ ہے۔ اور وہی میں ہوں۔ سیرتھیوں پر نظر ہے۔ کہ وہ میر محمدی آئے۔ وہ میر سر فر از حسین آئے۔ وہ یوسف مرزا آئے۔ وہ میرن آئے۔ وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوں کا نام نہیں لیتا۔ کچھ طے ہوں میں سے کچھ گئے ہیں۔ اللہ اللہ! ہزاروں کا میں مامور ہوں۔ میں مروٹکا۔ تو مجھ کو کون روئے گا؟ سنو غالب رونا پلٹنا کیا؟ کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔ کہو میر سر فر از حسین سے۔ کہ یہ خط میرا محمدی کو پڑھواؤ۔ اور میرن صاحب کو بلاؤ۔ کل شام کو یا پرسوں شام کو میرا شرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے۔ کہتے تھے کہ کل یا پرسوں پانی پیت کو جاؤنگا۔ میں نے اُن کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے۔ اگر بھول نہ جائیں گے۔ خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ صاحب اپن نہیں ہے۔ نہ ہو۔ غلام اشرف نہیں ہے۔ نہ ہو۔ اگر منظور کیجئے۔ تو میں صوفی ہوں۔ ہمہ دوست کا دم بھرتا ہوں۔ بموجب مصرع کے مصرعہ۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔ تم سے کب انکار کرتا ہوں؟ اگر مرزا گوہر کی جگہ مانو۔ تو خوش۔ اگر غلام اشرف جانو تو راضی۔ رات کو اپنے گھر میں باتیں بناؤ۔ دن کو چٹھ سے جی بھلاؤ۔ قصہ مختصر کرو۔ اور جلد کرو! سید الور کا جو حال لکھتے ہو۔ وہ سچ ہے۔ راجپوت ایسا ہی کچھ کرتے ہیں۔ مگر مہاراجہ مسلمانوں کا دم بھرتے ہیں۔ فقط

### خواجہ غلام غوث بخیر کے نام

قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے۔ کہ کوئی ہمارا دوست ہو غالب کہلاتا ہے۔ وہ کیا کھاتا پیتا ہے؟ اور کیوں کر جیتا ہے؟ پیش قدمی

اکیس مہینہ سے بند۔ اور کئی سادہ دل فتوح جدید کا آرزو مند۔ اس پنشن  
 کا احاطہ پنجاب کے حکام پر مارا ہے۔ تو انکا یہ شیوہ اور یہ شعار ہے۔  
 کہ نہ روپے دیتے ہیں۔ نہ جواب۔ نہ مہربانی کرتے ہیں۔ نہ عتاب خیر اس  
 قطع نظر کی۔ اب سنئے ادھر کی۔ ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر۔ عطیہ  
 شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شراؤں۔ اگر گنہگار ہوں۔  
 گنہگار ٹھہرتا۔ تو کوئی یا پھانسی سے مڑتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں  
 مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں۔ پیشکاش گورنمنٹ کلکتہ  
 میں جب کوئی کاغذ بھجوا یا۔ قلم چیف سکٹر اس کا جواب پایا ہے۔ اکی بار  
 دو کتا میں کچھجیں۔ ایک پیشکاش گورنمنٹ۔ اور ایک نذر شاہی ہے۔ نہ انکے  
 قبول کی اطلاع نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب سر ولیم میور صاحب  
 بہادر نے بھی عنایت فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر محکوم نہ آئی۔ یہ سب  
 ایک طرف۔ اب خبریں ہیں مختلف۔ کہتے ہیں۔ کہ چیف سکٹر بہادر  
 لفٹننٹ گورنر ہوئے۔ یہ کوئی نہیں کہتا۔ کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالی  
 شان چیف سکٹر ہوئے۔ مشہور ہے کہ جناب ولیم میور صاحب صدر بورڈ  
 میں تشریف لے گئے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا۔ کہ لفٹننٹ گورنری کی سکرٹری کا  
 کام کس کو دے گئے۔ آپ کا حال کوئی نہیں کہتا۔ کہ آپ کہاں ہیں؟ یاں  
 از روئے قیاس جانتا ہوں کہ آپ اسی منصب۔ اور اسی دفتر میں شادو  
 شاداں ہیں۔ جو آپ لفٹننٹ کے سکرٹری ہوئے ہونگے۔ ان سے علاقہ رہتا  
 ہوگا۔ میور صاحب بہادر سے کاغذ کو ملنا ہوتا ہوگا؟ لفٹنٹ گورنری اور  
 صدر بورڈ یہ دونوں محکمے الہ آباد آگئے۔ یا آئیں گے۔ بہر حال۔ آپ اب  
 کیوں آگرہ کو جائیں گے؟ نواب گورنر جنرل بہادر کی روانگی کی بھی خبر

میں اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ۲۰ جنوری کو گئے۔ کوئی کہتا ہے۔ فروری میں کوچ فرمائیں گے میں اُدھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ ہر طرح اپنی قسمت کو رو بیٹھا۔ مگر یہ چاہتا ہوں۔ کہ حقیقت واقعی پر کما حقہ اطلاع حاصل ہو تاکہ نسلی خاطر اور لشکریں دل ہو۔ اگر ان مطالب کا جواب نہ مجمل بلکہ مفصل نہ دیر۔ بلکہ جلد مرحمت کیجئے گا۔ تو گویا محکو مولے لیجئے گا۔ زیادہ اس سے کیا کموں۔ فقط۔

۲

پایان شب سیہ سپید است در تو میدی بے امید است  
قبلہ! آج آپ کی خوشی و خوشنودی کے واسطے اپنی رُوداد لکھتا ہوں۔  
۱۳۳۷ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کشمر بہادر دہلی اہلی دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے کہا۔ کہ میں بھی چلوں؟ فرمایا کہ ”نہیں“ جب شکر میرٹھ سے واپس آیا۔ میں موافق اپنے دستور کے روز رُوداد شکر مخیم میں گیا میرٹھی صاحب سے ملا۔ ان کے خیمے میں سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سگتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم قدر کے دونوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ میں گدائے مہرم۔ اس حکم پر ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسب معمول قدیم بھیج دیا۔ اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں واپس مطلق ہو کر بیٹھ رہا۔ اور حکام شہر سے ملنا ترک کیا۔ او آخر ماہ گذشتہ یعنی فروری ۱۳۳۷ء میں نواب لکھنؤ گورنر پنجاب۔ واپس آئے۔ اہلی شہر صاحب ڈپٹی کشمر بہادر و صاحب کشمر بہادر کے پاس دھڑے

اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانہ محض اور مطرود محکام تھا۔ جگہ سے  
 نہ ہٹا۔ کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کا منگوا ہوا۔ شنبہ ۸ فروری کو  
 آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمہ میں چلا گیا۔ اپنے نام کا  
 ٹکٹ صاحب سکریٹری بہادر کے پاس بھیجا۔ بلا لیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب  
 کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ ڈو حاکم حبیل القدر کی وہ  
 عنایتیں دیکھیں۔ جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ جملہ معترضہ۔ میر منشی  
 لفٹنٹ گورنری سے سابقہ معرفت نہ تھا۔ وہ بطریق حسن طلب کیے  
 خواہاں ہوئے۔ تو میں گیا۔ جب محکام بچرود استدعا مجھ سے بے تکلف ملے  
 تو میں قیاس کر سکتا ہوں۔ کہ میر منشی کی طرف سے حسن خلق باپا کے محکام  
 ہوگا۔ بقیہ زوداد یہ ہے۔ کہ دو شنبہ مارچ کو سواد شہر محکم خیام گوزری  
 ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں  
 صاحب بہادر کے پاس گیا۔ اٹنا سے گفتگو میں فرمایا کہ ”تھارا دربار اور  
 خلعت بدستور بحال و برقرار ہے یا متغیرانہ میں نے پوچھا۔ کہ حضرت! کیونکر؟“  
 حضرت نے کہا کہ ”حاکم حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ  
 انگریزی و شادی دیکھے۔ اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا۔ کہ اسد اللہ خاں  
 کا دربار اور خیر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے“ میں نے پوچھا۔  
 کہ حضرت! یہ امر کس اہل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ”تھو کچھ معلوم نہیں۔  
 بس اتنا جانتے ہیں۔ کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۳۱ دن یا ۱۵ دن بعد  
 ادھر کو روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے کہا: سبحان اللہ! شہر  
 کار ساریا بہ قسکر کار ما فسکر ماور کار ما آزار ما  
 سے شنبہ ۱۳ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے ٹکٹ کو

بلایا۔ خلعت عطا کیا۔ اور فرمایا۔ کہ لارڈ صاحب بہادر کے یہاں دربار خلعت  
 بھی بحال ہے۔ اٹھائے جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا  
 کہ حضور کے قدم دیکھے۔ خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا۔  
 میں نہال ہو گیا۔ آپ یہاں سے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا۔ تو اور دربار  
 میں کامیاب ہو رہوں گا؟

کار دنیا کسے تمام نہ کرو ہرچہ گریہ محنت گریہ

## بنام یوسف مرزا

کوئی ہے! ذرا یوسف مرزا کو بتلاؤ! تو صاحب ماوہ آئے۔  
 میاں! میں نے خط مکمل تکجو بھیجا ہے۔ مگر تمہارے ایک سوال کا جواب  
 نہ دیا ہے۔ آپ سن لو۔ تفصیل حسین خاں اپنے ماموں مولیٰ الدین خاں  
 پاس میرٹھ ہے۔ شاید وٹی آیا ہو۔ مگر میرے پاس نہیں آیا۔ والد اس کے  
 غلام علی خاں اکبر آباد میں ہیں۔ مکتب داری کرتے ہیں۔ لڑکے پڑھاتے  
 ہیں۔ روٹی کھاتے ہیں۔ تم لکھتے ہو کہ پچانو محل واجد علی شاہ  
 کے سیکھتے گئے۔ تمہارے ماموں محمد علی خاں کے خط میں لکھتے ہیں کہ  
 شاہ اودھ ہمارے گئے۔ اس خبر کو اس خبر کے ساتھ منافات نہیں ہے  
 اودھ سے آپ ہمارے کو چلے ہوں۔ اودھ سے بیگمات کو وہاں بتلایا ہو۔  
 مگر میری جان! ہکو کیسے عالم پس مرگ ماچہ دریا چہ سرب +

یوسف مرزا! کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا؟ اور اگر لکھوں  
 تو پھر آگے کیا لکھوں؟ کہ اب کیا کر۔ مگر صبر۔ یہ ایک شیوہ فرسودہ

ابناے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہاے! ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے۔ اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹھا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا۔ کہ یوسف مرزا کو۔ شھادی دادی لکھتی ہیں۔ کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا۔ یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جو ان مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی۔ نہ قید فرنگ۔

## نواب میر غلام بابا خاں

جناب نواب صاحب! میں آپ کے اخلاق کا شکر۔ اور آپ کے یاد آوری کا ممنون اور آپ کے دوام دولت کا دعا گو ہوں۔ اگر بوڑھا اور اپنا بیچ نہوتا۔ تو ریل کی سواری میں مقرر آپ تک پہنچتا۔ اور آپ کے دیدار سے مسرت اندوز ہوتا۔ آپ میرے شفیق اور میرے محسن ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت باکرامت رکھے۔ خطے دیر دیر لکھنے کا سبب ضعف و لقا ہوت ہے۔ اگر میرے اوقات شبہ روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں۔ تو تعجب کریں گے۔ کہ یہ شخص جینا کیوں ہے صبح سے شام تک پلنگ پر بٹا رہتا۔ اور پھر دم بدم پیشاب کو اٹھتا۔ ان مجموعہ مصائب میں سے ایک ادنیٰ مصیبت یہ ہے کہ ستر سال شروع ہوئی ۱۲۱۶ھ کی ولادت ہے۔ اب کی رجب کے مہینہ سے ستر سال شروع ہو گا۔ ستر بہتر بوڑھا اپنا بیچ آدمی ہوں۔ جو عنایت تم میرے حال پر

فرا تے ہو صرف تھواری خوبی ہے۔ میں کسی لائق نہیں۔

نجات کا طالب غالب۔ چار شنبہ ۳۱ مئی ۱۸۹۶ء

## بتام نشی حبیب المدخال دکا

صبح جمعہ و ہم شوال ۱۲۸۳ھ ۱۵ فروری ۱۸۹۶ء بھائی میں  
نہیں جانتا۔ کہ تم کو اچھے سے اتنی ارادت اور محبت سے اتنی محبت  
کیوں ہے۔ ظاہراً معاملہ عالم رواج ہے۔ اسباب ظاہری کو اس میں  
و فعل نہیں۔ تمہارے خط کا جواب مع اوراق مسودہ روانہ ہو چکا ہے۔  
وقت پر پہنچے گا۔ ستر ہترا اردو میں ترجمہ پیر خرف کا ہے۔ میری تمہارے  
کی عمر ہے۔ پس میں اخرون ہوں۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں یہاں  
باطل بہت دن سے تھا۔ وہ بھی رفتہ رفتہ حافظہ کے مانند معدوم ہو گیا  
اب ہمیدہ بھر سے یہ حال ہے۔ کہ جو دوست آتے ہیں۔ رسمی پرستی مزاج  
سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے۔ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے صبح  
کو قند اور باوام مقشر۔ دوپہر کو گوشت کا پانی۔ سیر شام تلے ہوئے۔  
تیار کباب۔ سوتے وقت پانچ روپیہ بھر شراب۔ اور اسی قدر۔ گلاب۔  
خرف ہوں۔ پوچھ ہوں۔ عاصی ہوں۔ فاسق ہوں۔ مڑسیا ہوں۔ یہ  
شعر میر تقی کا حسب حال ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں تم القصد نہ ور پے ہوں تمہارے کہ نہیں ہم  
آج اس وقت کچھ افاقہ تھی۔ ایک اور خط ضروری لکھنا تھا۔  
کس کھولا۔ تو تمہارا خط نظر پڑا۔ مکرر پڑھنے سے معلوم ہوا۔ کہ بعض خط  
کے جواب لکھے نہیں گئے۔ ناچار اب کتابت جدا گانہ میں لکھتا ہوں۔ تاکہ



خلعت کا حال اور میرے اور حالات تم کو معلوم ہو جائیں۔ کہ میں قوم کا  
 ترک سلجھتی ہوں۔ دادا میرا ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں  
 ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرت پچاس گھوڑے نقارہ  
 نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ  
 اور رسائے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوک کا  
 ہنگامہ گرم تھا۔ وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا محمد اللہ خاں بہادر لکھنؤ  
 جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جاکر  
 نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم  
 رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بچھڑے میں جاتی  
 رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ اور راجہ بختاور سنگھ کا  
 نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ خاں بیگ بہادر  
 چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے  
 مجھے پانچ سو روپیہ میں جب حیدر آباد صاحب کا عمل ہو یا صوبہ دار کا  
 کمشنری ہو گئی۔ اور صاحب کشتہ ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو  
 حیدر آباد صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو  
 سواروں کا برگٹیر ہوا۔ ایک ہزار سات سو روپیہ ذات کا اور  
 لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر میں حیات علاوہ سال بھر مرزبان  
 کے تھے۔ یہ برگٹیر ناگانی مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض  
 نقدی مقرر ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا۔ جو باپ  
 مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا۔ جو چچا مر گیا۔ سترہ برس میں سکھ گئے۔ نواب  
 گورنر جنرل سے لینے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست

کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ ساٹ پارچے۔ اور جینے سر پہ۔  
 مالائے مروارید۔ تین رقم خلعت ملا۔ زان بعد جب دلی میں دربار ہوا۔  
 محکو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ۔  
 دربار و مصاحبت دونوں بند ہو گئے۔ امیری بریت کی درخواست  
 گزری۔ تحقیقات ہوئی رہی۔ تین برس کے بعد پٹ چھٹا۔ اب خلعت  
 معمولی ملا۔ عرض کہ خلعت ریاست کا ہے۔ عرض خدمت نہیں۔  
 انعامی نہیں۔ متوج الذہن نہیں ہوں۔ غلط فہم نہیں ہوں۔ بدگماں  
 نہیں ہوں۔ جو جس کو سمجھ لیا۔ اس میں فرق نہیں آتا۔ دوست سے  
 راد نہیں چھپاتا۔ کسی صاحب نے حیدر آباد سے گناہ خط ڈاک میں  
 بھیجا۔ بند بڑی طرح کیا تھا۔ کھونٹے میں سطرکٹ گئی۔ بارے مطلب  
 ہاتھ سے نہیں جاتا رہا۔ بھیجے دے کی عرض پہ تھی۔ کہ محکو تم سے پنج  
 و مال ہو۔ قدرت خدا کی۔ کہ میری محبت اور بڑھ گئی۔ اور میں نے  
 جانا کہ تم مجھے دل سے چاہتے ہو۔ وہ خط بجنسہ تمہارے پاس اس خط  
 میں ملفوف کر کے بھیجا ہوں۔ دربار دستخط کو پہچان کر کاغذ سے جھگڑا  
 نہ کرنا۔ دعا اس خط کے بھیجنے سے پہلے۔ کہ تمہاری رزقی منصب اور  
 افزونی مشاہرہ اس خط سے مجھے معلوم ہوئی تھی۔ فقط یہ

نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شہنشاہ کے نام

کیونکہ کہوں۔ میں دیوانہ نہیں ہوں و ہاں۔ اتنے ہوش باقی ہیں۔ کہ  
 اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ یہ کیا ہوشمندی ہے و قبلہ ارباب ہوش کو خط  
 لکھتا ہوں۔ نہ القاب نہ آداب۔ نہ بندگی۔ نہ تسلیم۔ سن غالب ہم تجھ سے

کہتے ہیں۔ بہت مصاحب نہ ہیں۔ اپنا قدر خود بشناس۔ مانا کہ تو نے کئی برس کے بعد رات کو دو نو تو بہت کی غزلیں لکھی ہیں۔ اور آپ اپنے کلام پر وجہ کرتا ہے۔ مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے؟ پہلے القاب لکھو۔ پھر بندگی عرض کرو۔ پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھو۔ پھر عنایت مانے کے آنے کا شکر ادا کرو۔ اور یہ کہہ کہ جو میں تصور کر رہا تھا۔ وہ ہوا۔ یعنی جس دن صبح کو میں نے خط بھیجا۔ اسی دن آخر روز حضور کا فرمان پہنچا۔ معلوم ہوا۔ کہ حرارت ہنوز باقی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ رفع ہو جائیگی۔ موسم اچھا آگیا ہے۔ اگر صحت بتدریج تبدیل سے کام نکل جائے۔ تو کیا کہنا۔ ورنہ بحسب رائے طبیب تنقیہ کراؤ۔ محکو بھی آج دستوں منفع ہے۔ پانچ سات دن کے بعد سہل ہوگا۔ شب کو ناگاہ ایک زمین نبی خیال میں آئی۔ طبیعت نے راہ دی۔ غزل تمام کی۔ اسی وقت سے یہ خیال میں تھا۔ کہ کب صبح ہو۔ اور کب یہ غزل نواب صاحب کو بھیج دوں۔ خدا کرے آپ پہنچ کریں۔ اور میر سے قبلہ جناب میر امجد علی صاحب کو سناویں۔ اور میرے شفیق منشی تاجدار حسین خاں صاحب اور آن کے بھائی صاحب اس کو پڑھیں۔ پروردگار اس مجمع کو سلامت رکھے! فقط۔

پیرو مرشد! شب رفتہ کو سینہ خوب برسا۔ ہوا میں فرط ہرودت سے گوند پیدا ہو گیا۔ اب صبح کا وقت ہے۔ ہوا ٹھنڈی بے گوند چل رہی ہے۔ اب رنگ محیط ہے۔ آفتاب نکلا ہے۔ پر نظر نہیں آتا ہے۔

**مولانا غلام امام شہید**

شاہ غلام محمد کے بیٹے۔ قصبہ ایشی منہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔

ہندوستان کے مشہور شاعر۔ مزاج بخا۔ عاشق رسول کے لقب سے مشہور تھے۔ نظم میں  
 تقابیل اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ علوم متداولہ کی تحصیل مولوی حیدر علی  
 صاحب کی خدمت میں کی تھی۔ فارسی زبان خوب جانتے تھے۔ فارسی نظم و نثر میں۔  
 آغا سید اسماعیل مازندرانی کے شاگرد تھے۔ سرکار نظام سے چار سو تیس  
 روپیہ سال بلا شرط خدمت مقرر تھے۔ وہ آخر وقت تک پاتے رہے۔ آپ کے آبا و اجداد  
 سب گوشہ نشین اور قناعت گزین تھے۔ لکھنؤ کے اطراف میں اور آگرہ۔  
 مراد آباد۔ رام پور۔ حیدر آباد۔ الہ آباد میں آپ کے مریدین بہت تھے۔  
 ہر سالار جنگ بہادر و ناب کلب علی خاں بہادر رئیس  
 رام پور۔ سعید عالم خاں رئیس سوہرہ اور اکبر امر و سواتی  
 بڑی عزت کرتے تھے۔ پیراد سال میں آپ نے انتقال کیا اور و نظم اور نثر نگین  
 جیسا کہ اس زمانے کا رواج تھا۔ بچتی لکھتے تھے۔ کلام اپنا کبھی جمع نہیں کیا۔  
 مجموعہ میلاد شریف اور انشاء سے بہارہ بیخراں اور قصائد  
 غزلیات کا ایک مجموعہ آپ کی یادگار ہے۔

## تاج گنج کے رونے کی تعریف

آج قلم کا دماغ پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے۔ کافز کا صفحہ آنکھ کی  
 سفیدی کی طرح مشہور ہے۔ نظر کا ڈورا رگ گل کی طور پر رنگین ہے۔ نگاہ کا  
 رشتہ گلہ سستہ کے مانند بہا رہا ہے۔ کس واسطے کہ مجھے ایک باغ اور مکان  
 کی صفت لکھنی منظور ہے۔ جس کی سیر سے چشم مردم میں نور ہے۔ اس کے  
 صحن اور دالان میں خدا کی قدرت کا گل کھلا ہے۔ چمن اور میدان میں صانع  
 کی صفت کا تماشا ہے۔ وہ کون مکان و اور کیسا گلستان و جو شاہ جمال

ایسے بادشاہ عالی جاہ کا قیام گاہ ہے۔ کون قصر اور کیسا ایوان؟ جو جناسب عالیہ بادشاہ بیگم کا آرام گاہ ہے۔ جس جگہ یہ دونوں آفتاب مہتاب سوتے ہیں۔ چاند اور سورج دن رات اُس زمین کے نثار ہوتے ہیں تاج بی بی کا روضہ جہاں میں مشہور ہے۔ اور ہر چہن اُس کا جنت کی خوشبو سے معمور ہے۔ اکبر آباد کیا۔ بلکہ سارے ہندوستان کو اس مکان سے عزت ہوئی ہے ہندوستان کیا بلکہ تمام رُومے زمین کو اُس سے زینت ہوئی ہے۔ اس چہن کی ہوائے جو کلیوں کی بوباس سے خیال کے دماغ کو معطر کر دیا۔ تو بلغ کی فضا نے دامن نظر کو گچھیں کے دامن کی طرح چھو لوں سے پھر دیا۔

سبحان اللہ! کیا روضہ ہے؟ کہ رضوان جس کے لطف و لطافت سے راضی و خوشنود ہے۔ یادک اللہ! کیا باغ ہے! جس میں بہشت کی ہر نعمت موجود ہے۔ سورج اس باغ کا ایک ذرہ آہستہ۔ چاند اس چہن کا گل شیدہ ہے۔ پہلے دروازے کی بلندی دیکھنے کو جو آسمان گردن اور سر اٹھائے۔ تو اُس کو آفتاب کی بگڑی سہجانی دشوار ہو جائے۔ دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ چوب قلم سے جو لکھا ہے۔ عقل اس طلسمات سے حیران ہے۔ کہ ہر حرف جلیا نزدیک کے نظر آتا ہے۔ ویسا دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس فن کے بہتر انصاف سے دیکھیں۔ کہ یہ بات کیسی مشکل اور کس طرح کی تقسیم کامل ہے۔ سنگ مرمر پر سنگ موسے کی پچے کاری کئے یا آنکھ کی سفیدی پر تیلیوں کی سیاہی کی نموداری۔ حرف ہیں۔ یا کافور کے قرص پر مشک کے دانے پڑے ہیں۔ لفظ ہیں۔ یا ہیرے کی تختی پر نیلم کے مکلیں جڑے ہیں۔ مینار آسمان کی طرف توجہ کا ہاتھ اٹھائے ہے کہ یہ خرم دیکھیے۔ اور اس بارگاہ کے ساتھ

ہمسری کا دعویٰ اور دم دیکھئے۔ محراب کا خم ابرو سے اشارہ کر رہا ہے۔ گہ  
 اندر جا کر ذرا بہار کا عالم دیکھئے نہیں! نہیں! غلطی ہوئی۔ مجھ نے بلکہ محراب  
 کا اشارہ یہ ہے۔ کہ پہلے حواس کو یہاں طاق پر رکھ جائیے۔ تب آگے قدم  
 بڑھائے۔ پس جو ادھر چوکھٹ لاگئے کی عزیمت ہوئی۔ تو ادھر عقل  
 اور حکمت رخصت ہوئی۔ سیر سے سیر ہونا تو نگاہ کے ہاتھ ہے۔ لیکن  
 حیرت یہاں ہر قدم کے ساتھ ہے۔ سب کے پہلے بہار کے علمدار بڑی  
 شوکت اور شان کے ساتھ نظر پڑتے ہیں۔ یعنی دودویہ سرو کے درخت  
 ٹیک بجت جوان کی طرح حسن کے جوین سے اکڑتے ہیں۔ زمرہ کی جھاڑ کی  
 تو کیا حقیقت ہے؟ جو اس کے ساتھ تشبیہ دوں۔ مگر ہاں لکھوں۔ تو  
 یوں لکھوں۔ کہ اچھے اچھے سبز پوش ہر قطار میں کھڑے ہو کر ناز و انداز  
 سے انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ یا غلمان بہشت سے آکر آسمان کو اس  
 باغ کی خوبیوں کی خبر دے رہے ہیں۔ نشو و نما جو ہر چیز کو بڑھاتی ہے  
 شاید سرو کی کے لباس میں کمر بستہ یہاں آتی ہے۔ یا آب و ہوا کی لہرت  
 سے سرو کے پردے میں آپ ہی بڑھی جاتی ہے۔ دونوں قطار کے  
 درمیان جو ایک حوض زمین دوڑ اور طویل ہے۔ گویا فی سبیل اللہ سبیل  
 ہے۔ صاف پانی سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں ہر سرو کے مقابل ایک ایک  
 فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ ادھر سرو نے زمرہ کے فوارہ کا نقشہ اڑا لیا۔  
 ادھر پانی کے فوارے نے ہیرے کو پانی کر کے بہا دیا۔ بعد اس کے ایک  
 مڑچ حوض جو بہت ستہرا ہے۔ نہایت خوبصورت اور خوشنما ہے۔ آئینہ  
 آئے دیکھ حیرت میں آتا ہے۔ نگاہ کا قدم پھسلا جاتا ہے۔ بہشت کی  
 نغمہ اس کا خزانہ ہے۔ آئینہ اس کا آبدار خانہ ہے۔ بلکہ آئینہ میں یہ

روانی کہاں ۹۔ اور وہ موجوں کی سلسلہ جنبانی کہاں ۱۰ پانی اُس کا دودھ  
 سے زیادہ مصفا ہے۔ برن سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ چونہ جو شیر خشک  
 ہو جائے تو روا ہے۔ پتھر جو بخ در بہشت بن جائے۔ تو بجا ہے۔ چاروں  
 طرف سے قمارے چھوٹتے ہیں۔ گویا آسمان سے تارے ٹوٹتے ہیں۔ پانی کی  
 زمین سے پانی کا درخت نکلتا۔ اور پانی ہی کے پھل پھول سے پھولتا۔  
 پھلنا۔ خدا کی قدرت ہے۔ آئینے کے چہرے سے موج کا کھڑے ہو کر چلنا۔  
 اور ہوا کے ساتھ زور کر کے اچھلنا عجب حکمت ہے۔ عقل نے جب فکر  
 کے دیا میں غوطہ لگایا۔ تو رونے کے اُدھر حوض کے واقع ہونے کا  
 سبب یوں سمجھ میں آیا۔ کہ نگاہ پہلے اُس میں بنا کر پاک ہوئے۔  
 تب رونے کے طوائف کی آرزو کیے۔ اور ناطقہ پہلے اُس کے پانی سے  
 کلیاں کر کے متحد صاف کر لے۔ تب بہار کی صفت میں گفتگو کر کے۔ اُس  
 حوض کی یاد میں دریا کی پسلی پھڑکتی ہے۔ سینے میں آگ بھڑکتی ہے۔  
 جوش کھا کر دیکھنے آتا ہے۔ مگر دیوار سے سر ٹکرا کر پھر جاتا ہے۔ جس  
 طرف آنکھ اٹھائیے۔ اور جدمر خیال دوڑائیے۔ سیلا۔ چنبیلی۔ موگرا۔ مونی  
 جنبہ۔ جوہی۔ کیٹکی۔ کیوڑا۔ گلاب۔ سدا۔ بہار۔ گیندا۔ داؤدی۔ گل عباس  
 گل مہندی۔ نازبو۔ گل رعنا۔ گل فرنگ۔ گل چاندنی۔ شببو۔ کلنا۔ سیوتی۔  
 دوہری۔ سورج نکھی۔ لالہ فارماں۔ سورج ہزار زبان۔ ترگس حیراں۔  
 قسم قسم رنگ پرنگ کے جھول پھول رہے ہیں۔ پیارے شہانے درختوں  
 پر صبح شام کی دھوپ چھاؤں کا عالم۔ پتوں پر شبنم کی طراوت اور  
 نم۔ ٹوہیوں پر۔ چڑیلوں کا گل۔ پرلیوں کی آپس میں۔ چھپر چیل۔ اور  
 جوانوں کے غول۔ بچھریوں کی ہنسی اور ٹھٹھول۔ کہیں گل کے تھقے

کہیں قبل کے چھپے ہیں۔ تُو اُدھر شور کرتا ہے۔ اُدھر مسئلوں کا جنوں  
 زور کرتا ہے۔ کوئل وہاں کوک اُٹھتی ہے۔ سینے میں یہاں ہلک اُٹھتی ہے  
 پیپیا جو اُدھر بولا۔ پی کہاں؟ تو یہاں بدن میں جی کہاں؟ ڈیر کی اُدھر  
 نئے نئے طور پر دھن ہے۔ اُدھر حیات کے جانے کی اُدھر مین ہے۔  
 طوطی کی جو بات ہے۔ گویا نبات ہے۔ مینا کو شیریں کلامی سے کام ہے  
 ناکامی کا کام ہی تمام ہے۔ جگنو کا چکنا۔ بلغ کا مکنا۔ دونوں وقت  
 کا ملنا۔ شیو کا مکنا۔ سنبھل کا بال بکھیرنا۔ مچھلیوں کا حوض میں تیرنا  
 پروا کا چلنا۔ دل کا مچلنا۔ سبزی کا لہلہانا۔ چڑیوں کا چھپانا۔ شش  
 کا پھولنا۔ گلزار خیال کا تماشا دکھانا ہے۔ یہ سہاں دیکھ کر کوئی پھول سا  
 سہولا نہیں سماتا۔ کوئی بوسے گل کی طرح گریباں پھار کر ٹکلا جاتا ہے۔  
 بیلا بے لاگ دل کو کھینچتا ہے۔ چنبیلی کی البیلی دھج پر روح شیدا ہے۔  
 منحدر کی ٹیٹوں پر چاندنی ٹوٹ پوٹ ہے۔ جس کی بہار سے چاند کے  
 جگر میں داغ اور دل پر چوٹ ہے۔ لالہ نعل سے بہر۔ سبزہ زرد کا ہمسر۔  
 کیاریوں کے کنارے کی ہری دُوب کا شانی محفل سے زیادہ خوب و مرغوب  
 درختوں کے تنھائے ہیں۔ یا دُودھ کے بھرے ہوئے پیالے ہیں۔ آبشار  
 ہے۔ یا آئینہ پشت بدیوار ہے۔ پانی کی چادر پر جو نقش و نگار ہے۔ قلم  
 قدرت کا یادگار ہے۔ ہر کی جو ایسی اُنکھیالیوں کی چال ہو۔ تو دل کی جگہ  
 نہ پامال ہو۔ مہتاب سرو کے ساتھ ہم آغوش ہے۔ یا کوئی جوان سہر  
 رنگ بادلہ پوش ہے۔ گلزار کو دیکھ کر نعل انگاروں پر ٹوٹتا ہے۔ بہرے کے  
 رشک سے زرد زہر کھاتا ہے۔ یہ لالے ہیں۔ یا آفتش کے پر کالے ہیں  
 جس کے دیکھنے سے جینے کے لالے پڑتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں طبع بڑھتے



ہیں۔ چاندنی نے سبزے میں کھیت کیا ہے۔ یا سبز محل پر تھیں کتر کے  
 چھترک دیا ہے۔ کلنے کو قدم کر کے ایسا برا پر کیا ہے۔ کہ اس کے پتے اور  
 پتھروں سے گویا سبز اور سرخ بوٹیوں کا غالیچہ بچھا دیا ہے۔ ہوسری کی  
 بھینی بھینی خوشبو ہے۔ تو صبا کو اسی کی جتنجو ہے۔ یہ ہار سنگھار کی کلکاریا  
 ہیں۔ یا آگ کی چنگاریاں ہیں۔ ہیر ہونٹیاں رنگتی ہیں۔ یا یاقوت کا خون  
 یہ جلا۔ لالہ تار چین میں کھلا۔ یا چنار سے شعلہ مکھل پڑا۔ اگر آب و ہوا  
 کی لطافت یہی ہے۔ تو موتی حدت سے مکھل کر کلیوں کا روپ دکھلا دینا  
 اور مچھلی کا مٹا سر سبز ہو جائیگا۔ مہوے کا نام زبان پر آیا۔ اور حلاوت  
 کے مٹھیں پانی بھر آیا۔ کولا۔ سنگترہ۔ رنگترہ۔ چکوترہ۔ نارنگی۔ میو۔ زرد آلو  
 شفتالو۔ آمار۔ سیب۔ ہی۔ انگور۔ انناس۔ ناشپاتی۔ کیلا۔ ہیر۔ کرکھ۔ بنرہ۔  
 سرسل۔ بڑیل۔ انبہ۔ انبی۔ جامن۔ پھلیندار۔ امرو۔ شہنشاہ۔ پونڈا۔ کھرنی۔  
 کوئی پھل ایسا نہیں۔ جو اس بارش میں نہ ہوتا ہو۔ اور ساگ شکاری سے  
 لیکر جڑی بوٹی تک کوئی ایسی شے نہیں۔ جسے باغیاں نہ ہوتا ہو کہیں کوئی  
 سنگترے سے چرس کا چین آگ بھجھو کا ہو گیا۔ کہیں فالسے کی رنگت سے زمین کا  
 دامن آدوا ہو گیا۔ سیب سے آسب کی زحمت دفع ہو جاتی ہے ہی بدن  
 میں فری لاتی ہے۔ ناشپاتی سے روح راحت پاتی ہے۔ انار نے خلق کے مٹھ  
 یاقوت اور موتوں سے بھر دئے۔ نازنیوں کے دانت کھٹے کر دئے۔ ادنی  
 میوہ یہاں کا اخروٹ ہے۔ جسپر ستاروں کا دل لوٹ پوٹ ہے۔ آسمان دن  
 رات شوشو طح ماک جھانک میں رہا۔ تب انگور کی ٹٹھی سے ایک خوشہ  
 پروں کا کچا لے بھاگا۔ مٹو باوصف اس پختہ کاری کے اب تک پکا نہ سکا۔  
 کیلا یہاں ایک ایک گود میں ہزار ہزار پھلتا ہے۔ ماہ نو وہاں آسمان پر

اکیلا نکلتا ہے۔ اس زمین کا اگر خربزہ یا سروا ہے۔ پوست میں مغز اس کا تر  
 حلو ہے ہندوانہ مرغ روح کا آشیانہ ہے۔ جس میں ایک ہی جگہ موجود  
 آب ودانہ ہے۔ شہتوت تمام عالم کا قوت۔ انجیر بالکل شکر و شیر۔ اور دھنیا  
 بے دود۔ انہ نازنینوں کے ہونٹوں پر مہر خاموشی ہے۔ کہ میرے سامنے شہنی  
 کا دعویٰ ناحق کوشی ہے۔ دوات قلم کی زبان چوستی ہے۔ گویا نے شکر ٹھہرایا  
 قلم کا غد کو چاٹتا ہے۔ آپ چپوٹا بنا۔ اور اس کو مصری بنایا۔ مانی ڈالیا  
 سروں پر بے جا بجا کھڑے ہیں۔ انعام کے لئے اڑے ہیں۔ کوئی پتھروں  
 کا ہار لاتا ہے۔ کوئی گلہ سٹہ دود سے دکھاتا ہے۔ پھر جو روضہ نظر آیا۔ تو  
 وہ سماں آنکھوں میں سما یا۔ کہ نہ دید نے خواب کی آنکھوں سے کبھی نہ  
 نہ شنید نے خیال کے کاؤں سے کہیں سنا تھی! یہ روضہ ہے۔ یا خلد بریں  
 آسمان ہے یا زمیں۔ سہرا کس ہے۔ یا سورج کی کرن۔ گنبد ہے۔ یا نور کا  
 مسکن قبرستان ہے۔ یا روضہ رضواں۔ مکان ہے یا جواہرات کی کان ہے۔  
 جو پتھر ہے۔ جواہرات سے بہتر ہے۔ صبح نے مرقے کی ایسی صفائی پائی۔ تب  
 سنگ مرقے کی صورت بنائی۔ سنگ موئے کو شعلہ بھلی نے طور پر جلایا۔ تب  
 اس درگاہ کے صرف میں آیا۔ کس کا سایہ دریا میں ایسا رہتا ہے۔ جیسا صبح  
 آبی میں آفتاب۔ حوض میں چاند ایسا نظر آتا ہے۔ جیسا دریا میں جباب  
 دیوار میں منحنہ نظر آتا ہے۔ گویا آئینہ ہے۔ جلا کیا ہوا۔ گنبد سے دماغ تازہ  
 ہوتا ہے۔ گویا قرابہ ہے۔ گلاب سے بھرا ہوا۔ صبح کی طباشیر استرکاری کے  
 صرف میں لائی گئی۔ جو اب تک وہی نور کا عالم دکھاتی ہے۔ رات کا شکر  
 اور شفق کی وعظمان پس کر گارے میں ملائی گئی۔ جو آج تک وہی خوشبو  
 دماغ میں آتی ہے۔ آفتاب کے ترچ کا عرق پخوڑ کر ماہتاب کے پیالے

میں موتی کی آب سے ملایا تھا۔ جو چوئے میں یہ نور اور ایسی صفائی ہے۔  
 ہسٹ کے کافور کو شفق کے ساتھ آفتاب کے کھل میں پھین کر صبح کے  
 دامن میں چھانا تھا۔ جو رنگ نے یہ آب و تاب پائی ہے۔ جالیوں کی  
 نزاکت میں عقل کام نہیں کرتی۔ کہ پتھر کو موم کر کے بال کا قلم پار  
 کرویا۔ یا خیال کا جالا سمجھ کر نگاہ کی لوک سے جیسا چاہا کام بنایا۔ ہر ایک  
 جالی میں وہ ملاحظہ ہے۔ کہ دیکھنے میں پتھر کی حالت ہے۔ کاغذ کی وصلی  
 پر حرفوں کا ابھرا پن تو معلوم بھی ہوتا ہے۔ یہاں پتھر کی پچے کاری  
 کا نہ جوڑ نظر آتا ہے۔ نہ پوند۔ اور نہ جوڑ کہیں سے ہست ہے۔ نہ بلند  
 بس کر شیردہاں کر۔ آپ لکھنے کی سبب ہوئے کہ :

### رقعہ تنقیت و تعزیت اُمیر

مجموعہ انشائے شیریں زبانی۔ ویساچہ کتاب سخی معانی زاو حشمتہ۔  
 قلم بعد تشریح مراتب اشتیاق و آرزو مندی کے تعزیت کے مضمون سے اُنسو  
 بھی بہتا ہے۔ اور کچھ خوشی میں آکر مبارکہاد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے  
 اُرمائے میں خوشی و غم دونوں کا چوٹی اور دامن کا ساکت ہے۔ اور دُنیا میں  
 موصوب چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ ڈو پھول  
 ایک ہی شاخ میں پھولتے ہیں۔ ایک دولہا و دھن کے سہرے کے کام آتا  
 ہے۔ دوسرا میت کی تربت پر چڑھایا جاتا ہے۔ ڈو موتی ایک سیپ میں  
 پیدا ہوتے ہیں۔ ایک کو بادشاہ کے تاج میں لگاتے ہیں۔ دوسرے کو کھل  
 میں پسیر دیا میں لاتے ہیں۔ ایک ہی کافور سے دو شمعیں بجتی ہیں۔ ایک  
 محفل سروے کے کام آتی ہے۔ دوسری فردے کے مزار پر جلانی جاتی ہے۔

چمن میں کلی اگر کھل کھلا کر ہنستی ہے۔ تو شبنم ہے اختیار اُس کے ہنسنے پر۔  
 روتی ہے۔ جس باغ میں خزاں ہو۔ وہاں بہار بھی ہے۔ اور جہاں گل ہو۔  
 وہاں خار بھی ہے۔ بادام کے پوست اور مغز کو دیکھئے۔ کہ نرمی اور سختی  
 ایک ہی جگہ نمود ہے۔ برق کو شوچئے۔ تو گرمی اور سردی اُس کے ساتھ ہی  
 موجود ہے۔ شرنخی اور زردی گل رعنا کی دلیل ہے۔ تقدیر نے اگر صبح کو بہار  
 سفید خوشی کا پہنایا۔ تو شام کے واسطے جامہ سیاہ مانتی بنایا۔ چل پ کہ  
 آپ کے والد ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا۔ گویا اسی گزشتہ سال  
 نہار کی خزاں و بہار کا تماشا دکھایا۔ اور اس غم نے جتنا رولایا تھا۔ آپ کی  
 شادی نے اتنا ہی ہنسایا۔ اس افسوس میں آسمان جو مانتی لباس پہنے  
 نظر آیا۔ تو شفقت کی شرنخی نے وہیں خوشی کا رنگ بھی دکھایا۔ بچ میں  
 دو بہتر پہلے تھکے پر مارا۔ تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اٹھا کر یوں  
 دعا مانگی۔ کہ خدا اُس مرحوم کو جنت نصیب کرے۔ اور آپ سلامت  
 رہیں اور یہ شادی مبارک ہو۔ ہندہ بھی اس کے رسم فاتحہ خوانی و شکر کثیف  
 شادمانی کے واسطے ضرور حاضر ہوگا۔ زیادہ والسلام ۛ

## آنریبل ڈاکٹر سمر سید احمد خاں بہادر

وفات علی گڑھ ۱۸۹۵ء

پیدائش دہلی ۱۸۱۷ء

- سمر سید - ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ علوم اسلامیہ کے تحصیل کے بعد۔

۲۷ سال کی عمر میں اجزاء دہلی کی صدر ایبٹنی کی چکری میں سرشتہ دار مقرر ہوئے

اُس کے بعد کمشنر آگرہ میں نائب منشی ہوئے۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۵۷ء میں مین پوئی



بہت سبب۔ افسانہ و عادت کے دلوں میں گھپ گئی ہوں۔ ان کی برائی اور جو خوبیاں  
سوسائٹی کے اثر سے نظروں سے چھپ گئی ہوں۔ انکی خوبی فوراً دلوں پر نقش ہو جائے۔  
مولانا حالی اپنی کتاب حیات جاوید میں کہتے ہیں کہ ”میر سید نے اردو  
زبان اور اردو لٹریچر کو طبع طرح کی مدد پہنچائی ہے۔ مگر جو بے ہمدردی کا شکار آئے لٹریچر  
ورکس سے اردو لٹریچر کو پہنچی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو قادر آف اردو  
کہنا کچھ مبالتہ نہیں، سید کے طرز تحریر میں یہ خصوصیت تھی کہ اس کی لطافت  
اور خوبی کے سبب لوگ عموماً اس کو شوق اور توجہ سے پڑھتے تھے۔ اور اس کی سادگی  
اور بے شکستگی دیکھ کر ہر ایک کے دل میں ویسا ہی کہنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ اس نے  
جو صفائی اور سلاست اور تہذیب اور شائستگی اور گھلاوٹ عام تحریروں میں رکھی  
جاتی ہے۔ اور مضمون نگاری کا جو سلیقہ اخباری دنیا میں پھیلا ہے۔ یہ سب ہی ایک  
قلم کی آواز بازگشت ہے۔ سب سے زیادہ زور دار اور با اثر آپ کی آپس میں ہوتی  
تھیں۔ مگر وہ کفر بدینہ کی بازاری معاہدہ پر ہیں۔ اس لئے اس انتخاب میں لائے گئے لکھنوی  
آپ کی علمی تصانیف سے سلسلہ الملوک۔ آثار الصنادید۔ اسباب  
بغاوت ہند وغیرہ اور پچھروں کا مجموعہ۔ اور صدقہ مفید مضامین یادگار ہیں۔  
جو تہذیب اخلاق اور عملی گدھہ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھپے ہیں +



## اپنی مدد آپ

خدا انکی مدد کرتا ہے جو اپنی آپ مدد کرتے ہیں  
یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس جھوٹے سے فقرہ میں  
انسانوں کا اور قوموں کا اور ممالک کا چرچہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی  
آپ مدد کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جبکہ یہ جوش بہت سے

شخصوں میں پایا جائے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ  
 ہے۔ جبکہ کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس  
 شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنی آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا  
 ہے۔ اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور  
 اسی کے ساتھ عزت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اسی کے  
 ساتھ عزت جو اصلی جہک دیک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے۔ اور  
 جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ  
 میں ذلیل اور بے عزت ہو جاتی ہے۔ آدمی جب قدر کہ دوسرے پر بھروسہ  
 کرتے جاتے ہیں خواہ اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر  
 کیوں نہ کریں یہ امر بدیہی اور لا بدی ہے کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت  
 ہوتے جاتے ہیں۔ اسے میرے ہومین بھائیڈ کیا تھا۔ ایسی حال نہیں ہے؟  
 ایشیا کی تمام قومیں یہ سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا کی ترقی  
 اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ  
 ترقی کر گئے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی و  
 خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ خواہ وہ انتظام باہمی قوم کے رسم و رواج کا  
 ہو یا گورنمنٹ کا اور یہی سبب ہے کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی  
 مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ انسان کی ترقی اور بہبود کا خیال کر کر ان کا  
 درجہ سب سے اعلیٰ اور نہایت پیش پہنچتے تھے۔ مگر حقیقت میں یہ سب  
 خیال غلط ہیں۔ ایک شخص فرض کرو کہ وہ لندن میں آہر لینڈ کی طرف  
 سے پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یا کلکتہ میں ویسٹ اور  
 گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستان کا ممبر ہی ہو کر کیوں نہ بیٹھ جائے۔

قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتا ہے۔ اس دلو بری میں کسی بات پر ووٹ دینے سے گو وہ کیسی ہی ایسا ندری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے۔ بلکہ خود اس کی چال چلن پر اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسانوں کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آجی آزادی سے اپنے قومی کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت منیت اور محمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے۔ اور وہ فرض جان و مال اور آزادی کی حفاظت ہے۔ جبکہ قانون کا عملدرآمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جہی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حفظ اٹھا سکتا ہے۔ جب قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے۔ مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی اچھا رہنے والا کیوں نہ ہو۔ سب سے آدمی کو محنتی۔ فضول خرچ کو کفایت شعار و شراب خوار کو تاب نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ باتیں شخصی محنت۔ کفایت شعاری۔ نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی۔ قومی عزت۔ قومی اصلاح۔ عمدہ عاداتوں۔ عمدہ چال چلن۔ عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے۔ نہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقون اور اعلیٰ اعلیٰ درجہ حاصل کرتے سے۔

پنڈت لگوں کا مقولہ ہے کہ ”انسان علیٰ ذہنی اہل و کھنڈ“ اگر اس مقولہ میں ”انسان“ سے چند خاص آدمی مراد لئے جائیں تو جو بادشاہ کے



مقرب ہوتے ہیں تو یہ مقولہ صحیح ہے۔ اور اگر یہ معنی لئے جائیں کہ رعایا اپنی گورنمنٹ کی سی ہو جاتی ہے تو یہ مقولہ صحیح نہیں ہے۔ رعایا بھی گورنمنٹ کے رنگ میں نہیں رنگی جاتی۔ بلکہ گورنمنٹ رعایا کا سارنگ بدلتی جاتی ہے۔ نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً اُن لوگوں کا چہرہ وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے۔ جو رنگ اککا ہوتا ہے اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے رعایا اُسکو زبردستی سے پیچھے کھینچ لاتی ہے۔ اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے وہ ترقی کی دودھ میں رعایا کے ساتھ آگے کھینچ جاتی ہے۔ تاریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان و انگلستان کا یہی حال ہوا۔ انگلستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں اُس زمانہ کی گورنمنٹ سے آگے بڑھی ہوئی تھی اُس نے زبردستی سے گورنمنٹ کو اپنے ساتھ آگے کھینچ لیا۔ ہندوستان کی رعایا تہذیب و شائستگی میں موجودہ گورنمنٹ سے کوسوں پیچھے پڑی ہے۔ گورنمنٹ کتنا ہی کھینچنا چاہتی ہے مگر وہ نہیں کھینچتی۔ بلکہ زبردستی سے گورنمنٹ کو پیچھے کھینچ لاتی ہے۔ یہ ایک بچہ کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا ہے یہی اُسی کے موافق اُس کے قانون اور اُسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔ جس طرح کہ پانی خود اپنی نپسال میں آ جاتا ہے اُسی طرح عہدہ رعایا پر عہدہ حکومت ہوتی ہے۔ اور جاہل اور خراب اور نارسیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اٹھ کر حکومت کرنی پڑتی ہے۔ تمام بھڑوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمرگی و قدر

منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عہدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن - اخلاق و عادت - تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے۔ کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے۔ اور ایک قوم کی تہذیب و حقیقت اُن مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت - شخصی عزت - شخصی اہم انداز کا شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی منزل مجموعہ ہے شخصی سستی - شخصی بے عزتی - شخصی بے ایمانی - شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔

ان تہذیبی و بدخلی جو اخلاقی و تمدنی - یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے درحقیقت وہ خود اُسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے اُن برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اُس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جائیں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ کی جائے۔

اے میرے عزیز ہم وطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اُس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو - غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح برعہ ہو۔ تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا - بات چیت کا - وضع و لباس کا - سیر سیائے کا - شغل و اشتغال کا تمہاری اولاد کے لئے ہے اُس سے اُن کی شخصی چال چلن - اخلاق و عادت - و نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا وکلا۔

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی

اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی امید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے۔ کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جبکہ ایک ناخدا اس نے جو اسکا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید کیا ہے۔ یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ اصلی غلام ہے جو بد اخلاقی۔ خود غرضی۔ جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے۔ وہ تو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے یعنی عہدہ گورنمنٹ یا عہدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں۔ جب تک کہ غلامی کی یہ ذلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عہدہ انتظام پر منحصر ہے اس وقت تک کوئی مستقل اور برتناؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو کیسے ہی عہدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جائیں۔ وہ تبدیلیاں قانونس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھیں جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔

مستقل اور مضبوط آزادی۔ سچی عزت۔ اصلی ترقی۔ شخصی جال چلن کے عہدہ ہونے پر منحصر ہے۔ اور وہی شخصی جال چلن معاشرت و تمدن کا محافظ۔ اور وہی شخصی جال چلن قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے جال اسٹورٹل جو اسی زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم گذرا ہے اسکا قول ہے کہ ”ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب اچھے پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح اور شخصی ترقی موجود ہے۔“

اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے درحقیقت وہی شے اس کے لئے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے۔ پھر اس شے کو جس نام سے چاہو پکارو۔ اسی مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کرتا ہوں کہ جہاں شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے وہاں کیسے ہی آزاد اور عمدہ گورنمنٹ کیوں نہ قائم کی جائے وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کر سکتی۔ انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے۔ گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کروے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جائے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اسکو ہادی اور رہنما بنایا جائے تو تمام قوم کی ولی آزادی کو برباد کر دے۔ اور آدمیوں کو انسان پرست بنادے۔ حقیقت میں ایسا ہونا تو تنہا کی پرستش ہے۔ اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں۔ جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مرو کرتا ہے۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے۔ اور کام میں لائیں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جائیں گے اوروں پر بھروسہ اور اپنی مرو آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدلیوں کو برباد کرتا ہے۔ اور پہلا خود انسان کو۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈارکین نے ڈبلن کی سماجی گاہ و تہکار کی میں کہا تھا۔ جو ایک بڑا خیر خواہ آئر لینڈ کا تھا۔

”اس نے کہا تھا کہ جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں اُسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کیلئے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں۔ مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت۔ ہماری آزادی ہمارے اور متحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جائیں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہلکے کوئی موقع یا آئندہ کی قوی توقع اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی دلولہ اور محنت سے کام کئے جائیگے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تصور زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جائیگی۔“

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں۔ زمین کے جوتے والوں۔ کالوں کے کھودنے والوں۔ نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں۔ محنتی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں۔ آلات جو ثقیل سے کام لینے والوں۔ اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں۔ ہنرمندوں۔ شاعروں۔ حکیموں۔ فیلسوفوں۔ ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسرے نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے۔ اور اُس کو ایک اعلیٰ درجہ تک پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاری گروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں۔ لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم اور ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی ایک ترتیب پیدا

ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اُس زرنیز اور بے ہما جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے پُرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے عہدیا ہوئی تھی۔ اور وہ جائداد ہسکو اس لئے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مار سرگنج اُس کی حفاظت ہی کیا کریں بلکہ ہم کو اس لئے دی گئی ہے کہ اُسکو ترقی دیں۔ اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لئے چھوڑ جائیں۔ مگر افسوس کہ ہماری قوم نے اُن پُرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرا دیا۔

انگریزوں کو جو دنیا کے اس دور میں استبداد ترقی ہوئی اُس کا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ اُن کی قوم میں اپنی آپ مدد کرنے کا جذبہ رہا ہے۔ اور اُس قوم کی شخصی محنت اُس پر گواہ عادل ہے۔ یہی مسئلہ اپنی آپ مدد کرنے والے انگریزوں کی قوم کی طاقت کا سچا پیمانہ رہا ہے۔

انگریزوں میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور بہت زیادہ مشہور تھے اور جن کی تمام لوگ عزت بھی کرتے تھے۔ لیکن کم درجہ کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گرد ہوں میں سے بھی اُس قوم کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ گو کسی اور لطائف میدانِ کارزار کی فہمتوں اور تاریخوں میں بڑے بڑے جرنیلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں۔ لیکن وہ فتوحات اُن کو زیادہ تر انہیں محنتی لوگوں کی شجاعت اور ہمدردی کے سبب ہوئی ہے۔ عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے شخص ہیں جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا۔ لیکن تہذیب و شایستگی اور ترقی پر اُن کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے جیسا کہ اُن خوش نصیب مشہور نامور آدمیوں کا ہوا ہے

جن کی زندگی کے حالات مورخوں نے اپنی تارخوں میں لکھے ہیں۔ ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے اس شخص کا اس کے زمانہ میں اور آئندہ زمانہ میں اس کے ملک اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن کو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے۔ اور آئندہ نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی ہی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے۔ اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔ اور جب ہم اس عملی تعلیم کا عملی مقابلہ کریں تو مکتب اور مدرسے کی تعلیم اسی عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ کے علم کا جس کو انگریزی میں "لیفٹ ایجوکیشن" کہتے ہیں انسان پر۔ قوم پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب اور مدرسہ کا علم طاق میں یا صندوق میں یا الماری میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے۔ مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے میں۔ گھر کے رہنے سننے میں۔ شہر کی گلیوں میں پھرنے میں صرافہ کی دوکان کرنے میں۔ ہل چوتنے میں۔ کپڑا بننے کے کارخانہ میں۔ کلوں سے کام کرنے کے کارخانہ میں اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ اور پھر بے سکھائے اور بے شاگرد کئے۔ لوگوں میں صرف اس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔

پچھلا علم وہ علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اس پچھلے علم

سے عمل۔ چال چلن۔ تعلیم نفسی۔ نفس کشی۔ شخصی خوبی۔ قومی مضبوطی۔  
 قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے  
 فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے  
 کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنادیتا ہے۔ اس تعلیم  
 کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا۔ اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی  
 تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ وہ علم سے  
 عمل نہیں آجاتا۔ علم کو عمل میں لانا علم سے باہر اور علم سے برتر ہے۔ اور  
 مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور آس کے علم کو باعمل یعنی آس کے  
 برتاؤ میں کر دیتا ہے۔ علم کی یہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت  
 عمدہ چال چلن کے آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے۔  
 (سر سٹیڈ از تہذیب الاخلاق)

## ✓ گذرا ہوا زمانہ

برس کی اخیر رات کو ایک بڑھا اپنے اندھیرے گھر میں اکیلا بیٹھا ہے  
 رات بھی ڈراؤنی اور اندھیری ہے۔ گھٹنا چھا رہی ہے۔ مکی ترپ ترپ کر  
 کرٹکتی ہے۔ اندھی بڑے زور سے چلتی ہے۔ دل کا پیتا ہے۔ اور دم گھبراتا  
 ہے۔ بڑھا نہایت غمگین ہے۔ مگر اس کا غم نہ اندھیرے گھر پر ہے۔ نہ اکیلے۔  
 یہی پر اور نہ اندھیری رات اور بجلی کی کرٹک اور اندھی کی گونج پر۔ اور نہ  
 برس کی اخیر رات پر۔ وہ اپنے پچھلے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ اور جتنا زیادہ یاد  
 آتا ہے۔ اتنا ہی غم بڑھتا ہے۔ ہاتھوں سے ڈھکے ہوئے منہ پر آنکھوں سے  
 آنسو بہے چلے جاتے ہیں۔



پہچلا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے۔ اپنا لڑکپن اس کو یاد آتا ہے۔ جبکہ اس کو کسی چیز کا غم اور کسی بات کی فکر دل میں نہ تھی۔ روپہہ اسٹرنی کے بدلے ریوڑی اور مٹھائی اچھی لگتی تھی۔ سارا گھر ماں - باپ - بھائی - بہن اس کو پیار کرتے تھے۔ پڑھنے کے لئے چھٹی کا وقت جلد آنے کی خوشی میں کتابیں بغل میں لے کر مکتب میں چلا جاتا تھا۔ مکتب کا خیال آتے ہی اس کو اپنے ہم مکتب یاد آتے تھے۔ وہ اور زیادہ عمکین ہوتا تھا۔ اور بے اختیار چلا آٹھتا تھا۔ "ہائے وقت! ہائے وقت! ہائے گزرے ہوئے زمانے! افسوس! کہ میں نے تجھے بہت دیر میں یاد کیا!"

پھر وہ اپنی جوانی کا زمانہ یاد کرتا تھا۔ اپنا نسخہ سفید چہرہ، مٹدول ڈیل - بھرا بھرا بدن - رسیلی آنکھیں - موٹی کی لڑی سے وانت - آہ منگ میں بھرا ہوا دل - جذبات انسانی کی جوشنوں کی خوشی - اسے یاد آتی تھی - اس آنکھوں میں اندھیرا چھائے ہوئے زمانے میں ماں باپ جو نصیحت کرتے تھے۔ اور نیکی اور خدا پرستی کی بات سناتے تھے۔ اور یہ کہتا تھا کہ "آہ ابی بہت وقت ہے" اور بڑبھاپے آنے کا کبھی خیال بھی نہ کرتا تھا۔ اس کو یاد آتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ کیا اچھا ہوتا اگر جب ہی میں اس وقت کا خیال کرتا اور خدا پرستی اور نیکی سے اپنے دل کو سنوارتا۔ اور موت کے لئے طیارہ رہتا! آہ وقت گزر گیا! آہ وقت گزر گیا! اب پچھتائے کیا ہوتا ہے؟ افسوس! میں نے اپنے تئیں ہمیشہ یہ کہہ کر پرہیز کیا۔ کہ "ابھی وقت بہت ہے" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مٹدول مٹدول کر کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھولی۔ دیکھا کہ رات ویسی ہی ڈراؤنی ہے۔ اندھیری گھٹا چھا رہی ہے۔ بجلی کی کڑک سے دل پھٹا جاتا ہے۔ ہولناک اندھی چل رہی ہے۔ دشتوں

کے پتے اڑتے ہیں۔ اور بسنے ٹوٹتے ہیں۔ تب وہ چلا کر بولا "ہاے! ہاے! میری گزری ہوئی زندگی بھی اسی ہی ڈراؤنی ہے۔ جیسی یہ رات" یہ کہہ کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

اسنے میں اس کو اپنے۔ ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن۔ دوست۔ آشنا یاد کئے۔ جن کی ہڈیاں قبروں میں گھل کر خاک ہو چکی تھیں۔ ماں گویا محبت سے اس کو بھائی سے لگائے آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہے۔ یہ کہتی ہوئی کہ "ہاے بیٹا! وقت گزر گیا، باپ کا نورانی چہرہ اس کے سامنے ہے۔ اور اس میں یہ آواز آتی ہے۔ کہ "کیوں بیٹا! ہم تمہارے ہی بھلے کے لئے نہ کہتے تھے؟" بھائی بہن دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے خاموش ہیں۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ دوست آشنا سب تکلیف کھڑے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ "اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

ایسی حالت میں اس کو اپنی وہ باتیں یاد آتی تھیں۔ جو اس نے نہایت بے پردائی اور بے مروتی اور سچے خلعی سے اپنے ماں۔ باپ۔ بھائی۔ بہن۔ دوست۔ آشنا کے ساتھ برتی تھیں۔ ماں کو رنجیدہ رکھنا۔ باپ کو ناراض کرنا۔ بھائی بہن سے بے مروت رہنا۔ دوست آشنا کے ساتھ چہرہ نہ کرنا۔ یاد آتا تھا۔ اور اس پر ان گلی ہڈیوں میں سے ایسی محبت کا دیکھنا اس کے دل کو پاش پاش کرنا تھا۔ اس کا دم چھاتی میں گھٹ جاتا تھا۔ اور یہ کہہ چلا اٹھتا تھا۔ کہ "ہاے وقت مکمل گیا! ہاے وقت مکمل گیا! اب کیونکر اس کا بدلہ ہو؟"

وہ کہہ کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اور ٹکراتا۔ لٹکھڑاتا کھڑکی کی طرف پہنچا۔ اس کو کھولا۔ اور دیکھا کہ ہوا کچھ ٹھہری ہے۔ اور بجلی کی لولہ

کچھ ٹھکی ہے۔ پر رات ویسی ہی اندھیری ہے۔ اُس کی گھبراہٹ کچھ کم  
 ہوئی۔ اور پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔  
 اتنے میں اُس کو اپنا ادھیڑ پین یاد آیا۔ جس میں نہ وہ جوانی رہی تھی  
 اور نہ وہ جوانی کا جو بن۔ نہ وہ دل رہا تھا۔ نہ دے ولوں کا جوش۔  
 اُس نے اپنی اس نیکی کے دھانے کو یاد کیا۔ جس میں وہ یہ نسبت بدی  
 کے نیکی کی طرف زیادہ مائل تھا۔ وہ اپنا روزہ رکھنا۔ نمازیں پڑھنی۔ حج کرنا  
 زکوٰۃ دینی۔ چھوٹوں کو کھانا مسجدیں اور کنوئیں بھانا۔ یاد کر کر اپنے  
 دل کو تسلی دیتا تھا۔ فقیروں اور درویشوں کو جن کی خدمت کی تھی۔ اپنے  
 پیروں کو جن سے بیعت کی تھی۔ اپنی مدد کو بکارتا تھا۔ مگر دل کی بے پیماری  
 نہیں جاتی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ اُس کے ذاتی اعمال کا اُسی تک خاتمہ  
 ہے۔ بھوکے پھر دیے ہی بھوکے ہیں۔ مسجدیں ٹوٹ کر یا تو کھڑکیں۔ یا  
 پھر دیے ہی جنگل ہیں۔ کنوئیں اندھے پڑے ہیں۔ نہ پیر اور نہ فقیر۔ کوئی اکی  
 آواز نہیں سنتا۔ اور نہ مدد کرتا ہے۔ اُس کا دل بہت گھبراتا ہے۔ اور  
 سوچتا ہے۔ کہ میں نے کیا کیا جو تمام نانی چیزوں پر دل لگایا۔ یہ پھیلی  
 سمجھ بیلے ہی کیوں نہ سوجھی؟ اب کچھ بس نہیں چلتا۔ اور پھر یہ کمر  
 چلا اٹھا سہاے وقت بڑا ہے وقت اب میں نے جھک کر کیوں بھو دیا؟  
 وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اُس کے ہنٹ کھولے۔ تو دیکھا۔  
 کہ آسمان صاف ہے۔ آندھی ختم گئی۔ گھٹا ٹھل گئی ہے۔ تارے مکمل آئے  
 ہیں۔ اُن کی چمک سے اندھیرا بھی کچھ کم ہو گیا ہے۔ وہ دل بھلانے  
 کے لئے تاروں بھری رات کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک اُس کو آسمان کے  
 نیچ میں ایک روشنی دکھائی دی۔ اور اُس میں ایک خوبصورت دلہن

نظر آئی۔ اُس نے ٹھٹھکی بانہہ کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ  
 آسے دیکھتا تھا وہ قریب ہوئی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُس کے بہت  
 پاس آگئی۔ وہ اُس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اور نہایت  
 پاک دل اور محبت کے لہجے سے اُس سے پوچھا۔ ”کہ تم کون ہو؟ وہ بولی  
 کہ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں“ اُس نے پوچھا۔ کہ تمھاری سیر  
 کا بھی کوئی عمل ہے؟ وہ بولی ”ہاں ہے“ نہایت آسان پر بہت مشکل  
 جو کوئی خدا کا فرض ادا کرے۔ انسان کی بھلائی اور اُس کی بہتری میں۔  
 سعی کرے۔ اُس کی یمن مسخر ہوتی ہوں“ دنیا میں کوئی چیز ہمیشہ رہنے  
 والی نہیں ہے۔ انسان ہی ایسی چیز ہے۔ جو اخیر تک رہے گا۔ پس جو  
 بھلائی کہ انسان کی بہتری کے لئے کی جاتی ہے۔ وہی نسل در نسل اخیر  
 تک چلی آتی ہے۔ نماز روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ اسی تک ختم ہو جاتا ہے۔ اسکی  
 موت ہن چھوڑوں کو ختم کر دیتی ہے۔ مادہی چیزیں بھی چند روز میں فنا  
 ہو جاتی ہیں۔ مگر انسان کی بھلائی اخیر تک جاری رہتی ہے۔ یمن تمام  
 انسانوں کی روح ہوں۔ جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے۔ انسان کی بھلائی میں  
 کوشش کرے۔ یہ کہہ کر وہ دھن غائب ہو گئی اور بڑھا پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔  
 اب پھر اُس نے اپنا بچھلا زمانہ یاد کیا۔ اور دیکھا۔ کہ اُس نے اپنی  
 بوچھن برس کی عمر میں کوئی کام بھی انسان کی بھلائی کا نہیں کیا تھا۔  
 اُس کے تمام کام ذاتی غرض پر مبنی تھے۔ نیک کام جو کئے تھے۔ ثواب کے  
 لالچ۔ اور گویا خدا کو رشوت دینے کی نظر سے کئے تھے۔ اخلاص انسانی بھلائی  
 کی خالص نیت سے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔  
 اپنا حال شریع کر وہ اُس دلفریب دھن کے لئے سے باہر ہوا۔ اپنا

آخر زمانہ دیکھ کر آئینہ کہنے کی بھی کچھ امید نہ پائی۔ تب تو نہایت مایوسی کی حالت میں بقیار چوکر چلا اٹھا۔ ہاے وقت! ہاے وقت! کیا پھر مجھے میں بلایا جاتا ہوں؟ ہاے! میں دس ہزار دینار دیتا۔ اگر وقت پھر آتا۔ اور میں جوان ہو سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک آہ سرد بھری اور بیہوش ہو گیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ اُس کے کانوں میں میٹھی میٹھی باتوں کی آواز آنے لگی۔ اُس کی پیاری ماں اُس کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ اُس کو گے لگا کر اُس کی بلالیں لیں۔ اس کا باپ اُس کو دکھائی دیا۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن اُس کے گرد آکر کھڑے ہوئے۔ ماں نے کہا کہ بیٹا کیوں برس برس کے دن روتا ہے؟ کیوں تو بقیار ہے؟ کس لئے تیری ہانگی بندھ گئی ہے؟ اٹھ۔ اٹھ۔ اٹھ۔ ہاتھ دھو۔ کھڑے ہیں۔ نوروز کی خوشی منا۔ جیسے بھائی بہن تیرے منظر کھڑے ہیں، تب وہ لڑکا جاگا۔ اور سمجھا کہ میں نے خواب دیکھا۔ اور خواب میں بڑھا ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنا سارا خواب اپنی ماں سے کہا۔ اُس نے سنکر اُس کو جواب دیا کہ بیٹا! پس تو ایسا مت کر۔ جیسا اُس پیشانی بڑھے نے کیا بلکہ ایسا کر۔ جیسا تیری دامن نے تجھ سے کہا۔

یہ سن کر وہ لڑکا پلنگ پر سے کود پڑا۔ اور نہایت خوشی سے چکارا کہ اے اے ایسی میری زندگی کا پہلا دن ہے میں کبھی اُس میٹھے کی طرح نہ پچتاؤں گا۔ اور ضرور اُس دامن کو پیالوں گا۔ جس نے اپنا خوبصورت چہرہ مجھ کو دکھلایا۔ اور ہمیشہ زمرہ رہنے والی نیکی اپنا نام بتلایا۔ اُو خدا اُو خدا! تو میری مدد کر۔

پس۔ اے میرے پیارے نوجوان ہموطنو! اور اے میرے سچے انسانی

بھلائی پر کوشش کرو۔ تاکہ اخیر وقت میں اس بڑھے کی طرح نہ بچتاؤ۔  
ہمارا زمانہ تو اخیر ہے۔ اب خدا سے یہ دعا ہے۔ کہ کوئی لڑکھان اٹکے اور  
انسانی ہمدردی اور اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے۔

## خان بہادر منشی غلام غوث بخیر

ان کے مورث اعلیٰ سلطان زمین العابدین شاہ کشمیر کے رہنے والے  
تھے اور حکومت سلاطین مغلیہ میں ان کے بعض بزرگ عہدہ دارے۔  
قضا کے کشمیر پر مامور ہوئے۔ ان کے والد خواجہ حنفیہ اور اللہ نیک  
وطن کر کے تیسیت چلے گئے۔ وہاں سے ریاست پٹہال میں آئے اور وہیں ان کا  
اختیار کر لیا۔ چنانچہ پیشوا علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی چار بیویاں  
عرہ تھی۔ یہ والد اور رانا کو گدیش زمانہ نے پھر نیک وطن پر موجد کیا۔ اور  
اس مرتبہ بنارس میں طے اقامت ٹھائی۔ یہیں سن شعور کو پہنچے۔ اور  
تعلیم کا سلسلہ تکمیل کو پہنچا۔ سلسلہ میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا اور  
اپنے خاں بہادر مولوی سید محمد خاں میرنشی نکلن گورنر  
شمال و مغرب کے نائب مقرر ہوئے۔ انہیں انعام میں جب لارڈ الین برار  
نے گواہ کیا۔ پر چڑھائی کی۔ تو یہ گورنر جنرل کے منشی خانے میں شاک  
ہونکہ شریک مہم ہوئے۔ اور جنگ کے خاتمہ پر بہ صلہ کارگزار کی خلعت پہنا۔ پھر  
کئی سال بعد اپنے خاں کے بجائے میرنشی مقرر ہوئے۔ اور شہید بن گئے۔ اس  
عہدہ علیحدہ پر فائز رہے اور حکام میں اعلا درجہ کا اعتبار اور وقار حاصل کیا  
غور شہید میں خیر خواہی کے صلہ میں سند و خلعت ہفت پارچہ عروج ہوا  
ملکہ مستظمہ کے خطاب شاہی اختیار کرنے کے موقع پر آپ کو نئے فوجی

۱۹۵۷ء میں ۵۴ سال لاومٹ کے بعد آپ نے پشلی۔ اور خان بہادری  
ڈوالتھار کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

شاعری اور انشاپرگازی میں آپ کو ایک امتیازی درجہ حاصل تھا غالب مرحوم  
سے دور رس تعلقات تھے۔ اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ خطوط کا طرز تحریر نہایت  
دلکش تھا۔ آپ کی دو تصنیفیں۔ خونِ ناپائے جگر۔ فغانِ پیشہ۔ یادگار ہیں۔  
آپ نے پیرائے سالی میں ۱۹۵۷ء میں انتقال فرمایا۔

## صبح اور دوپہر اور شام ہونے کا سماں

صبح

رات آخر ہوئی۔ صبح صادق کا جلوہ نظر آنے لگا۔ ستارے جو رات کی  
ساری کی میں چمک دکھا رہے تھے۔ اپنی روشنی کو کھینکی دیکھ کر شرمائے  
اور آہستہ آہستہ غائب ہوئے۔ جیسے چور نور کا تڑکا ہوتے ہی اپنے اپنے  
گھٹکے کو بھاگتے ہیں۔ شب کی سیاہی کا رنگ آڑا۔ مشرقی آفاق پر  
سفیدی نمودار ہوئی۔ گویا محبوب صبح نے رات کے سیاہ بکھرے ہوئے بالوں کو  
چہرے سے سمیٹ لیا۔ اور اس کی نورانی پیشانی نظر آنے لگی۔ نیم سحری معشوقوں  
کی طرح خوش خرامی کرتی ہوئی چلی۔ نرم نرم شاخیں درختوں کی سنبھوں  
کے مانند جھٹوٹنے لگیں۔ چاندروں نے پہچانا شروع کیا۔ باغ میں غنچے  
کھلنے لگے۔ جیسے نیند سے کوئی آنکھ کھولے۔ دریا میں تیلی تیلی لہریں ٹریں۔  
کاشمیر قدرت نے قلم شمع سے درنگار کرنے کے لئے صفحہ آب پر مسطر کیا۔  
شاہی نوبت خانے کے کوس و دہل کی آواز بلند ہوئی۔ اس کی سرسلی آواز  
سے لوگ نیند سے چونکے۔ اور اپنے اپنے کام سے لگے۔ میکدہ کا دروازہ

ٹھہلا۔ مچھلیوں نے صحنِ میخانہ کی رفعت و عروج کی سپریمسی نے صراحی اور  
ساحرِ سنبھالا۔ میکشوں نے شب کے خمار کی سرگرمی دفع کرنے کی  
غرض سے صبح کی فکر میں اس طرف کی راہ لی۔ دوسرے صبح نے اذان  
دی تو دوسرے مؤذن بھی اپنے درجے سے مکمل صحنِ مسجد میں اکٹھا ہوا  
اس کے گلے سے گلا ملائے لگا۔

یہ سن کر رات بھر کے جاگے ہوئے عابد انگڑائیاں لیکر سجادہ پر  
سے اٹھتے تھے اور عمامہ سنبھال عصا ہاتھ میں لے مسجد کی راہ ناپتے  
چلے۔ جبکہ میں گھٹنے اور ناقوس بچے۔ برہمنوں نے پھول اور سیندر  
توں پر چڑھا کر بھیر دی بھجن گانا شروع کیا۔ صنم پرستوں نے سجادہ  
پت کے لئے آمادہ ہو کر بیت الصنم کا ارادہ کیا۔

### دوپہر

دوپہر کا وقت ہوا۔ آفتاب سمتِ آسمان پر آیا۔ زمین ٹپٹنے لگی۔ پاؤں  
رکھتے ہوئے ٹھونکتا تھا۔ کہ چھانے نہ پڑیں۔ پیٹھے ہوئے ہی ڈرتا تھا۔  
کہ سانس کی گرجی سے لب پر نہ بچائے نہ پڑیں۔ آسمان سے وہ آتشباری  
ہونے لگی۔ کہ ہوائی شعلہ جوالہ کی صورت پیدا کی۔ خاک کے ذروں  
نے چنگاریوں سے ہیئت بدلی۔ جانوروں نے ڈر سے اڑنا موقوف کیا  
کہ جسم جل کر کباب نہ ہو۔ زمین کی وہشت سے سکتہ کی حالت ہو گئی۔  
کہ دھوپ کی گرمی سے پھل کر آب نہ ہو۔ دوکانداروں نے دوکانوں  
کے تختے لگا دیے۔ اور اس کی آڑ میں پڑ رہے۔ لوگوں کا گھروں سے  
نکلنا۔ چلنا۔ پھرنا۔ بند ہونا۔ بازاریں سسٹناں ہو گئیں۔ دن کے رات کا  
سنگٹا پیدا کیا۔ شہر شہر خوشاں کا نقشہ بن گیا۔ چوپائے سایہ میں کھڑے



ہو کر باپنے گئے۔ ہر درخت شکل چنار ہو گیا۔ دھوپ کی تابش سے معلوم ہوتا تھا کہ کھڑا بھل رہا ہے۔ گھاس مڑھچا کر زمین سے ایسی لپٹ گئی۔ جیسے کسی نے کاٹ کے ڈال دی ہو۔ حوضوں کا پانی ایسا گرم ہو گیا۔ کہ مسجدوں پر ہٹاموں کا گمان ہونے لگا۔ موذیوں نے چپکی سادھی۔ جانبہ بھی عبادت چھوڑ کر قیلولہ کی سنت ادا کرنے کے بہانے سے لیٹ رہے۔ پرہیز بٹخانے کے کونے میں یوں خاموش ہو کر بیٹھا۔ کہ بہت ہن گیا۔ میکدہ میں شمع دانوں پر سر رکھ کے اس مشکل سے ہو بیٹھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ ٹنگے پر پالہ اودھا دیا۔ غریبوں نے اپنے گھروں میں گھاس کی ٹالیاں لگالیں۔ مٹی کی صراحیوں پر کھڑا بھنگو گے لپٹ دیا۔ امیروں نے فدا خانوں میں آرام فرمایا۔ غصے کی ٹپٹیاں چھڑکی جانے لگیں۔ فراشی ہیکھے کھینچنے لگے۔ نخس کی خوشبو سے ہوا کے جھوکوں پر تلخونے کا یقین آنے لگا۔ صراحیوں بہت میں لگائی گئیں۔ شربت کی قفلیاں جاتی گئیں۔

### سیام

دن تمام ہوا۔ جھٹ پٹے وقت نے رات کی آمد کی خبر دی۔ مغربی گوشہ سے تاریکی کا جوش ہوا۔ جیسے پہاڑ کے غار سے سیاہ ابر اُمنڈے۔ آفتاب دن کے تماشائے شمع ہونے سے ایسا آداس ہوا۔ کہ منہ پر زردی چھا گئی۔ بادل ناخواستہ مغرب کو چلا۔ لپلا سے ییل نے شرم سے کہ آفتاب جاتے ہوئے آسے دیکھ نہ لے۔ سیاہ نقاب منہ پر ڈالا۔ ہوا جو دن بھر زور سے چل رہی تھی۔ دھیمی ہوئی۔ اور جھکے ہوئے مسافر کی طرح آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ درختوں کے پتوں نے کھڑکھڑانا۔ دریا کے پانی نے لہنا موڑنا کیا پائے ہوئے جانور جو دن کو چرائی کے صحرا میں کیل کر رہے تھے۔ ان کو

سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی جس سے انسان مرتبہ انسانیت سے بڑھکر قدیم مارے لگتا تھا۔ عجب بات تھی کہ اتنے ابوہ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص تھے جن کے کان اس کے نشتے کی قابلیت۔ یا اُس کے لغزوں کا مذاق رکھتے تھے۔ ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا۔ اور وہ تعجب فوراً جاتا بھی رہا۔ یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی۔ تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوبصورت خوبصورت عورتیں ہیں۔ اور بہت سے لوگ اُن کے شاخسے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پرلوں کا لباس پہنے ہیں۔ مگر یہ بھی وہیں چرچا رہا۔ کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں۔ نہ پریراؤ عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں عظمت۔ کوئی عیناثی ہے کوئی خود پسندی۔ کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی بہت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے۔ تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انہی میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان پر درختوں کے جھنڈ سایہ کئے تھے۔ رنگ برنگ کے پتوں مچھلے تھے۔ گونا گوں میوے جھوم رہے تھے۔ طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی نہریں۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دانش فریب پریاں تبھروں کی سلاوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ اور آپس میں چھیٹے لڑ رہی تھیں۔ مگر ایسے ایسے الجھاوے بلندی کوہ کے اُدھر ہی اُدھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جلی پرلوں کی طرف مائل ہیں۔ وہ اگرچہ اقوام مختلفہ۔ عہد ہا متفرقہ۔ عمر ہائے متفاوتہ رکھتے ہیں۔ مگر وہی ہیں جو حوصلے کے چھوٹے۔ ہمت کے سیٹے۔ اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا۔ کہ جو بلند حوصلہ۔ صاحب ہمت۔ عالی طبیعت تھے  
 وہ ان سے الگ ہو گئے۔ اور غول کے غول شنائی کی آواز کی طرف بلندی  
 کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔ اسی قدر وہ آواز  
 کانوں کو خوش آئند معلوم ہوتی تھی مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ بہت سے  
 چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادے سے آگے بڑھے۔ کہ بلندی کوہ پر چڑھ  
 جائیں۔ اور جس طرح ہو سکے۔ پاس جا کر اس نعمت آسمانی سے قوت روحانی  
 حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چڑیں اپنے اپنے ساتھ لینے لگے معلوم  
 ہوتا تھا۔ کہ گویا آگے کے راستے کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا  
 الگ الگ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی۔ ایک ہاتھ میں نشان  
 تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزاء تھے۔ کسی کی بغل میں ایک کیساں  
 تھی۔ کوئی پٹلیں سنے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما اور دُور بین سنبھالے تھا  
 بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ  
 تھا۔ غرض علم ریاضی اور جز ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا۔ جو اس وقت کام  
 میں نہ آ رہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں۔ کہ ایک فرشتہ رحمت میرے داپنے  
 ہاتھ کی طرف کھڑا ہے۔ اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے  
 کہ یہ سرگرمی اور گرجوشی تمھاری نہیں نہایت پسند ہے۔ اس نے یہ بھی  
 صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد  
 اس کے گروہ مذکور فرستے میں منقسم ہو گیا۔ کوہ مذکور پر راستوں کا  
 شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا۔ کہ  
 چھوٹی چھوٹی کھائیوں میں ہوئے۔ وہ کھوڑی ہی دُور چڑھے تھے۔ کہ  
 ان کا رستہ ختم ہوا۔ اور وہ ختم گئے۔ مجھے معلوم ہوا۔ کہ ان پست

ہمٹوں نے صنعتگری اور دستکاری کی راہ لی تھی۔ کہ روپے کے بھوکے تھے۔ اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے تھا۔ جنہوں نے دلاوروں اور جانبازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا۔ اور خیال کیا تھا۔ کہ چڑھائی کے رستے بنے پائے۔ مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم بہم معلوم ہوئے۔ کہ ٹھوڑا ہی آگے بڑھکر اس کے پیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے۔ ہر چند برابر قدم مارے جاتے تھے۔ مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھتے تھے۔ میرے فرشتہ رحمت نے ہدایت کی۔ کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ جہاں عقل صادق اور عزم کامل کام دیتا ہے۔ وہاں چاہتے ہیں کہ فقط چالاک سے کام کر جائیں۔ یعنی ایسے بھی تھے۔ کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا۔ کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے۔ اتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہو گئے۔ کہ پھر بڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اُس سے وہ لوگ مراد ہیں۔ جو مدد روزگار سے ترقیاں حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر کوئی ایسی حرکت ناشائستہ کرتے ہیں۔ کہ دھم گڑبٹے ہیں۔ اور آئندہ کے لئے بالکل اُس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ہم اتنے عرصہ میں بہت اونچے چڑھ گئے۔ اور معلوم ہوا۔ کہ جو چھوٹے بڑے رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں۔ اوپر آکر ڈو شاہراہوں سے ملتے ہیں چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب بہمت ڈوگر وہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان دونوں شاہراہوں میں ذرا آگے بڑھکر ایک بھوت ڈراونی صورت۔ نہایت ناک صورت کھڑا تھا۔ آگے جانے سے روکتا تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک درخت خار دار کا ٹہنا تھا۔ بھوت کا نام دیو ہلاک تھا۔ اور کاتے وہی ترقی کے مانع اور موت کے بہانے تھے۔ جو انو العزموں کو راہ ترقی

میں پیش آتے ہیں۔ چنانچہ جو سامنے آتا تھا۔ مٹنے کی مار مٹھ پر کھاتا تھا دیو کی شکل ایسی خوشخوار تھی۔ گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ ان کاٹھوں کی مار سے غول کے غول اہل ہمت بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے۔ اور ڈر ڈر کر چلانے لگتے۔ کہ ہئے ہئے موت! ہئے ہئے موت!

دوسرے رستے پر جو بھوت تھا۔ اُس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ لیکن ڈراؤنی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے۔ جو اُس کی زبان سے نکلتے تھے۔ اس لئے اُس کا مٹھ ایسا بُرا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اُس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا۔ کہ برابر چھینٹیں اڑائے جاتا تھا۔ اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا۔ تو اکثر اشخاص ہم میں سے بیدل ہو کر رہ گئے۔ اور نصف اپنے یہاں تک آتے۔ پر نادوم ہوئے لیرا یہ حال تھا۔ کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا۔ اور قدم آگے نہ اٹھتا تھا۔ اتنے میں ایک شرمیلی کی آواز اُس تیری کے ساتھ کان میں آئی۔ کہ بچھے ہوئے ارادے پھر چپک اٹھے جس قدر کہ دل زندہ ہوئے اسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اڑتے گئے چنانچہ بہت سے جاں باز جو شمشیر کا علم کئے تھے۔ اس کرک کرک دھک سے قدم مارتے آگے بڑھے۔ گویا حریف سے میدان جنگ مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا۔ یہ اُس دھانے سے ٹکلی گئے اور وہ موت کے دانت ٹکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے۔ وہ اُس رستے پر پڑے۔ جہم حسد کا بھوت کھڑا تھا۔ مگر اس آواز کے ذوق و شوق نے انہیں بھی ایسا مست کیا۔ کہ گالیاں کھاتے کیچڑ میں نہاتے پڑے

یہ بھی اُس کی حد سے نکل گئے۔ چنانچہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں  
 تھیں۔ وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں۔ آگے دیکھا تو اُن کی دسترس  
 سے باہر ہیں۔ اور راستہ بھی صاف اور ہموار۔ بلکہ ایسا خوشنما ہے۔ کہ مسافر  
 جلد جلد آگے بڑھے۔ اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔  
 اِس میدانِ رُوح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں بخش اور رُوحانی ہوا  
 چلنے لگی۔ جس سے رُوح اور زندگی کو توت دوائی حاصل ہوتی تھی۔ تمام  
 میدان جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا۔ اُس کا رنگ کبھی نور سحر  
 تھا۔ اور کبھی شام و شفق۔ جس سے قوس۔ قزح کے رنگ میں کبھی شہرت  
 عام۔ اور کبھی یقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور سرور کا عالم دل  
 کو اِس طبعِ تسلی و تشفی دیتا تھا۔ کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبارِ دل سے  
 دھوئے جاتے تھے۔ اور اِس مجمعِ عام میں امن و امان اور دلی آرام  
 پھیلتا تھا۔ جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر  
 عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوانِ عالیشان دکھائی دیا۔ کہ اُس کے چاروں طرف  
 پھانک تھے۔ اُس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک  
 پری حورِ شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے۔ اور وہی شنائی بجا رہی  
 ہے۔ جس کے بیٹھے بیٹھے سروں نے اُن مشتاقوں کے انہوہ کو یہاں تک  
 کھینچا تھا۔ پری اُن کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اور سروں سے ایسی صدا  
 آتی تھی۔ گویا اُنے والوں کو آفریں و شاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ  
 خیر مقدم! خوش آمدید!۔ صفا آدر دید!۔ اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی  
 فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ مورخوں کا گروہ ایک دروازے پر استادہ  
 ہوا۔ تاکہ صاحبِ مراتب اشخاص کو حسبِ مراتب ایوانِ جلوس میں داخل کرے

ایکایک وہ شہنائی۔ جس سے کبھی شوق انگیز و جوش خیز۔ اور کبھی جنگی  
 باجوں کے سر نکلتے تھے۔ اب اس سے نظریاتی اور مبارکبادی کی صدا آئے  
 لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا۔ اور دروازے خود بخود کھل گئے۔  
 جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی راجاؤں کا  
 راجہ ممالاجہ ہے۔ چاند کی روشنی چہرے کے گرد ہالہ کئے ہے۔ سر پر سوچ کی  
 کرن کا تاج ہے۔ اس کے استقلال کو دیکھ کر لنگا کا کوٹ پانی پانی ہوا  
 جاتا ہے۔ اس کی حق داری جھگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جاں نشاری  
 میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامتوں کے سائے میں لئے آتے ہیں۔  
 فرقے فرقے کے علماء اور مورخ اُسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو بڑھے  
 اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص  
 گمن سالہ رنگت کا کالا ایک پوتھی نعل میں لئے۔ ہندوؤں کے غول سے  
 نکلا۔ اور یہ آواز بلند چلا یا۔ کہ ”آنکھوں والو! کچھ خبر ہے۔“ دیکھو! دیکھو!  
 ترتیب کے سلسلے کو برہم نہ کرو۔ اور مڑ لکار کے نور کو اجسام خاک میں  
 نہ ملاؤ۔“ یہ کہہ کر آگے بڑھا تو اپنی پوتھی نذر گزرائی۔ اُس نے نذر قبول  
 کی۔ اور نہایت خوشی سے اُس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو معلوم ہوا  
 کہ اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا  
 ہمنہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا۔ کوئی کچھ سمجھا۔ اُس وقت ایک ہان یعنی  
 تخت ہوا دار آیا۔ وہ اُس پر سوار ہو کر آسمان کو اڑ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ  
 رام چندر جی ہیں۔ اور یہ والمیک ہے۔ جس نے رامائن نذر دی۔  
 سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ  
 اتنے میں ایک اور آمد آئی ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو تبدیل پہلیں

اڑائے لئے آتی ہیں اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے۔ مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقے فرقے علما اور مؤرخ لینے کو ملے۔ مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بے قراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا۔ راجہ تو جہا راجہ بکرا جیت گئے۔ اور تخت سنگھاسن تہیسی پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک جھورج کا شونا۔ اور چاند کی چاندی چکتی ہے۔ نہ آپ کا سنہ بیٹے گا۔ نہ سکتہ بیٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی۔ اور انھیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قبیل و قال ہوئی۔ کیونکہ وہ چٹا تھا۔ کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے۔ اور اراکین و بارہا کہتے تھے۔ کہ یہاں شکست اور غرور کا گذار نہیں۔ اتنے میں وہی تہیسی پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا۔ ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر آشیر باد کی۔ اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پتے کے ٹوڑا نے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ راجہ جھورج تھے۔ اور تہیسی پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب سنگھاسن تہیسی تھی۔ جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پر رکھا۔ وہ کالی واس شاعر تھا۔ جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر نصرت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔

اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھے۔ اتنے میں معلوم ہوا۔ کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فرش جھاڑ و قالوس سے بقتہ نور بنا ہوا



ہے۔ ایک جوان پیل پیکر۔ ہاتھ میں گروگاؤ سر۔ نشاے شجاعت میں مست  
 چھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے۔ ٹخوں تک زمین  
 میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اس کے شاہان کیانی اور پہلوانان ایرانی  
 موجود ہیں۔ کہ درفش کاویانی کے سایہ بے زوال میں لئے آتے ہیں۔  
 حُب قوم اور حُب وطن اس کے دایں بائیں پھول برساتے تھے۔ اس کی  
 نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا۔ اور سر پر کلمہ شیر کا خود فولادی  
 دھرا تھا۔ مورخ اور شعرا اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔  
 سب نے اسے بہ تعظیم دیکھا۔ انہی میں سے ایک پیر مرد دیرینہ سال  
 جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے۔ وہ اس کا  
 ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ اور ایک کرسی پر بٹھایا۔ جسے بجائے پایوں کے  
 چار شیر کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے۔ پیر مرد نے اہل مجلس کی طرف  
 متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور کے پڑھے۔ نہیں۔ بلکہ اس کے کارناموں  
 کی تصویر صفحہ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی۔ جو قیامت تک رہے گی۔  
 بہادر پہلوان نے اٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور گل فروں کا  
 ایک طوہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی۔ کہ الہی! یہ بھی  
 قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے۔ تمام اہل محفل نے آمین کہی۔  
 معلوم ہوا۔ کہ وہ بہادر ایران کا حامی۔ شیر سستانی۔ رستم  
 پہلوان ہے۔ اور کس سال مایوس فروسی ہے۔ جو شاہنامہ گو کہ  
 اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا۔ جس کا حُسن شباب نوخیز اور  
 دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاج شاہی تھا۔ مگر اس سے

ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی۔ ساتھ اس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا مگر سب اسے دیکھ کر ایسے محو ہو گئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مؤرخ اور محقق اس کے لینے کو بڑھے۔ مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اس سخت کی طرف لے چلے جو کہاں کی اور افسانوں کے ناموروں کے لئے تیار ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے غلط تھا۔ ایک انبوہ کو چہرہ نکلا۔ وہ کوئی یونانی مؤرخ تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھا دیا۔ فرشتہ رحمت نے میرے کان میں کہا۔ کہ تم اس گوشے کی طرف آ جاؤ۔ کہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمہیں کوئی نہ دیکھے۔ سکندر یونانی ہے۔ جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں اس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا۔ کہ سر پر کلاہ کیہانی اور اس پر درفش کاویانی جھومتا تھا۔ مگر پیریا علم کا بارہ بارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا۔ کہ گویا اپنے زخم کو بجائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا۔ اور شرم سے سر جھکائے تھا جب وہ آیا۔ تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو آٹھا۔ اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا۔ اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی۔ وہ وارا بادشاہ ایران تھا۔

دفعۃً سکندر نے آواز دی ”آنہیں لاؤ۔ جو شخص داخل ہوا۔ وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا کہ ہمیشہ ٹوڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصا پر تھی۔ جس وقت وہ آیا۔ سکندر خود اٹھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا۔ اپنے برابر کرسی پر

بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ  
نظامی گنجوی ہیں۔ اور اس سہرے میں جسے کے مضامین سے پھول  
پڑے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک  
کر کہا۔ ”اب یہ کبھی نہ کھلائیں گے۔“

بعد اس کے جو شخص آیا۔ اگرچہ وہ ساوہ وضع تھا۔ مگر تیانہ روشن  
اور چہرہ فرحت روحانی سے شکستہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آپکے تھے  
ان سب سے زیادہ عالی رتبے کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے دانے  
ہاتھ پر افلاطون تھا۔ اور بائیں پر جالینوس۔ اس کا نام سقراط  
تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے۔ کہ  
ارسطو اپنے استاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا۔ مگر اس  
مقدمے پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے۔ کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو  
تھا۔ اس منطقی دوست نے کچھ شہونی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلائل  
زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کر لیا۔ کہ  
یہ مسند میرا ہی حق ہے۔ اور یہ کہ کہ اول سکندر کو آئینہ دکھایا۔ پھر  
نظامی کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ سب جتہ و عمامہ اور  
طبل و دمامہ رکھتے تھے۔ مگر باہر روکے گئے۔ کیونکہ ہر چند ان کے جتے  
دہن تیانہ سے دامن باندھے تھے۔ اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے۔ مگر  
اکثر ان میں طبل تہ کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لئے  
منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علما و فضلا کا ہویا۔ تعجب یہ  
ہے۔ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوہیاں اتارے ان کے ساتھ تھے۔

بلکہ چند ہندو بھی تقدیم کے پیرے لئے آشیر باد کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ  
 ان میں ہاروں رشید اور دوسرا ماموں رشید تھا۔  
 تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہوا۔  
 ولایتی استخواں و ولایتی لباس تھا۔ اور جامہ خوں سے قلمکار تھا۔  
 ہندوستان کے بہت سے گراں بہا زیور اس کے پاس تھے۔ مگر چونکہ تاؤ تھا  
 تھا۔ اس لئے کچھ زیور ہاتھ میں لئے تھا۔ کچھ کندھے پر بٹے تھے۔ ہر رشید یہ  
 جوہرات اپنی ابداری سے پائی ٹیکاتے تھے۔ مگر جہاں قدم رکھتا تھا۔ بچانے  
 غبار کے آہوں کے دھوئیں اٹھتے تھے۔ وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے  
 مصنف اس کے استقبال کو بڑھے۔ مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم  
 ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان خوش شائل آیا۔ اور غردوسی کا ہاتھ پکڑ کر  
 محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے اشتیاق اور شکہ گزاری سے اس کا  
 ہاتھ پکڑا اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھمک گئیں۔  
 نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا۔ وہ ایاز تھا۔  
 اسی عرصے میں ایک اور شخص آیا۔ کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا۔  
 مگر چال وصال لوتا شیوں سے ملاتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعرا تو  
 الگ ہو گئے۔ مگر تمام علما اور فضلا میں تکرار اور قیل و قال کا عمل ہوا۔ یہ  
 سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا۔ اور ارسطو کے مقابل میں ایک  
 کرسی بچھی تھی۔ اس پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ یوحنا سینا تھا۔  
 ایک ابنہ کشیر ایرانی۔ تورانی۔ لوگوں کا دیکھا۔ کہ سب معقول  
 اور خوش وضع لوگ تھے۔ مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ بعض کے  
 ہاتھوں میں اجڑا۔ اور بعض کی بغل میں کتاب تھی۔ کہ اوراق ان کے

نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم معالیٰ و مضامین کے مصور ہیں۔ آن کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ تم مصور بے شک اچھے ہو۔ مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیاء کے مصور ہو۔ تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں البتہ انتخاب ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ ابوری - خاقانی - ظہیر فارابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندرائے باقی سب نکالے گئے۔ ان شاعر تھے کان پر قلم دھرا تھا۔ اُس میں سے آنچکات سنی بونڈیں ٹپکتی تھیں۔ مگر کبھی کبھی اُس میں سے سانپ کی زبان لہرائی نظر آتی تھیں۔ اس لئے اس پر پھر تکرار ہوئی۔ اُس نے کہا کہ بادشاہوں کو خلائے دفع اعدا کے لئے تلوار دی ہے۔ مگر ملک مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بونڈیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں۔ تو اعدائے بد نہاد ہمارے خون عزت کے بہانے سے کب باز رہیں چنانچہ یہ عزت اُس کا قبول ہوا۔ یہ ابوری تھا جو باوجود گل افشانانہ محضات کے بعض موقع پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اُس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔

خاقانی پر اس معاملے میں اُس کے استاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔ چونکہ اُس کی پیاد خانگی نزاع پر تھی۔ اس لئے وہ بھی اُن کی کمرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہو سکا۔

اسی عرصے میں چنگیز خاں آیا۔ اُس کے لئے گو علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا۔ بلکہ جب اندر لائے۔ تو خاندانی بادشاہوں نے اسے چشم حقارت سے دیکھ کر قہقہہ کیا۔ البتہ مؤرخوں کے گروہ نے بڑی دھوم

دھام کی۔ جب کسی کی زبان سے نسب نامہ کا لفظ نکلا۔ تو اُس نے فوراً شمشیر جو ہر دارِ سند کے طور پر پیش کی۔ جس پر خونِ حرفوں سے رقم تھا۔ ”سلطنت میں میراث نہیں چلتی“ علما نے غل مچایا۔ کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی لو آئے وہ قصاب ہے؟ بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعرائے کہا۔ کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوٰر ان تصانیف کی تحریر نے رنگ بقائے ڈالا ہو۔ اُسے اس دربار میں نہ آئے دیں گے؟ اس بات پر اُس نے بھی تامل کیا۔ اور متناست معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت بالنت نے آواز دی۔ کہ ”اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کہ قوم کے خون میں حرکت دی۔ اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا۔ تو کچھ قوی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا“ اتنے میں چند مؤرخ آگے بڑھے۔ آنکھوں نے کچھ ورق دکھائے۔ کہ ان میں طورہٴ خلیجِ خالی یعنی اُس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا۔ کہ اُسے دربار میں جگہ دو۔ مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دیدو۔ اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ ایک جوان اسی شکوہ و نشان کا ادب آیا اس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اس کے لئے چند علما نے بھی مؤرخوں کا ساتھ دیا۔ جن وقت اندر لائے۔ تو اس کے لئے بھی تمکراتوں کا غل ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا۔ جس کی وضعِ قشعرِ عالموں کی تھی۔ لیکن کمر میں ایک طرف اصطلاب۔ دوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔ بغل میں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزاء تھے۔ ان کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ انھیں دیکھ کر کوئی

بول نہ سکا۔ اُسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو  
 شیخ ابو علی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھا لیا۔ کہ آپ نے میری کلاہ شہت  
 میں بقائے دوام کے اہدار موتی ٹٹائے۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔  
 ٹھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے  
 مؤرخوں نے اس کے لائے کی التجا کی۔ مگر وہ سب کو دروازے پر چھوڑ  
 گیا اور اپنا آپ رہنبر ہوا۔ کیونکہ وہ خود مؤرخ تھا۔ رستہ جانتا تھا۔ اور اپنا  
 مقام بچا جانتا تھا۔ لنگراتا ہوا گیا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی  
 پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہا: اے اہل تصنیف میں  
 تم سے سوال کرتا ہوں۔ کہ ہماری قلمشیر کے عوض جو خدائے تمہیں قلم تحریر  
 دیا ہے، اُسے اظہارِ واقعیت اور خلافت کی عبرت اور نصیحت کے لئے  
 کام میں لانا چاہیے۔ یا اغراضِ نفسانی اور بد زبانی میں؟ تمام مؤرخ ایک  
 دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کہ یہ کس پر اشارہ ہے۔ تیمور نے ابن  
 عرب شہاہ کے بولنے کو ایسا فرمایا۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا  
 چنانچہ اس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔  
 اسی حال میں دیکھتے ہیں۔ کہ ایک بزرگ آزاد وضع۔ قطع تعلقی کا  
 لباس بر میں۔ خاکساری کا عمامہ سر پر۔ آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام  
 علماء و صلحا مؤرخ و شاعر سر جھکائے ان کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازے  
 پر آکر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کی التجا کی۔ تو کہا: معذور رکھو۔  
 میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے؟ اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے  
 جاتے۔ اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا  
 وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشہ بینائی ان کے ہاتھ میں تھا۔ کہ

اُس میں کسی کو دودھ۔ کسی کو شربت۔ کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی  
 ہر ایک گڑسی نشین اُنہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنی وضع  
 کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اس سرے سے اُس سرے تک ایک  
 گردش کی اور چلے گئے وہ حافظ شیرازی تھے۔ اور شیخہ بینائی اُن کا  
 دیوان تھا۔ جو فلک بینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔ لوگ اور  
 گڑسی نشین کے مشتاق تھے۔ کہ دُور سے دیکھا بیٹھا لڑکوں کا غول غل  
 چھاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں ان کے ایک مرد نورانی صورت۔ جس کی سفید  
 ڈاڑھی میں لنگھتہ مزاجی نے گنگھی کی تھی۔ اور خندہ جمینی نے ایک قرعہ  
 سر پر آویزاں کیا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ۔ دوسرے میں  
 ایک سیوہ دار شنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف  
 قرعوں کے لوگ تھے۔ جو باہر استقبال کو کھڑے تھے۔ مگر اُنہیں ویکہ کر  
 سب نے قدم آگے بڑھائے۔ کیونکہ ایسا کون تھا؟ جو شیخ سعدی اور  
 اُن کی گلستاں بوستاں کو نہ جانتا تھا۔ ہ۔ اُنہوں نے کمرے کے اندر  
 قدم رکھتے ہی سعدی کی کوچی کو بوجھا۔ اس بیچارے کو ایسے درباروں میں  
 بار بھی نہ تھی۔ لیکن اور گڑسی نشین۔ کہ اکثر اُن سے واقف تھے اور اکثر  
 اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے۔ وہ اُن کے مشتاق معلوم ہوئے باوجود اس کے  
 یہ سننے اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے ”دنیا دیکھنے  
 کے لئے ہے۔ برتنے کے لئے نہیں“

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اَلو العزم شخص  
 آیا جس کے چہرے سے خود سری کا رنگ چمکتا تھا۔ اور سینہ زوری کا جیش  
 بازوؤں میں بل مار رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پر ٹکڑا ہوئی۔ اور مقدمہ یہ تھا۔



کہ اگر علما کی نہیں۔ تو موڑتوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہئے۔ بلکہ ہفتائی  
خاندان کے موڑتے صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اس نے باوجود  
اس کے ایک گڑھی جس پر تیموری تمغا بھی لگا تھا۔ گھسیٹ لی۔ اور  
بیٹھ گیا ہمالیوں اُسے دیکھ کر شرابا۔ اور سر جھکا لیا۔ مگر تاج شاہی پر  
انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا۔ اور کہا کہ ”بے حق بے اعتدال بے  
اُس نے وارسی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ ”مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن  
کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدیم چلے گی اور فخر کرے گی۔“

تھوڑی دیر کے بعد ایک خوشید کلاہ آیا۔ جس کو انہو کثیر ایرانی  
تورانی۔ ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں سے آتا تھا۔  
وہ جس وقت آیا۔ تمام اہل دربار کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور  
رضا مندی عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے۔ کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان  
سمجھتے تھے۔ ہندو اُسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست  
دکھائی دے رہا تھا۔ انھارے اُس کو نصاریٰ سمجھتے تھے۔ مگر اُس کے  
تاج پر تمام سنگت حروف لکھے تھے۔ اُس نے اپنے بعض ہمعوموں اور ہم  
تہذیبوں کی شکایت کر کے پراپوانی پر خون کا دعویٰ کیا۔ کہ اُس نے میری  
جہات جاودانی کو خال میں ملانا چاہا تھا۔ اور وہ قیاب ہوتا۔ اگر چند مصنف  
مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی  
نہ کرتی۔ سب نے کہا ”نیت کا پھل ہے۔“

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا۔ جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم  
ہوتا تھا۔ وہ خود محمود رشتے میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا  
ہاتھ پکڑے آتی تھی۔ اور جلدھر چاہتی تھی۔ پھرتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا

اُس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا۔ اور جو کچھ کہتا تھا۔ اسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جز کاغذوں کا تھا۔ اور کان پر قلم و دھوا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے۔ اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لئے بدست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھ کھلتی تھی۔ تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بگم نور جہاں تھی۔

شہناہ جہاں۔ بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مورخ اس کے ساتھ کتابیں نقل میں لئے تھے۔ اور شاعر اس کے آگے آگے قصبہ پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹو گراف ہاتھ میں لئے تھے جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی تھیں۔ اور سیکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضامندی عام کا غلطہ بلند ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک فوجان آنکھوں سے اندھا چند بچوں کو ساتھ لئے آیا۔ کہ اپنی آنکھوں کا اد۔ بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہریار شاہ جہاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کا آگے بڑھا۔ اور کہا کہ جو کیا گیا بدیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا بلکہ خلق خدا کی امانت اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہر حال اسے دربار میں جگہ ملی۔ اور سلاطین چھتراسپہ کے معزز درجے پر ممتاز ہوا۔

ایک تاجدار آیا۔ کہ جتے اور عمامے سے وضع زاپدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تبتیج پھیرتا جاتا تھا مگر دوسرے ہاتھ میں جو خرد حساب تھی اس میں فرق تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پرتا تا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا۔ کہ انھیں خانقاہ میں لیجانا چاہئے۔ اس دربار میں ان کا کچھ کام نہیں

لیکن ایک ولایتی کہ مقطع اور معقول نظر آتا تھا۔ وہ دونو ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا۔ اور کہا کہ اے اراکین دربار! ہمارے ظل سبحانی نے اس کجخت سلطنت کے لئے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا۔ اس پر بھی تمہارے اعتراض اس دربار میں جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اُس نے اس مسخران سے ادا کیا۔ کہ سب مسکرائے اور بخوبی ہوئی۔ کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انہیں بھی جگہ دے دو۔ معلوم ہوا۔ کہ وہ عالمگیر بادشاہ اور ساتھ اُس کے نعمت خاں عالی تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بیٹا جوان دکھنی وضع۔ چنگ کہ ہتیار لگائے۔ راجگی کے سنے ٹھنڈے سجا ہوا آیا۔ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوئے بلکہ عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا۔ مگر وہ کڑسی کھینچ کر اُس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ اور بولا کہ صاحب ہمت کو جگہ دو یا نہ دو۔ وہ آپا ہی جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ سیلوانا جی تھا۔ جن سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دُور سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ اور بعد اس کے ایک باوشاہ کیا۔ اُس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنفوں اور موزوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے۔ کہ کوئی ان میں گویا اور کوئی بھانڈ۔ کوئی مسخرا نظر آتا تھا۔ یہ سب گہرائے ہوسے آئے تھے کیونکہ ایک ولایتی دلاور اُن کے پیچھے پیچھے شمشیر پہنہ کلیم کئے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں پھٹتی تھیں۔ مغل روئی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا۔ اور اسپر بخارانی زیرِ پاں تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اُسے دیکھتے ہی

سب نے کہا کہ ”مکالو ان کا یہاں کچھ کام نہیں“ چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نامور شاہ تھا جس نے سرحدِ روم سے بخارا تک فتح کر کے تاجِ ہندوستان سر پہ رکھا تھا اُسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی۔

نقصِ بڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں کوئی مرتعِ بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گھڑستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ انھیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے۔ اور وجہ کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا۔ اُس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے۔ کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاقِ زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا وہ میرزا رفیع سودا تھے۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے۔ اور منہ پھر لیتے تھے۔ ورو کی آواز درونِ دل دنیا کی بے نقالی سے ہی بزار کئے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا ہیروپ دکھاتے تھے دم میں عالمِ ذی وقار۔ متقی پرہیزگار۔ دم میں داڑھی چٹ۔ بھنگ کا سونٹا کندھے پر۔

جراثیم کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان لگاتا تھا۔ تو سب کے سر بل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گلابی

چشم آشنا معلوم ہوتی تھی۔ اور اکثر جگہ قلمکاری اس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی اسے جلانے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے۔ مگر جب کچھ کہتے تھے۔ جرأت کی طرہ دیکھتے جاتے تھے۔ ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس۔ جامہ پہنے کھڑکی دار بگڑی باندھے۔ جریب ٹپکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے ہائیکے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ ہائیکے صاحب ضرور ان کے دست و گریباں ہو جاتے۔ لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بٹھے میرامن دہلوی۔ چار دردیش کے مصنف تھے۔ اور ہائیکے صاحب میرزا سرور منانہ عجائب والے تھے۔ فوق کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار ہلک گیا۔ آنکھوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سووانے اٹھکر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے۔ پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے۔ اور ایک نقارہ اس زور سے بجا یا۔ کہ سب کے کان گنگ کر رہ گئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے۔ اور بس اتنے میں آواز آئی۔ کہ تم آؤ کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی۔ کہ شاید اس جگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر وہیں سے پھر کوئی بولا۔ کہ آؤ جن لوگوں میں بیٹھا دو گئے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا۔ کہ اُس کی قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ اُسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہئے۔ اس مقدمے پر قبل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا۔ کہ نقاب

چہرے سے اُلٹ کر آگے پڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہوم یعنی  
فرشتہ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور پیچھے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں ہے  
اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھکڑے کو بھی بھول گیا۔ اور خدا کا  
شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی۔ فردوں سے ذمہوں میں تو آیا

## شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ دہلوی

پیدائش دہلی ۱۸۳۲ء وفات دہلی ۱۹۱۷ء

آپ یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی کوچہ پلائی بیکم میں پیدا ہوئے۔  
دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۸۵۷ء میں آپ کی ملازمت کا سلسلہ شروع  
ہوا۔ قریب تک حیثیت تعلیم میں مختلف عہدوں پر مرقراز رہے۔ آخر میں  
میور سنٹرل کالج الہ آباد کے پروفیسر رہے۔ وہیں سے ۷۳ سال ملازمت  
کے بعد ۱۸۸۸ء میں آپ نے پشور لی۔ ۲۴ سال پشور سے کرۃ برس کی عمر  
میں۔ ۱۸۸۸ء کو دہلی میں وفات پائی۔

اردو زبان کی جس قدر خدمت آپ نے کی ہے۔ کسی کو کم اُتنا موقع ملا ہوگا  
تمذیب الاخلاق السلطینوٹ گزٹ علیحدہ طور اور مختلف  
پرچوں میں آپ کے مضامین بجا بکھلتے رہے۔ آخر دم تک تصنیف اور  
تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ علوم ریاضیہ اور طبیعیات میں آپ کو  
خاص مہارت تھی۔ ان علوم کا ایک عمدہ ذخیرہ آپ نے اردو زبان میں  
جمع کر کے ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ جو محققین کی محنت سے باہر تھا۔  
حساب۔ جبر مقابلاہ اقلیدس۔ مساحت میں آپ کی ۸۲  
تصنیفات ہیں۔ جو چھپرہ شائع ہو چکیں۔ علم طبیعیات میں ۱۴ جغرافیہ  
میں ۳۰۔ تاریخ میں ایک کتب تاریخ ہندوستان کی ہے۔ دہلی تعلیم میں

www.  
Ratan

اور ایک صحت عمد انگلشیہ کی تاریخ ہے۔ ۵ جلدوں میں۔ ہندوؤں کے عمد کی تاریخ ہے۔ ایک جلد میں۔ یورپ کی تہذیب اور آئین قیصری وغیرہ علم اخلاق۔ اور اوپ میں ۲۲ کتابیں ہیں۔ اردو زبان میں ایسا شخص کم ہوگا جس کی مختلف علوم میں ۱۲۴ تصنیفیں ہیں۔ آپ کا طرز تحریر سادہ اور صاف ہے۔ اس میں زبانِ وِہلی کی خوبی اور ظرافت کا چٹخارا بھی موجود ہے۔

## سب چیزوں میں شانِ الہی نمایاں ہے

عالم باطنی ہی میں خلا جلوہ نما نہیں ہے۔ بلکہ وہ عالم ظاہری میں بھی نمود نما ہے آسمان میں بحرو بر میں مخلوق کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے۔ جس میں اس حکیم کارساز کی شان کی نشانیاں نہ موجود ہوں۔ اور اس واراے مخلوق کی قدرت و صنعت کی بے شمار شہادتیں نمایاں نہ ہوں۔ عجبہ اس مخلوق کو جو اجزاء کی ترکیب سے رعب ہوئی ہے خواہ اور انتظام و ترتیب عالم کو دیکھو۔ سب میں اسی کے ظہور کا جلوہ ہے۔ جیسے انسان کوئی چیز بنانا ہے تو اس میں صنایع کی قسم کا اندازہ ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے ہی انتظام و مصلح عالم سے جہاں آفریں کی حکمت و دانائی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے نفع دینے میں بھلے کام جو ہوتے ہیں۔ وہ فاعل کے حسن خلق کو ثابت کرتے ہیں۔ ایسے ہی دنیا میں انسان کے لئے خوش دلی کے ساز و سامان مہیا ہیں۔ وہ منعم حقیقی کسی ذات پر شہادت دیتے ہیں۔ جیسے کہ اس عالم میں قدرت و دانائی ارادہ کی نشانیاں ان گنت ہیں۔ ایسی ہی اس عالم آرا کی قدرت و حکمت و لطف و کرم ہے انتہا ہیں۔ فلک اور فضا سے آسانی ملی دیکھو۔ کہ صنائع بنائے اس

صانعِ حقیقی کے ہاتھ کے موجود ہیں۔ دن سے دن رات سے رات کہ رہی ہے۔ کہ چاند سورج ستارے اس فلکِ آفریں نے پیدا کئے ہیں۔ اور اُن کو اپنا محکوم بنایا ہے۔ اسرارِ عالم کے خزانوں کی کنجیاں اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں۔ اُس کے سوا کسی کو اُن کا حال معلوم نہیں۔ وہی جانتا ہے۔ کہ دن بھر و بریں کیا کیا بھرا پڑا ہے۔ وہ ایسا عظیم ہے۔ کہ اگر یہاں کوئی پتلا گرتا ہے۔ تو اُسے وہ جانتا ہے۔ وہ بجلی کو چمکاتا ہے پانی بھرے بادلوں کو لاتا ہے۔ وہ اُٹاڑوں کو پیدا کرتا ہے۔ آسمان و زمین کی پیدائش میں۔ رات دن کے بدلنے میں۔ آسمان سے پانی نیچے میں جس سے زمین سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ زمین اور آسمان کے درمیان ہوا اور بادل جو خدمت کرتے ہیں اُن کے بدلنے میں۔ ایسے آیاتِ ربانی ہیں۔ جن میں اگر غور کیجئے۔ تو اُس ذاتِ پاک کی عظمت و شان کو ظاہر کر رہی ہیں۔

خدا کے تعالیٰ ہی سب چیزوں کی جان ہے۔ وہی جنگلوں کو بنا ہوا کے تنہا نشین مونس و بناتا ہے۔ جس کو کوئی آنکھ نہیں دیکھتی۔ وہی لہلاتے کھیتوں کو پری پیکر بنا کر دلوں کو لبھاتا ہے۔ وہ سال کی تقسیم ایک ترتیب سے کرتا ہے۔ جاڑے کی ایک حد مقرر کرتا ہے۔ جس سے ابھر وہ قدم نہیں دھر سکتا۔ اُس کی تیزی کو کند کرتا ہے۔ اس موسم میں عجب حکمت سے بعض میوؤں کے نرم بیجوں کو اندر رکھتا ہے۔ کہ کوئی ضرر اُن کو باہر سے نہیں پہنچ سکتی۔ اور ایک موسم کے پھول کھلا رہ جائے۔ اور اُس نے دوسرے موسم کے پھول کھلائے۔ جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہی سارے عالم کا خداوند مالک ہے۔ وہی سب کچھ پیدا ہوا ہے۔ وہ سب جانداروں کی جان ہے۔ پھولوں میں دیکھو کہ



اُس معطر بے نظیر نے اپنی تفلکاری سے کیا کیا نقش و نگار بنائے ہیں۔  
 کیسی کیسی اُن کو خوشبوئیں عنایت کی ہیں۔ کیا کیا رنگ اُن میں پیدا کئے  
 ہیں۔ اُن کی آنکھوں کو ابرو کے پانی سے دھویا ہے۔ اُس نے ان دانوں  
 میں۔ کہ جن کی تعداد سمندر کے ریگستان کے ڈڑوں کی طرح بے شمار ہے۔  
 وہ صورتیں داخل کی ہیں۔ جو ساری زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔ کیا خوش  
 دل وہ شخص ہے۔ جو خدا کے ساتھ رہتا ہے۔ مردوں میں۔ خوشبوؤں  
 میں۔ میوؤں میں۔ پتھروں میں۔ اُسی کو وہ پاتا ہے۔ خلقت میں ایک  
 پیر کے درخت سے لیکر گھاس کے پتے تک جو دھوپ میں پڑا ہل رہا ہے۔  
 یاد رہی میں دیکھتا ہے۔

اگر گیا ہے کہ از نہیں زوید وحدۃ لا شریک لہ گوید

## گھر کی تربیت

گھر ہی میں آدمی اخلاق کی تعلیم پاتا ہے۔ بڑی خواہ نکلی۔ گھر ہی  
 میں آدمی چال چلن کے وہ اصول سیکھتا ہے۔ جو اُس کے ساتھ ساری  
 عمر رہتے ہیں۔ جوانی اور پیری میں وہ انہیں پر چلتا ہے۔ اس سے  
 معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی شخصیت کی بڑی تعلیم گاہ گھر ہے۔  
 مشہور ہے کہ اوضاع و اطوار آدمی میں آدمیت پیدا کرتے ہیں۔  
 یہ بھی کہتے ہیں کہ آدمی میں آدمیت اُس کا دماغ پیدا کرتا ہے۔ مگر ان  
 دونوں باتوں سے زیادہ سچ یہ بات ہے۔ کہ آدمی میں آدمیت گھر پیدا کرتا  
 ہے۔ گھر میں آدمی کا دل کشادہ زیادہ تر ہوتا ہے۔ وہ ساری عادتیں یہیں  
 پیدا کرتا ہے۔ وہیں اُس کی عقل پیدا ہوتی ہے۔ گھر ہی کی ٹھکانا میں

خصیات کے کھوٹے کھڑے سکے ڈھائے جاتے ہیں۔ گھر ہی سے وہ اصول و مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جو معاشرت انسانی پر حکومت کرتے ہیں۔ گھر ہی کی باتوں کا عکس قانون ہوتا ہے۔ بچوں کی وہی ننھی ننھی رائیں بڑے ہوئے پر جمہور نام کا دستور اہل بنتی ہیں۔

آدمی جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ نہایت ہی بے کس اور اور بے بس ہوتا ہے۔ اس کی کل پرورش و تربیت و تعلیم اُن آدمیوں کے فوٹے ہے جو اُس کے اُس پاس ہوئے ہیں۔ جس وقت کہ وہ سالن لینے لگتا ہے۔ اُس کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔

ابتداء میں بچے کی تعلیم اُس طرح ہوتی ہے۔ کہ وہ جو دیکھتا ہے اُس کی نقل اُتارتا ہے۔ عربی ضرب اشل ہے۔ کہ انچر کے درخت کو دیکھ کر بچہ کا درخت زیادہ کھل لاتا ہے۔ اور ہماری مثل ہے کہ خرگوش کو دیکھ کر خرگوشہ رنگ پکڑتا ہے۔ پس یہی بچوں کا حال ہے۔ کہ وہ مثال کی تقلید سے تعلیم پاتے ہیں۔ بڑی معلمہ مثال ہے۔ بچپن کی تعلیم آدمی کی نہایت کا معر ہوتا ہے۔ باقی اور تعلیم بالاسے پوست ہے۔ جس کے اندر وہ مغز ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک شاعر کا قول کیا ہی سچا ہے۔ کہ جس طرح صبح دن کو دکھاتی ہے۔ ایسے ہی بچہ آدمی کا حال بتلاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ بدھو نہار بروا کے چٹکے چٹکے پات۔ جو باتیں ولادت کے وقت ہماری طبیعت میں نفوذ کرتی ہیں۔ وہی دیر پا اور ہمارے چال چلن کی محرک ہوتی ہے۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ ایک نئے عالم کی چو کھٹ پر قدم رکھتا ہے۔ ہر چیز کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ چیزوں کو غور کی نظر سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اشیاء کا باہم مقابلہ کرتا ہے۔ اُن کے

تصویرات کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے۔ ایک فاضل نے لکھا ہے۔ کہ اٹھارہ اور پینچ مہینے کی عمر کے درمیان اس کو مادی اشیاء اپنے قوائے خواص جہاں اور اپنے اور دوسروں کی فہم کا اتنا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ کہ باقی ساری عمر میں اس قدر نہیں ہوتا۔ اس عمر میں علم کا خزانہ جو جمع ہوتا ہے۔ اور اس کے دماغ میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ضروری ہوتے ہیں۔ کہ اگر وہ کسی طرح ملیا میٹ ہو جائیں۔ تو پھر اس کو ایک ہفتہ جینا محال ہو جاتا ہے۔

یہ بچپن ہی کی کیفیت ہے۔ کہ ”دل لوح سادہ برائے ہر نقش آمادہ“ جو چھکاری اول اس میں پڑتی ہے۔ وہ اپنی روشنی دکھاتی ہے۔ خیالات جلد ذہن میں آ جاتے ہیں۔ اور دیر تک قائم رہتے ہیں۔ بچپن میں جو باتیں سمجھتی ہوتی ہیں۔ وہ اکثر اخیر عمر تک ساتھ رہتی ہیں۔ بچپن ہی میں شخصیت کی تعلیم کی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یعنی مزاج کی۔ ارادے کی۔ عادت کی۔ جن پر آئندہ ساری عمر کی خوش دلی بہت کچھ منحصر ہے۔ اگر کسی عالی دماغ حکیم کو روزانہ بے آرامیوں اور بد اخلاقیوں اور کینہ پن کی حالت میں بچھنسا دو۔ تو وہ خود بخود وحشی پن کی طرف کھینچا چلا جائے گا۔ پس جب عاقلوں کی یہ نوبت ہے۔ تو بچے کا کیا حال ہوگا۔ جو بیکس ہے۔ اور نوم کی طرح بہت آسانی سے نقش قبول کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔

جس گھر میں محبت کا اور ادب۔ حقوق شرافت کا شوق غالب ہے۔ جس میں دل و دماغ دونوں غافلانہ حکم چلائے ہیں۔ جس میں روز مرہ کے کاروبار زندگی میں دیانت دانستہ راستی موجود ہے۔ جس میں غافلانہ و شوقانہ انتظام موجود ہے۔ اس گھر میں یہ توقع ہو سکتی ہے۔ کہ اولاد تندرست و

خوشدل نفع رساں ایسی پیدا ہو۔ کہ جب اُس کو قوت اپنے مرہٹوں کے قہ  
بقدم چلنے کی حاصل ہو۔ تو وہ نیک دلی کے طریقوں پر چلے۔ اپنے نفس پر  
خفا لگے ہو۔ اور اپنے ہمسائے کے آدمیوں کی بہبودی اور رفاہ عام میں  
معاون ہو۔ بچے کی طبیعت کے ڈھالنے کے لئے سب سے عمدہ سانچہ نمونہ  
ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ میرے بچوں کی خصلتیں اچھی ہوں۔ تو اُن کے  
سامنے اپنی خصلت کے اچھے نمونے پیش کرے۔

ہر بچے کی آنکھوں کے سامنے جو نمونہ مشتمل طور پر رہتا ہے۔ وہ اُس کو  
ماں ہے۔ نمونہ معلوموں کے برابر ایک اچھی ماں ہوتی ہے۔ گھر میں وہ سارے  
دلوں اور ساری آنکھوں کی مقناطیس ہوتی ہے۔ اولاد ہمیشہ ماں کی پیروی  
ہوتی ہے۔ مثال امر سے ہر ہوتی ہے مثال تعلیم بالعل کو کہتے ہیں۔ ہر زبانی  
حکم کو۔ مثال اپنی بے زبانی سے جو تعلیم کرتی ہے۔ وہ زبانی اوامر نہیں کرتے  
مثال بد کے رو پر عمدہ اوامر بہت ہی کم فائدہ دیتے ہیں۔ مثال کی پیروی  
کی جاتی ہے۔ اوامر کی نہیں۔ جب امر بر خلاف عمل کے ہوگا۔ تو وہ بڑا بلا  
برائیاں سکھائے گا۔ بچے ہی اپنے ماں باپ کی اس بات کو سمجھ جاتے ہیں  
کہ وہ کہتے ہیں کچھ اور کرتے ہیں کچھ اور۔ اگر کوئی واعظ کسی کا مال مارے  
جیب میں رکھے۔ اور دیانت کا وعظ کرے۔ تو کچھ اثر نہ ہوگا۔ گھر عورت  
کی دارا سلطنت ہوتا ہے۔ اس میں سارے احکام اُس کے چلتے ہیں۔ وہ  
اپنے بچوں کی فحشی رعیت پر حکم مطلق نافذ کرتی ہے۔ ہر چیز کے لئے  
بچے اپنی آنکھوں کو اُس کی طرف لٹکائے رہتے ہیں۔ ہر وقت اُن کے دروازہ  
وہی مثال اور نمونہ ہے۔ جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔ اور نقل آراء ہیں  
کو اُس کا علم خود اُن کو نہوتا ہو۔ اس واسطے بچوں کی چال چلتی اور طور

طریقے پر ماں کا اثر بہ نسبت باپ کے زیادہ ہوتا ہے۔ گھر میں ماں کا نیک مثال ہونا ایک بڑی نعمت ہے۔

ابتداء سے عمر میں دل کے اندر چر خیالات جم جاتے ہیں۔ ان کا حال ایسا ہوتا ہے۔ جیسے کہ کسی چھوٹے پودے کی چھال پر حرون کندہ کر دئے جائیں۔ وہ درخت کے ساتھ بڑھتے چلے جائیں گے۔ گو وہ کیسے ہی یکے ہوں مگر شے کے نہیں۔ زمین پر بیج ڈالے جاتے ہیں۔ تو کچھ مدت تک وہ اس میں پڑے رہتے ہیں۔ پھر پھوٹتے ہیں۔ اور بڑھتے ہیں۔ کہ آخر کو وہی ہمارے عادات اور اعمال ہو جاتے ہیں۔

نسل انسانی کا ظاہری انتظام مہر مادی پر ہے۔ جس کا اثر ملام اور عالمگیر ہے۔ جب سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اور اُس کے ساتھ ہی ماں کی محبت کا اثر شروع ہوتا ہے۔ بچوں پر نیک ماؤں کا اثر عمر بھر رہتا ہے۔ جب اولاد دنیا کے کام و ہندوں جھگڑوں بکھڑوں۔ اور نزوات اور تفکرات میں پڑتی ہے۔ اور تکلیفات اور مشکلات پیش آتی ہیں۔ تو وہ صلاح و مشورے اور تسلی و تشفی کے لئے ماؤں ہی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ نسل مشہور ہے کہ مصیبت کے وقت ماں ہی یاد آتی ہے۔ ماں اپنے بچوں کے دلوں میں جو عمدہ اور پاکیزہ خیالات جما دیتی ہیں۔ وہی بڑے ہوئے پر نیک اعمال کی صورت میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔

عورت سب تعلیموں سے زیادہ نرمی اور ملائمت سے تعلیم کرتی ہے۔ مرد انسانیت کا دماغ ہے۔ عورت اُس کا دل ہے۔ وہ اُس کی آواز ہے۔ یہ اُس کا حسن و زیبہ و زینت ہے۔ مرد عقلی ہدایتیں کرتا ہے۔ مگر عورت قلب کی درستی کرتی ہے۔ جس سے خصلت سنورتی ہے۔ مرد حافظے کو بہتر

کرتا ہے۔ عورت دل کو پڑھ کر کرتی ہے۔ مرد جس بات کا یقین دلاتا ہے۔ عورت اُس کی محبت دلاتی ہے۔ غرض عورت کی بدولت اکثر ہماری رسائی نیکی پر ہوتی ہے۔

اگر کوئی عورت نیک اطوار۔ کفایت شعار۔ خوش مزاج۔ پاکیزہ طبیعت کسی گھر کی سرپرست ہو۔ تو سارے گھنے کی زندگی بخیر و عافیت بسر ہوگی۔ اور وہاں آرام و چین۔ نیکی اور خوش دلی۔ طح طرح سے اپنے جلوے دکھائیگی اور وہاں مرد کے لئے بہت سے ہمراہی دل کے خوش کرنے والے موجود ہونگے دلوں کے لئے عبادت گاہ وہاں تیار ہے۔ حادثات زمانہ سے بچنے کے لئے ہاں وہ ہے۔ محنت و مشقت کے بعد آرام گاہ ہے۔ مصیبت و اخلاص میں تسلی و تشفی وہاں ہے۔ غرض ہر درد کی دوا وہاں موجود ہے۔ اور ہر وقت خوشی اور راحت کا سامان مہیا ہے۔

بچوں اور بیٹوں کی تربیت اخلاق میں گھر جیسا سب مدرسوں سے بہتر ہے۔ ویسا ہی بڑے بھی ہو سکتا ہے۔ گھر میں اُس قوت کا ہونا بھی ممکن ہے۔ جو بچپن سے لے کر دم آخر تک بے حد شرات اور جمالت پیدا کرتی ہے ماؤں اور دایوں کی نالائقی سے کیا کیا اخلاقی آفات اور امراض ظہور میں آتے ہیں۔ بچے کو ایسا یا جی جاہل دایہ کے حوالہ کر دو۔ تو بچے میں وہ عیب پھیلے ہوگا۔ جو ساری عمر کی تنقید و تربیت سے دور نہ ہوگا۔ جس گھر میں ماں شریہ کاہل۔ نابکار ہو۔ گھر بچپن نکال دیتی ہو۔ جھنجھلائی ہو۔ رنج پھیلائی ہو وہ گھر جہنم ہے۔ جس سے بھاگنے کو دل چاہتا ہے۔ جن بچوں کی بد نصیبی سے ایسے گھروں میں پرورش ہوئی ہے۔ وہ اخلاق کی رُو سے پونے اور بے ڈول ہونگے۔ وہ نہ اپنے لئے اچھے ہونگے نہ انوروں کے لئے بلکہ سب کے واسطے

پڑے ہوں گے۔

مردوں کی فحشلت بنانے میں عورتیں جو اثر کرتی ہیں۔ گو نوشت خواند میں نہ آئے۔ مگر وہ اُن کے بعد باقی رہتا ہے۔ اور ہمیشہ اپنے نتائج خیر کو جاری رکھتا ہے۔ عورتوں نے نہ تو بڑھ بڑھ کے تصویریں بنائیں۔ نہ بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔ نہ انجرا ایجاد کیا۔ نہ دوربین اور دُخانی کلیں اختراع کئے ہیں بلکہ صاف باطن و نیک صفات اہل دل موجودوں کو اپنی گود میں تعلیم و تربیت کیا ہے۔ اس سے بہتر کیا ایجاد دنیا میں ہو سکتا ہے اگر عورت اور مردوں کی حوصلوں کا فیصلہ اس لحاظ سے کیا جائے۔ کہ کس نے زیادہ بھلائی دُنیا میں پھیلائی تو عورتوں کی ترجیح رہے گی۔

عورتوں پر لازم ہے۔ کہ وہ سلیقہ مندی کی عادت پیدا کریں۔ جس سے وہ دُنیا کے روزانہ کاموں میں مؤثر۔ مددگار۔ معاون ہوں عورتیں ہی بچوں کو دودھ پلائے دلی۔ پرورش کرنے والی۔ تعلیم کرنے والی ہوتی ہیں۔ ماؤں کی فقط محبت طبعی کافی نہیں۔ عقل حیوانی شکل جو انات کو قائم رکھتی ہے۔ کیونکہ اس کو ضرورت تربیت و تعلیم کی نہیں ہوتی لیکن عقل انسانی کی ضرورت ہمیشہ کھینے میں رہتی ہے۔ تعلیم کی محتاج ہے۔ چھلارے لٹھالے نے عورتوں کو ایک خاص فطرت جسمانی عطا کی ہے لیکن اس کے ساتھ فطرت عقلی اور فطرت اخلاقی بھی سکونت پذیر ہے۔ پس عورتوں کو سب سے پہلے یہ سمجھنا ضرور ہے۔ کہ صحت جسمانی و صحت عقلی و صحت اخلاقی جو جب قوانین فطرت گھر میں کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ آدمی کے ایک تہائی بچے پانچ سال کی عمر کے اندر مر جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ مائیں قوانین فطرت سے آگاہ نہیں ہوتیں۔ وہ جسم کی ترکیب سے

بے خبر ہیں۔ تازی پڑا۔ اور صاف پانی کے فوائد سے ناواقف ہیں زورِ مضہم  
 خدا کے چٹا کر کے اور بنائے کو نہیں سمجھتیں۔ یہ کہنا بالکل بیج ہے۔ کہ  
 عورتوں کو مردوں جیسی عقل اس لئے دی گئی ہے۔ کہ وہ کام میں لائی  
 جائے نہ یہ کہ کچھ رکھ کر سڑائی جائے۔ یہ عطیات بغیر کسی مطلب اور  
 مقصد کے نہیں عطا ہوئے۔

عورت اس لئے نہیں بنائی گئی ہے۔ کہ وہ بے عقل اور ناقص رہ کر  
 مرد کی خدمت یا مرد داری کرے۔ یا ایک سماتا کھلوتا بن کر وقتِ فرصت  
 اس کا دل خوش کرے۔ اس کے لئے ایسے تارک جوابدہی کے قرار دیے ہیں  
 کہ جن کے لئے دماغِ تعلیم یافتہ اور دلِ شفقت اگیڑ چاہئے۔ عورتوں  
 کی تعلیم کے باب میں ہمیشہ سے اختلاف رائے چلا آتا ہے۔ ایک طرف  
 نہایت تنگدلی سے یہ رائے نامشغول یہودہ کج روی جاتی ہے۔ کہ عورتوں  
 کو عظیم کمسٹری کا اتنا آنا کافی ہے کہ وہ ہندیاں پچالیں۔ اور علمِ جبرنیہ  
 اتنا بہت ہے۔ کہ وہ اپنے گھر کے کمرے کو جانتی ہو۔ بڑا کتب خانہ  
 ان کے لئے یہ ہے کہ ایک کتاب مقدس ان کے پاس ہو۔ دوسری طرف  
 اس کے مخالف وہ رائے ہے۔ جس میں مبالغہ۔ لغو۔ فضول۔ فطرت کی  
 مخالفت موجود ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے۔ کہ تعلیم میں عورت اور مرد  
 دونوں ہم پلہ ہوں۔ حقوق میں اور رائے دینے میں دونوں برابر ہوں۔  
 منصب و جاہ و دولت و حکومت کے لئے جو خود غرضی کی جڑ اور خطرے  
 کا گھر ہیں۔ دونوں مساوی سمجھے جائیں۔ فقط عورت ہونے کی وجہ سے  
 کسی جاہ و منصب سے محرومی نہ ہو۔

ابتداءے عمر میں جو تعلیم و تادیب نہایت مناسب لڑکوں کے واسطے



ہے۔ وہی لڑکیوں کے لئے ہے۔ تربیت و تعلیم کی استعداد جیسی مردوں میں ہے ویسی ہی عورتوں میں ہے۔ مردوں کے اعلیٰ درجے کی تعلیم کے حق میں جو دلائل متین اور براہین عظیم بیان کئے جاتے ہیں۔ وہی عورتوں کے اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لئے نہایت متانت سے وکالت کر رہے ہیں بھر کے تمام کارخانوں میں عقل مند عورتوں کی بکار آمد اور موثر ہونے کو زیادہ کروے گی۔ یہ عقل مند عورتوں میں تفکر اور مال اندیشی پیدا کرے گی۔ وہ پہلے سے ان کو سمجھا دے گی۔ کہ زندگی کی ضروریات کیا ہیں اور وہ کیونکر ہم پہنچ سکتی ہیں۔ غرض ہر طرح سے ان کی تقویت کا سبب ہوگی۔ ان کی قوائے عقلیہ کی تادیب سے یہ فائدہ حاصل ہوگا۔ کہ وہ جیسے اپنے بچوں پر اور جہالت سے دُعا اور فریب اور توہمات کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ نہ پھنسیں گی۔ اور اخلاقی اور مذہبی تربیت ان کا اختیار پڑھاؤں گی۔ اور ان میں وہ سچی خود اعتمادی اور قرائن پروری پیدا کرے گی۔ جو خانہ داری کے چین و آرام اور خوش دلی کا سرچشمہ ہے۔

مردوں کے اخلاقی اور دماغ کا صحیح رہنا عورتوں پر موقوف ہے۔ اس لئے عورتوں کی تعلیم ایک قومی اور منہم باشندہ امر سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں کی پاکیزگی اخلاقی اور عقلی تربیت مردوں کی اخلاقی صحت اور عقلی قوت کی بڑی ملاوٹ و مادی ہیں۔ جیسے یہ دونوں مل کر اپنے قومی کو کامل طور پر ظاہر کریں گے۔ دیباہی قوم کا انتظام زیادہ عمدہ ہوگا۔ اور اس کی برتری اور اقبال مندی یقینی ہوگی۔

# شمس العلماء مولانا حافظ تذیر احمد دہلوی

پیدائش نگینہ ضلع بجنور ۱۸۳۴ء وفات دہلی ۱۹۱۶ء

۶ دسمبر ۱۸۳۴ء روزہ شنبہ کو نواح تحصیل نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے اپنے والد مولوی سعادت علی کے ہمراہ خاص شہر بجنور میں رہتے تھے۔ مگر سن تیز کو پہنچنے کے بعد سے برابر دہلی ہی میں رہے۔

آپ نے فارسی کتابیں اپنے والد ہی سے پڑھیں۔ عربی کی ابتدائی کتابیں مولوی نصر اللہ خاں سے اُس کے بعد مولوی عبدالخالق صاحب سے پڑھیں۔ جوڑی ششماہ میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ کالج نمکور سے نکلنے کے بعد ابتدائے آپ ضلع بجات کے ایک اسکول میں لکچر ماہوار پر ملازم ہوئے ششماہ میں دو برس کے بعد وہ ملازمت ترک کر کے کانپور کے ڈپٹی انکمپٹر مارس میں مشاہدہ پر مقرر ہوئے۔ ششماہ کے بعد آپ الہ آباد کے ڈپٹی انکمپٹر مارس مقرر ہوئے۔ عہدہ خاں میں عدالت کے مکان پر آپ کا قیام تھا۔ انجینئر کی تحریک سے آپ نے انگریزی شروع کر دی۔ اور اُس کو بقدر ضرورت خوب حاصل کر لیا۔ جیلر گیارہ میں جا کر آپ نے تلمذ کی سیکھی پرانہ سالی میں دہلی میں آپ نے مسکرت

پڑھی۔ آپ نے گورنمنٹ کے حکم سے اکھٹس اور تعزیرات ہند کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا۔ اس صلف میں آپ کو ششماہ میں کانپور کی تحصیلدار علی اُن کے بعد آپ نے ضما بطم جو جداری و قانون شہادت کا ترجمہ کیا۔ اس صلف میں ششماہ میں کانپور ہی میں آپ ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ وہاں سے گورنمنٹ کے حوالوں۔ اعظم کتبہ وغیرہ تبدیل

ہوتے رہے۔

نواب محسن الملک اور نواب عمار الملک مولوی سید حسن صاحب بلگرامی کی تحریک سے سر سالار جنگ نے ستمبر ۱۸۵۷ء میں آپ کو حیدر آباد میں طلب کیا۔ وہاں ایک ہزار تنخواہ دوسو چالیس بجٹ پر ایک بڑے عمدہ سے سر فراز ہوئے۔ وہاں کا کام نہایت بخوبی سے انجام دے کر سکندر شاہ ہوئے۔ دہلی میں آکر خانہ نشین ہوئے ۲۸ اپریل روز جمعہ ۱۲ ربیع الثانی کو بھارت کو انتقال ہوا۔

آپ نے اردو زبان کو بہت بڑی مدد پہنچائی۔ آخر وقت تک تالیف و تصنیف سے آپ کا قلم نہیں رکا۔ منتخب الحکایات - چند بند - توبہ المنصوح - مرآة العروس - بنات النعش - ابن الوقت - محسنات - رویا کے صاوتہ - الحقوق والعصران - ترجمہ القرآن - موعظتہ حسنہ - اور بہت سی کتابیں اور لکچر آپس میں آپ کی یادگار ہیں۔

آپ کی تحریر میں سادگی ہے۔ مثال و محاورات کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ عربی زبان سے آپ کو ایک خاص اہلیت تھی۔ اس لئے آپ کی اردو میں بھی عربی زبان کے الفاظ اور فقرے - اشعار - احادیث - آیات قرآنی کا استعمال زیادہ ہے۔ آپ کی کتابیں لکھنے کی پاکیزہ اور شہسہ اردو کا عمدہ نمونہ ہیں۔

## انگریزوں کی عظمت کی اصلی وجہ

انگریزوں کی عظمت کا سبب اور ہندوستانیوں کی ترقی کرنے کے طریقہ کی بابت نوبل صاحب نے سر سید سے جو اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ انگریزوں کا

عظمت کی اصلی وجہ تجارت اور صنعت میں ترقی کرنا ہے۔ نہ کہ سلطنت۔ اور  
ہندوستانی جب تک انگریزی زبان سیکھ کر علوم جدیدہ کو حاصل کر کے صنعت  
و تجارت کے جانب متوجہ نہ ہوں گے۔ اور انگریزوں سے میل جول نہ پیدا  
کریں گے۔ ترقی نہیں کر سکتے، وہ مضمون غمیں اعلیٰ مولوی حافظ منیر احمد  
صاحب دہلوی کی کتاب ابن الوقت سے منتخب کیا گیا۔

اہل یورپ کی عظمت سلطنت میں نہیں ہے۔ بلکہ تمام عظمت ان علوم  
میں ہے۔ جو جدید ایجاد ہوئے ہیں۔ اور ہوتے جاتے ہیں۔ اور جن علوم کے  
ذریعہ سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیم اور ہزار ہا قسم کی بیکارگر  
مکین بنائی ہیں۔ اور بناتے چلے جاتے ہیں۔ اور ہر طرح کی کاریگری میں  
دوسرے ملک کے لوگوں پر سبقت لیا کر روئے زمین کی دولت  
انہیں ملک میں گھسیٹ لے گئے۔ اور گھسیٹ لے جا رہے ہیں۔ جن جس طرح  
کے ہنر اور کمالی اہل یورپ میں ہیں۔ ان کے ہوتے ممکن نہ تھا۔ کہ ان کو  
سلطنت نہ ہو۔ سلطنت ان کے کمالات کی قیمت نہیں ہے۔ بلکہ روکھن میں  
ہے۔ اور ان کا حق لازمی ہے۔ سلطنت سے انگریزوں کو اگر کچھ مفاد ہے۔  
تو یہی۔ کہ ان کے ملک کے چند آدمی یہاں آکر لوکری کرتے اور تنخواہ  
پاتے ہیں۔ اس سے بھی ہکو انکار نہیں کہ ہندوستانیوں کے مقابلے میں  
انگریزوں کو بڑی تنخواہ ملتی ہے۔ اور کیوں نہ ملے۔ ان کے سفر دور دراز کو  
دیکھو اختلاف آپ و ہوا کی وجہ سے ان کی جان جو کھم پر نظر کرو۔ ان کی  
اچھی شان و آبرو کثیر انصاف طرز زندگی اور ساتھ ان کی دیانت داری کا بھی  
خیال کرو۔ تو معلوم ہو کہ انگریزوں کی تنخواہیں بوجہ بڑی ہیں۔ یا یہ  
نا واجب۔ یہ بھی انگریزوں ہی کے جگر ہیں کہ ان تنخواہوں پر کیسے کیسے سخت

امتحان دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ بات ان کے اصول زندگی میں داخل ہے۔ کہ ہر انسان کو اپنی توثیق بازو سے کمائی کرنی چاہئے۔ جب کہ خاندان شاہی میں کوئی شخص اس کلیئے سے مستثنیٰ نہیں۔ اور خود ملکہ معظمہ کے پوتے قاعدہ کے مطابق چھوٹے چھوٹے عہدوں سے نوکری شروع کرتے ہیں۔ تو دوسرے کس گنتی میں ہیں۔ یہی تنخواہیں اور یہی امتحان۔ اور یہی پردیس۔ اور یہی اختلاف آب و ہوا۔ اور یہی حالات تمام ہندوستانیوں کے ہوں۔ تو شاید گھر سے نکلنے کا نام نہ لیں۔ ولایت تو ولایت آج کسی کو باہر جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ تو سارے گھر میں ڈونا پٹینا جچ جاتا ہے۔ اپنی ہمت کا تو یہ حال :- اور انگریزوں کی تنخواہوں پر حسد :- بہر کیفیت یہی سہی کہ جتنے انگریز ہندوستان میں نوکر ہیں۔ جتنے کہ گورنر۔ سب کے سب یہاں کی تنخواہیں پاپاکر آسودہ حال ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان محدودے چند کے تمثیل سے اس ملک کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ جس میں سے ان سے دو چہد سہ چہد ہر سال جزائر دور دست میں جا کر سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ صرف اس وجہ سے کہ علم طب اور صفائی میں جو بہت ترقی ہوئی ہے۔ تو عموماً کا اوسط بڑھ گیا ہے۔ بیماری اور موت میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ تو اہل تناسل کثرت سے ہوتا ہے۔ ملک کی وسعت اس قدر کثیر التعداد باشندوں کو کافی نہیں۔ اور اہل یورپ کے تمثیل کا اندازہ کسی قدر آپ اس بات سے کر سکیں گے۔ کہ وہاں دو روپیہ روز کی آمدنی کا آدمی سوسائٹی میں اس سے زیادہ وقت نہیں رکھتا۔ جیسے یہاں ڈیڑھ دو آنے روز کا مزدور۔ اور دس ہزار روپیہ سالانہ کہ یہ سولین کی پیش کی مقدار غایت ہے۔ سواری اور اپنے ذاتی ملازم رکھنے کے لئے مشکل سے کفایت کر سکتا ہے۔ تو موٹی

سے موٹی سمجھ کا آدمی بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ کہ سلطنت کی وجہ سے یورپ میں یہ کچھ دولت بھٹ پڑی ہے۔ اصلی بات یہ ہے۔ کہ خدا کو اہل یورپ کی ترقی۔ اُن کی فلاح منظور تھی۔ کہ ملک کے ملک کو واقعات نفس الامری اور موجودات خارجی میں غور کرنے کی ڈھن لگا دی۔ اس غور سے سیکڑوں ہزاروں نئے نئے اصول دریافت ہوئے۔ جن پر عمل کرنے سے انسان کی قدرت اس قدر بڑھ گئی کہ کچھ اتہا نہیں۔

غرض یورپ کی دولت مندی کے اصل نئے سسٹم (بھاپ) اور الیکٹریٹی (قوت برقی) وغیرہ یعنی ان کے علوم جدیدہ ہیں۔ ہالوے کا تو نام آپ نے سنا ہوگا۔ اس شخص کے یہاں مرہم اور گولیوں کا کارخانہ ہے۔ مگر اسکی آمدنی کو آپ اس پر قیاس کر سکتے ہیں۔ کہ چار لاکھ روپیہ سالانہ تو صرف اُمیرتِ اشتهار کا خرچ ہے۔ اور پھر کچھ بڑے کارخانوں میں اس کا شمار نہیں۔ ولایت جاکر دیکھیے۔ تو معلوم ہو۔ کہ تجارت کے مقابلے میں سلطنت ایک محض بے حقیقت چیز ہے۔ اگر تاجروں کے نمونے کا حال میں آپ سے بیان کروں۔ تو آپ مبالغہ سمجھیں۔ پھر ہماری ولایت میں کوئی سیر حال ملک نہیں۔ پیداوار اور معدنیات کے اعتبار سے یورپ کسی طرح ہندوستان سے لگا نہیں کھا سکتا۔ مگر چونکہ ہندوستان کے لوگ نئے علوم سے ناواقف ہیں۔ خدا داد سرمائے سے فائدہ اٹھانے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ ہندوستانیوں کی بدقسمتی اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی کہ مثلاً روئی ہندوستان سے ولایت جاتی ہے۔ اور وہ لوگ اپنی ہنرمندی سے اس روئی کے انواع و اقسام کے کپڑے بنا کر پھر ہندوستانیوں کے ہاتھ چند در چند نفع پر فروخت کرتے ہیں۔

پس ہندوستانوں کے پنچنے کی اگر کوئی مدد پر ہے۔ تو یہی۔ کہ ان میں علوم جدیدہ کو پھیلایا جائے۔ اور ان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنی تمام قوت عقلی واقعات میں صرف کریں۔ یہاں کے لوگ بالطبع ذہین ہوتے ہیں۔ اور مصطلحاتیں لاطینی شروع کریں۔ اور اس کا ان کو چسکا پرٹ جائے تو بس ساری شکایتیں رفع ہیں۔ اور اس لیے کہ تمام علوم جدیدہ جن پر ملکی ترقی کا انحصار ہے۔ انگریزی میں ہیں۔ سب سے پہلے زبان انگریزی کو رواج دینا ہوگا۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے۔ کہ علوم جدیدہ کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی جائیں۔ مگر میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ اول تو زبان اردو میں اتنی وسعت نہیں۔ کہ علوم جدیدہ کی تمام مصطلحات کا اردو ترجمہ ہوسکے۔ ناچار اکثر مصطلحات انگریزی کو اختیار کرنا پڑے گا اور ان کے تلفظ میں ضرور غلطیاں ہوں گی۔ میں نے اس طرح کی بعض جڑی اور بعض کیمیا اور بوٹینی (علم فلاحہ) کی کتابیں دیکھی ہیں۔ کوئی سطر انگریزی الفاظ سے خالی نہیں۔ یہ ترجمے اردو انگریزی مخلوط آدھا آدھا ہیں۔ آدھا ہٹیر۔ مجھ کو تو سخت بد مزہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر کسی زبان کے ایک لفظ کی دوسری زبان میں کیسی ہی ہندی کی چندی کیوں نہ کرو۔ اس کا ٹھیک مفہوم دوسری زبان میں ادا ہونا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان کے رواج دینے سے ایک علوم جدیدہ کا پھیلانا ہے۔ اور دوسری غرض اور بھی ہے۔ یعنی عموماً انگریزی خیالات کا پھیلانا۔ اکیلے علوم جدیدہ سے کام چلنے والا نہیں۔ جب تک خیالات میں آزادی۔ ارادے میں استقلال۔ حوصلے میں وسعت ہمت میں علو۔ دل میں فیاضی۔ اور ہمدردی۔ بات میں سچائی۔ معاملات میں راستبازی۔ یعنی انسان پورا پورا

جنگل میں نہ ہو۔ اور وہ بدول انگریزی جاننے کے ہو نہیں سکتا! انگریزی  
 وال آدمی کو اخباروں اور کتابوں کے ذریعے سے انگریزی خیالات پر  
 آگے بہم پہنچانے کی بڑی آسانی ہو سکتی ہے۔

## مذہب اور عقل

یعنی عقل ایک ایسی محدود قوت ہے جس کی پوری پوری رسائی دنیاوی ہو  
 میں تو ہو نہیں سکتی۔ مذہب جس کو دوسرے عالم سے بھی تعلق ہے۔ اس میں اس کی  
 رسائی کیونکر ہو سکتی ہے۔ لہذا مذہب کو محکم عقل بنانا سخت غلطی ہے۔

بلاشبہ مبداء قیام نے انسان کو ظاہری اور باطنی جتنی توانائیاں دی  
 ہیں۔ سب میں عقل بڑی زبردست ہے۔ اور وہی مدار تکلیف شرع بھی  
 ہے۔ لیکن پیش برس نیست۔ کہ عقل بھی ایک قوت ہے۔ اور جس طرح انسان  
 کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں۔ اسی طرح عقل بھی محدود اور  
 ناقص ہے۔ مثلاً آنکھ کہ خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے۔ اس سے باہر نہیں  
 پھرے روشنی کے کام نہیں دیتی۔ اجسام کشین میں نفوذ نہیں کرتی۔ اگر  
 دیکھنے والا متحرک ہو مثلاً فرض کرو کہ کشتی یا ریل میں ہو تو وہ اُلٹا  
 ٹھہری ہوئی چیزوں کو متحرک دیکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں ٹھہرا ہوا۔ تیز  
 حرکت مشکمل معلوم ہوتی ہے۔ جیسے لڑکے لکڑی سے پھیلے ہیں۔ پیالے میں  
 ٹھوڑا سا پانی بھر کہ لکڑی کھڑی کریں۔ تو پکلی ہوئی دکھائی دیتی شفاف  
 پانی کی طرح چیزیں اوپر کو ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اسی طرح کی اور  
 بہت سے غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود  
 ہے۔ غرض جس طرح مثلاً ہماری قوتِ باصرہ محدود اور ناقص ہے۔



اسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے۔ وہ بھی نقصان سے بڑی نہیں  
 اور اس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی کے لئے اختلاف رائے کی دلیل  
 کافی ہے۔ ہندسہ کے علاوہ جس کے اصول بدیہیات پر مبنی ہیں۔ (اور  
 اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہو نہیں سکتا، ڈاکٹر فلسفی بیچ ہیئت وال  
 مرتبان ٹیک۔ اہل مذہب۔ وغیرہ وغیرہ سبھی کو دیکھتے ہیں۔ کہ ایک  
 دوسرے سے لڑتے مڑتے ہیں۔ منطق کے قاعدے مضبوط ہونے میں نظریے  
 کے اصول ٹھہرائے گئے مگر اختلاف نہ کم ہوا۔ اور نہ تا قیامت کم ہو۔  
 جب بہت و نیت کا اختلاف ہو۔ تو ضرور ایک برسرِ قلعہ ہے۔ اگرچہ  
 عقل انسانی کا نقصان اختلاف رائے سے بھی مستثبط ہو سکتا ہے۔ مگر ہم  
 دوسرا اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ڈو ڈھائی سو برس  
 کے عرصے میں اہل یورپ کو سیکڑوں باتیں ایسی دریافت ہوئیں۔ کہ کسی  
 کو کیمیا کا حکمی نسخہ مل گیا ہوتا۔ اور وہ اس کو عام بھی کر دیتا تو  
 اتنا فائدہ نہ پہنچتا۔ جتنا کہ ان ماڈرن ڈسکوریز یعنی زمانہ حال  
 کی دریافتوں سے ہوا۔ اور جن اقبالوں کو خدا نے واقعات اور موجودات  
 نفس الامری میں غور و خوض کرنے کی دھن بگا دی ہے۔ خدا ان کی  
 کوششوں کو مشکور و کامیاب کرتا ہے۔ بحرِ بے پایاں موجودات میں  
 غوطے لگا رہے ہیں۔ اور معلوماتِ جدیدہ کے بے پناہ موتی ہیں۔ کہ ہمارے  
 مکے چلے آئے ہیں۔ ان ماڈرن ڈسکوریز میں سے زیادہ نہیں صرف ایک  
 چیز عام فہم لو۔ جس سے انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اٹھا رہے  
 ہیں۔ ریل۔ آب ہم پوچھتے ہیں کہ دنیا میں گھر گھر آگ تھی۔ مگر گھر بندیاں  
 پہنی تھیں۔ ہر ہر شخص بھاپ سے بخوبی واقف تھا۔ سیکڑوں ہزاروں

برس پہلے سٹیٹم (جواب) کی طاقت کیوں معلوم نہیں ہوتی۔ اور یہی سوال ہر ڈسکورس کی بابت ہو سکتا ہے۔ جواب ہمک ہوتی۔ یا آئینہ کسی وقت میں ہو۔

سہرا آج پتوں میں جس کو سب سے پہلے مسئلہ کشش کا اہام ہوا کہتا تھا۔ کہ خدا کی ہے اتنا قدرت کے سمندر میں بے شمار ہوتی پھرے پڑے ہیں۔ اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوں، پتوں کی طرح سیلیاں اور ٹھونڈے جمع کر رہا ہوں۔ یہ مقولہ تھا۔ اس شخص کا۔ جس سے زمین اور آسمان کے قلابے ماکر نظام لپٹا ہوں کی جگہ اپنا نظام قائم کیا اور آج سارا یورپ اس کے نام پر فخر کر رہا ہے۔

جس کو خدا نے عقل دی ہے وہ تو یوں اپنی عقل کی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ایک ہمارے زمانے کے انگریزی خواں ہیں۔ کہ سیدھی سی اقلیدس کی مٹی ٹکلی پوچھو۔ تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ اور لہجہ عزائم یہ کہ بھجوا دیکرے نیست۔ پس جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ عقل انسانی کا تصور ہے۔ کہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ اب سے زیادہ نہیں۔ صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کسی کی عقل میں یہ بات آ سکتی تھی کہ مہینوں کی مسافت ہم گھنٹوں میں طے کر سکیں گے۔ یا ہزار ہا کوس کا حال چند لمحوں میں معلوم کر لیا کریں گے۔ یا آگ سے برف جمائیں گے۔ یا کپڑے کی کل میں کپاس بھر کر اچھے خاصے دھلے دھلائے تہ کئے ہوئے تھان نکال لیا کریں گے۔ اور ابھی کیا معلوم کہ ہم کیا کیا کر سکیں گے۔ مگر پھر بھی رہیں گے آدمی عاجز۔ تاجز۔ بے حقیقت۔ چھل آدمی کیا عقل پر ناز کرے گا۔ جب کہ اس کو پاس کے پاس اتنا تو معلوم ہی نہیں۔

کہ روح کیا چیز ہے۔ اور اس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہے۔  
 وقت کے انہی۔ ابدی ہونے پر خیال کرتے ہیں۔ تو انسان کی مٹی  
 ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے۔ جیسے دن رات میں ایک طرفۃً اٹھیں بلکہ  
 اس سے بھی کم۔ اور اس ہستی پر انسان کے یہ ارادے اور یہ حوصلے۔ کہ  
 گویا زمین اور آسمان میں سمانا نہیں چاہتا۔ پھر کیسے کیسے لوگ ہو گزرے  
 ہیں۔ کہ اس سرے سے اس سرے تک سناری زمین کو ہلا مارا۔ اور مر گئے  
 تو کچھ بھی نہیں ایک تودہ خاک! آخر وہ کیا چیز تھی جو ان میں سے نکل  
 گئی؟ حیوانات نباتات لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکر سا بندھا  
 ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین سے پیدا ہوتے۔ اور پھر اسی میں فنا ہو جاتے  
 ہیں۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کس غرض سے  
 ہو رہا ہے؟ جان تو ایک قسم کی نباتات میں بھی ہے مگر جانوروں کے  
 بہت سے افعال انسان سے ملتے ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض حیوانات بعض باتوں  
 میں انسان پر بھی شرف رکھتے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں۔ تو ان کے تمام  
 کمالات وہی اور فطری ہیں۔ پھر وہ کون سی تکمیل ہے جس کے لئے  
 ان کو یہ مٹی دی گئی؟

انگریزوں نے تحقیقات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ شروع سے  
 اب تک کسی ایک جگہ۔ یا کسی ایک چیز۔ یا کسی ایک بات کا مسلسل پتہ  
 نہ چل سکا۔ زمانہ حال سے جس قدر پیچھے کو دور ہوتے جاتے ہیں۔ منظر تاریک  
 و سہلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اب سے چار پانچ ہزار برس پہلے کا کسی کو  
 کچھ حال ہی نہیں معلوم کہ دنیا کا کیا رنگ تھا؟۔ عقل انسانی کی  
 نارسائی اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی کہ آج تک کسی پر کسی چیز کی ماہیت

ہی شکست نہیں ہوتی۔ جانا تو کیا جانا و اعراض۔ وہ بھی شاید فی حدود مثلاً پانی۔ کہ ہم اس کا اتنا ہی حال جانتے ہیں۔ کہ سیال رہنے والا ہے جو شکل چاہو۔ آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ آمیزش سے پاک ہو۔ تو طوفان ہے۔ نشیب کی طرف کو بہتا ہے۔ وزن مخصوص کے قاعدے سے ۱۳۳ فٹ سے زیادہ ہوا میں بلند نہیں ہو سکتا۔ حرارت کے اثر سے ہوا ہل جاتا ہے۔ یا اگر غم طبعی کے کسی ماہر سے پوچھو تو شاید دو چار خواص اور باتیں کر کے گا۔ مگر یہ سب آثار ہیں۔ نہ ماہیت۔ ماہیت کا نام آیا اور عقل کم ہو گئی۔

بات کیا ہے۔ کہ دنیا ہے عالم اسباب۔ یہاں واقعات کا ایک سلسلہ ہے۔ ایک کے بعد دوسرا۔ اور دوسرے کے بعد تیسرا۔ واقع ہوتا رہتا ہے۔ ہم واقعہ مقدم کو سبب اور علت کہتے ہیں۔ اور واقعہ متاخر کو مسبب اور معلول نتیجہ۔ اگرچہ سبب کے قرار دینے میں اکثر چند در چند غلطیاں ہوتی ہیں مگر فرعن کرو۔ کہ ہم سبب کے قرار دینے میں غلطی نہ بھی کریں۔ تاہم سبب اور مسبب میں جو علاقہ ہے۔ آج تک اس کا باز کسی پر نہیں کھلا۔ مثلاً جلانا آگ کا خاصہ ہے۔ مقناطیس تو ہے کو کھینچتا ہے۔ مگر کوئی نہیں ہٹا سکتا کہ کیوں۔ ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو۔ تو روئے زمین کے سارے رنگیتانوں میں اتنے ذرے نہ ہوں گے۔ جتنے ستارے آسمان میں بھرے پڑے ہیں۔ پھر یہ ستارے دیکھنے میں چھوٹے چھوٹے نقطے سے نظر آتے ہیں۔ اور در حقیقت ایک ایک بجائے تو دایک جہاں ہے۔ کہ ہماری زمین کی اس کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں۔ غرض سوچنے سمجھنے والے کو دنیا سراسر طاسم حیرت ہے۔

جب دنیاوی امور میں عقل انسانی کی نارسائی کا یہ حال ہو۔ کہ کسی بات کی گنتہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ تو دین میں وہ کیا ہماری رہبری کریگی؟ تو کار میں رانکو ساختی کہ یا آسمان نیز پر دشتی یہ دنیا تو کچھ بھی عالم شہود ہے۔ ہم اس میں موجود ہیں۔ اور اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ اور محسوس بہت اس میں تصرف بھی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ دین خبر دیتا ہے۔ کہ اس دنیا کے سوا ایک جہاں اور ہے۔ یہ ظاہر ہے وہ غائب۔ یہ خفیہ ہے وہ باقی۔ یہ مجاز ہے۔ وہ حقیقت۔ یہ تمہید ہے وہ نفس مطلب۔ یہ امکان ہے وہ نتیجہ۔ یہ سفر ہے وہ منزل مقصود۔ یہ خواب ہے وہ تعبیر۔ یہ افسانہ ہے وہ حق الامر۔ ظاہر ہے کہ عقل انسانی کو اس جہان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا چاہیے۔ کیونکہ اس کی مشائے رسانی سے بہت دور پڑے ہیں۔ لیکن خدا کی ہے اتنا مہربانی سے پیدا تھا۔ کہ انسان جو اس کی مخلوقات میں سب سے افضل ہے اس جہان سے بالکل بے خبر ہے۔ اور جس طرح اس نے اور چیزوں کو دوسرے خواص بخشنے ہیں۔ عقل انسانی کو نیک و بد کی تمیز عطا فرمائی۔ کہ جاہل سے جاہل اور وحشی سے وحشی بھی بھلائی کی طرف راغب ہے۔ نہ کسی دنیاوی مفاد کی طرح سے۔ اور چٹائی سے ہارپ (بیٹاگنے والا) ہے نہ کسی نقصان کے خوف سے۔ بلکہ گویا انسان کا دل مقناطیسی سوئی ہے۔ اور نیکی شمال کی سمت پس اس جہان کے متعلق رسانی معلومات۔ واقفیت جو کچھ سمجھو۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ کہ آدمی بالطبع نیکی کو پسند اور بدی کو نا پسند کرتا ہے۔ پھر انسان کی عقل اپنی طرف سے کچھ کمی نہیں کرتی۔ بہتیرا زور مارتی ہے کہ وہاں کی حقیقت دریافت کر دوں۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔

حال عدم نہ کچھ کھلا گزرے ہے لڑنگاں پر کیا کوئی حقیقت آن کر دکھائیں مگر یہی  
 پہلی ہدی کے اشیاء کے ساتھ اس کو اتنی بات اور بھی سوجھتی ہے کہ  
 انسان کے ہر ایک فعل کو ایک نتیجہ لازم ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض افعال  
 کے نتائج اسی دنیا میں واقع ہو جاتے ہیں۔ مگر بعض کے نہیں بھی ہوتے۔  
 اور ہم دیکھتے ہیں کہ دنیاوی نتائج کے علاوہ طبعیتیں کسی اور نتیجے کی بھی  
 قنطر رہتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک جہان اور ہونا چاہئے  
 اور اس کی ضرورت ہے۔ اور ہمیں معلوم کیا سہج ہے۔ کہ دل خود بخود  
 اندر سے گواہی دیتا ہے۔ کہ مرے سے تو ہمارا پیچھا چھوٹتا ہوا نظر نہیں  
 آتا۔ مرے پیچھے ہم کسی حالت میں نہیں۔ مگر رہیں گے ضرور۔ پس یہاں  
 عقل کی پرواز تمام ہوئی۔

اگر ایک سر نمو سے برتر پریم فروغ تجلی بسوز و پریم  
 مگر اس سے تو کچھ بھی کشود کار نہ ہوا۔ دل جو اس جہان کے تفسیلی  
 حالات کے مشتاق تھے۔ بدستور جویا کے جویا رہے۔ اب دین کی سرحد  
 میں آگے بڑھنا چاہئے ہو۔ تو چراغ عقل کو گل کر دو۔ اور آفتاب  
 جہان تاباں کلام الہی کو اپنا ہادی اور راہ نما قرار دو۔

## کارخانہ عالم

یہی دنیا کی تمام مخلوقات پر فائز نظر ڈال کر۔ اس آسائے مطلق کی حیرت انگیز  
 صفت اور کاریگری کو دیکھ کر خداوند عالم کی ہستی اور وجود کا قائل ہونا چاہئے  
 اور یہ سمجھنا چاہئے۔ کہ اسی خالق یکتا نے ہم سب کو نیست سے ہست کیا  
 معروم سے موجود کیا۔ وہی باقی ہے۔ اور سب چیزیں خالق۔ اس کی ہستی سے  
 کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

دُنیا کا آبِ بڑا بھاری عظیم الشان کارخانہ ہے۔ کئے کو محدود ہے۔  
 اگر کسی نے اس کی انتہا نہیں پائی۔ اس کارخانے کے مقابلے میں زمین کی  
 اس وسعت اتنی بھی تو حقیقت نہیں۔ جیسے بڑے سے بڑے پہاڑ کے  
 آگے ایک ڈرے کی۔ اگر علم ہیئت کی سب باتیں سچی ہیں۔ اور حسب  
 مشاہدات اور اصولی ہندسہ پر مبنی ہیں۔ تو اُن کو غلط ہی کون کہہ سکتا ہے؟  
 تو چار و ناچار انسان کو اپنی در ماندگی کا نارسائی اور بے حقیقتی کا اظہار  
 کرنا پڑتا ہے۔ ہزار دلی ہزار۔ نہیں ہزار۔ چاس ہزار۔ لاکھ کوس تک کا  
 بھی تجربہ یوں ہی سا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہمارے کچھ در ہمارے کچھ  
 کوسوں کے سمجھنے کو کس کی شکل لائیں۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے۔ ان دوریوں کا  
 کہ زمین پر سے گولہ چھوٹے۔ اور شبانہ روز مسلسل ایک رفتار سے سیدھا چلا جائے  
 تو اُس برس میں جا کر آفتاب تک پہنچے۔ اللہ اکبر جل شانہ۔ بڑے سے  
 بڑے پتے کی دوری میں ایجاد ہوئیں۔ اگر ہم نے اجرام فلکی کا کیا دیکھا  
 ایک جھلک۔ وہ بھی اُن محدود ہند کی۔ جو زمین کے بہ نسبت دوسرے  
 بڑے شمار اجرام کے تہہ ہیں۔ کبھی آسمان خوب صاف ہوتا ہے۔ تو ابھیر کی  
 رات میں کس کس سے ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا گری افشاں چٹکی  
 ہوئی ہے۔ اگر کسی طرح اونچے سے اونچے ستارے پر پہنچنا ممکن  
 ہوتا۔ تو وہاں سے بھی جہاں تک اور آگے کو نظر کام کرتی یہی کیفیت  
 دکھائی دیتی ہے پھر خدا جانے۔ کتنے کالے کوسوں کی مسافت ہے۔ کہ  
 ستارے ہکوتھے نیچے نقطے دکھائی دیتے ہیں۔ ورنہ جس طرح اس کا  
 یقین ہے۔ کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اسی طرح جانتے والوں کو اس کا  
 بھی ارعان (یقین) ہونا چاہیے۔ کہ ایک ایک نقطہ بجائے خود جہاں ہے

اور جہاں بھی کیسا ہے کہ اگر اُس کو بڑا ملکا فرض کر دو۔ تو زمین اُس کے سامنے ششاس کا نہ سہی تو دلائی کا دائم ضرور ہے۔ جو تارے زمین سے زیادہ پاس ہیں۔ یعنی اُن کی فوری لاکھوں کوس کے پٹیے کے اندر ہی اندر ہے۔ فوری زمین کی مدد سے اُن کے حالات کسی قدر زیادہ دریافت ہوئے ہیں۔ اور پاس پرورس کی آخر تھوڑی بہت خبر ہوئی ہی چاہئے۔ سمندر چھیلیں۔ پہاڑ۔ وھوہ۔ چھاؤں۔ بادل۔ یہ سب چیزیں اُن تاروں میں صاف دیکھ پڑتی ہیں۔ اس سے اور دوسرے بہت سے فرائض سے علمائے ہیئت۔ قیاس کرتے ہیں۔ اور بجا قیاس کرتے ہیں۔ کہ زمین کی طرح اُن جہانوں میں بھی جاندار آباد ہیں۔ یہاں عقل انسانی کے اوسماں اور بھی کم ہیں۔ بچھا لگے بے شمار جہانوں کی مکمل مخلوقات کا تو ہم کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جب کہ ایک زمین کی مخلوقات کی گنتی درکنار۔ تمام اقسام تک منضبط نہیں۔ کسی کسی کتاب میں نظر سے گذرا۔ کہ زمانہ حال کا کوئی فلسفی فرم رہا ہیں میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا۔ ستو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں یہ مشکل شمار کر سکا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو۔ تو تمام کرہ آب میں جو تین چوتھائی زمین کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ کتنی مخلوقات ہوگی؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرد اگر ۵۴ میل ہوا کے دل کا کرہ ہے۔ اور اس میں بھی جانداروں کی ایسی ہی یا اس سے زیادہ کثرت ہے۔ ہر چند کارخانہ قدرت الہی کی عظمت اور شان فہم بشر سے خارج ہے۔ مگر جس طریق پر میں نے اجالا بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی متواتر اور متصل مدتوں تک غور کرتا رہے۔ تو ضرور اُس کے دل میں اپنی بے حقیقتی اور در ماندگی اور بے وقعتی کا یقین پیدا ہوگا۔ جس کو میں



و تعمیر کی بنیاد یا تمہید سمجھنا ہوں۔

اس کے بعد زمین کو اس طرف متوجہ کرنا چاہئے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ  
 بائیں عظمت کیسی عہدگی اور کیسے انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہ تھکنگ  
 ہوتی ہے۔ اجرام فلکی کے اتنے اتنے بڑے بڑے شمار کو لے۔ کہ خدا کی پناہ  
 اور خود زمین سب سے بڑی ہیں۔ خدا جانے کب سے اور کب تک۔ اور  
 نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ نہ بالی بڑا بڑا رفتار بدلتے ہیں۔ اب جو آدمیوں کو  
 قاعدہ معلوم ہو گیا ہے۔ گو سیکڑوں ہزاروں برس پہلے سے پیشین گوئی ہو سکتی ہے  
 کہ قلائ ستارہ قلائ وقت قلائ مقام پر ہوگا۔ اور وہیں ہوتا ہے۔ حساب  
 میں اگر غلطی نہ ہو۔ تو منٹ سکند کپسا ہا سکند کے ہزاروں حصے کی قدر بھی  
 آگ کا پھینکا نہیں ہو سکتا۔ یہاں تو زمین پر ایک جھٹکے۔ ایک دانے۔ ایک  
 پھل۔ ایک پنکھڑی۔ گھاس کی ایک ڈٹھل۔ چھوٹی سے چھوٹی اور اونٹ  
 سے اونٹ چیز کو بھی نظر غور سے دیکھو تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر چیز کی کچھ  
 نہ کچھ غرض و غایت ہے۔ جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اس چیز میں موجود  
 ہے۔ مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا ہے۔ تو اس کے پانوں کے تلوے  
 چوڑے اور اسفنج کی طرح پوسے ہیں۔ کہ رہت میں نہ دھسیں۔ اس کی گردن  
 بہت لمبی ہے۔ تاکہ اونچے درختوں کے پتے چر سکے۔ اس کو ایک خاص طرح  
 کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے۔ جس میں کئی کئی ہفتوں کے لئے کھانا پانی  
 بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے ملک میں وہ پیدا کیا گیا۔ وہاں کئی کئی دن تک شہت  
 پانی چارے کا نہ ملنا کچھ تعجب نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کو ان کا  
 شکر و دام ہے۔ کہ اگر اس کو ایک عرصہ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو  
 کو ان کی چربی بدل مایہ تبدیل رجو چیز تحلیل ہوتی جائے اس کا بدلہ ہا کام

دے۔ بہرہ وغیرہ جنگلی جانوروں کی ٹانگیں پتلی پتلی ہیں۔ تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لئے پھرتی کے ساتھ بھاگ سکیں۔ ہاتھ سے ایک سوئڈ ٹکک رہی ہے جن سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے۔ پرندوں کے جیسے سبک ہیں۔ تاکہ ہوا میں اڑ سکیں۔ دریائی جانوروں کے بچے کھال سے جڑے ہوئے ہیں۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چھو ہیں۔ گوشت خوار جانوروں کے بچے اور حالت اُن کی غذا کے مناسب ہیں۔ نباتات میں پھل پھول کی حفاظت کے واسطے کانٹے ہیں۔ پوست ہیں۔ خول ہیں۔ سرو ٹکک کے جانوروں کی اُون بڑی بڑی اور گھٹی ہے۔ کہ جاڑا نہ کھائیں۔ جتنے جاندار معرض تلف میں ہیں اُن میں تولد و تناسل کی کثرت ہے۔ تاکہ نسل معدوم نہ ہو۔ مثلاً ایک ایک چھٹی لاکھ لاکھ سے زیادہ اندھے دیتی ہے۔ آدمی چونکہ بقائے حیات کا سامان عقل کی مدد سے ہم پہنچا سکتا ہے۔ سینک اور بچے اور اُون اس قسم کے قدرتی سامان اُس کو نہیں دئے گئے۔ جس ٹکک میں نباتات کی کثرت ہے۔ وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ٹکک پانی کا محتاج ہے۔ انسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے۔ تو اُس کا ایک ایک زوال صانع قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی دے رہا ہے۔ اُس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پرزہ ہاتھ ہے۔ کہ دنیا میں جس قدر انسان کے تصرفات ہیں۔ اور انسان کی بساط پر خیال کرو۔ تو ان تصرفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سب اسی پرزے کے ہیں۔ اہل یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عمدہ کلیں بنائی ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ اُن کلوں سے عقل انسانی کی قوت بڑی شکر و مدد کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر محکو بھی دو چار کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا

ہے۔ ایک بکھڑا ہے۔ کہ بکھڑوں زمین پر پھیلا ہے۔ سیکڑوں پڑے۔ ہزار ہا  
 بیج بیلن۔ بے۔ چرخیاں۔ کمانیاں۔ ٹھرا جائے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع  
 کئے ہیں۔ تب کہیں جاکر وہ ایک مطلب حاصل ہوتا ہے۔ جن کے لئے کل  
 بنائی گئی ہے۔ یہ تو آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے۔ اور ایک اونٹ  
 سی کل خدائی بنائی ہوئی ہے۔ یہی آدمی کا ہاتھ کہ ہزار ہا قسم کے کام  
 اس سے بکلتے ہیں۔ اور ترکیب دیکھو۔ تو اسی سلیس اور مختصر۔ کہ ایک کھن  
 دست ہے۔ اور پتین تین جوڑ کی پانچ انگلیاں۔ اللہ اللہ۔ خیر صلاح۔  
 انسان کے بدن میں ایک اور ڈرے بھر کی چیز آٹکھ ہے۔ اس کی ساخت  
 میں جو اندرونی حکمتیں ہیں۔ ان سے بالاستغاب ایک کتاب بن سکتی ہے  
 مگر غارت کی احتیاطوں کو تو دیکھو۔ کہ پہلے گویا ہڈیوں کا کاؤں ہے۔ جس  
 گینے کی طرح آنکھ تعبیر کی ہوئی ہے۔ اوپر بھونہ کا چھتچہ دار سایہ بان۔  
 سامنے پوٹوں کا پردہ۔ پردے میں ہلکوں کی جھال۔ پھر پوٹے کے اندر منافذ  
 ہیں۔ جن میں سے آئینہ چشم کے صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت  
 رستی رہتی ہے۔ یہ وہی رطوبت ہے۔ جو زیادہ ہو کر آشوبن جاتی ہے۔ جتنی  
 دفعہ انسان ہلک جھپکاتا ہے۔ گویا اٹنی ہی دفعہ آئینے پر چھرا پھرتا ہے۔  
 گرد اور دھوئیں اور کنک کی صورت میں بے اختیار آشوبن لگتے ہیں۔  
 جس کے یہ معنی ہیں کہ چھرا کافی نہیں۔ بلکہ آئینے کو دھوئے کی ضرورت ہے  
 میرا تو کیا تمہارے۔ مگر موجودات عالم میں جو اسرارِ حکمت مضمر ہیں  
 ان کا ایک شے بھی بیان کر سکوں۔ مگر میری غرض اسی قدر ہے۔ کہ دنیا  
 کے کارخانے کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے۔ کل میں نے آیتہ اللہ کا سبق  
 سنا۔ وہ عجائبِ قدرت پڑھتا ہے۔ کسی شخص نے نیچرل فلاسفی دیکھی

طبعی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اردو میں ترجمہ کر دئے ہیں  
 اُسی میں لکھا تھا۔ کہ چھپر کے تختہ کے آگے جو ایک چلی سونڈ سی ہوتی  
 ہے۔ وہ حقیقت میں ایک ٹلو ہے۔ اُس ٹلوے میں تین اوزار ہیں ایک تو  
 سوئی۔ جس کو چھپر مسام میں داخل کرتا ہے۔ ایک آری۔ کہ مسام کو  
 چوڑا کرنے کی ضرورت ہو۔ تو اُس سے کام لے۔ اور ایک سیگی جس کی  
 راہ خون چوستا ہے۔ اُس میں اتنی بات اور بھی تھی۔ کہ اس شکل خاص  
 میں چھپر کی جہات کی مدت صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا۔ کہ  
 تیزی کے ایک پر میں کپڑوں کی طرح تین ہزار دیولیاں ہیں۔ اس طرح کی  
 باتوں کو اگر انسان سرسری طور پر نہ سنے۔ جیسے کہ اُس کی عادت ہے۔ تو ہر روز  
 اس بات کی گواہی دے گا۔ کہ اس کو کسی بڑے قدرت والے۔ دانشمند ہمہ دان  
 حاضر۔ ناظر۔ سمیع۔ بصیر نے کسی مصلحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے۔ ممکن نہیں  
 کہ انسان صمیم قلب سے موجوداتِ عالم میں غور اور حوص کرے اور اُس کا  
 دل اندر سے نہ بولنے لگے۔ کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ بہ اس عمدگی و انضباط  
 نحو و نحو یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ واقعات اتفاقی کی شان  
 ہی دوسری ہوتی ہے۔ ان میں قاعدے کا کہاں پتہ و اور انضباط کا کیا  
 مذکور و اور قاعدہ اور انضباط بھی کیسا و۔ کہ دنیا کی ابتدا سے لے کر  
 آج کی گھڑی تک تو ان میں رتی برابر فرق پڑا نہیں۔

جس غور کی طرف میں تم کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ اُس میں یہ بھی  
 داخل ہے۔ کہ وقت کیا چیز ہے۔ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اگرچہ وقت  
 کی وسعت کا اندازہ بھی فہم بشر سے خارج ہے۔ مگر خیر جہاں تک تم سے  
 اجرم فکری کے فاصلوں کی طرح اندازہ کرتے بن پڑے۔ لاکھ دو لاکھ

چار لاکھ برس کا ایک محدود وقت کے گزری سے وسعت کو سمجھو۔ اور تمثیلاً  
یوں تصور کرو۔ کہ وقت ایک بڑا لمبا خط ہے۔ اس میں سے تمھاری ہستی  
اگرچہ تمھارے معتقدات کے مطابق طب انگریزی پر پورا پورا عمل کرنے سے  
حد طبعی سے بھی کتنی ہی متجاوز کیوں نہو جائے۔ تاہم اس کو وقت مفروض  
کے ساتھ کیا نسبت ہوگی؟ شاید جیسے محیط زمین کے مقابلے میں ایک  
انچ کو یا اس سے بھی کم۔ یہ تو انسان کی ہستی ہے۔ اور اس پر خدا سے  
انکار۔ اور اپنی عقل پر ناز بیجا۔ انسان سے دنیا میں ہزار طرح کی  
بیہودگیاں سرزد ہوتی ہیں۔ مگر یہ سب بیہودگیوں پر فوق لے گئی ہے۔  
کہ خدا ہی کا منکر ہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اور پرے درجے کی ہستی  
کہ عقل جو انسان کو اسی غرض سے دی گئی ہے کہ مخلوقات سے خالق کو  
پہچانے۔ ورنہ دنیا کی چند روزہ زندگی تو جانور بھی بسر کر لیتے ہیں جن کو  
بہت سا کھانا اور پانی درکار ہوتا ہے۔ اور مزہ یہ ہے۔ کہ حاجتیں کثیر  
اور عقل کم۔ اور پھر انسان سے کہیں زیادہ خوشحال۔ غرض بڑے  
افسوس کی بات ہے۔ کہ وہی عقل انسان کو ایسا گمراہ کرے۔ کہ خدا کا  
قائل نہ ہونے لگے۔ حقیقت میں میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کوئی آدمی  
کس معنی سے کہہ سکتا ہے۔ کہ خدا نہیں۔ تم مجھ کو اتنا تو سمجھاؤ۔ کہ  
تم نے اپنے تئیں سمجھا ہے کیا؟ چندیں ہزار عالم کے مقابلے میں تمھاری  
کیا حقیقت ہے۔ اور چندیں ہزار عالم بھی نہ سہی۔ ان کی مخلوقات  
بھی نہ سہی۔ ایک رُوئے زمین پر ابتدا سے اب تک تم جیسے اور  
تم سے بہتر اور تم سے بہتر سے بہتر کر رہا آہو پیلا ہوئے۔ اور  
اپنی زندگی میں انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ خدا کے ایسے ایسے بے شمار

بندے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے حکومتیں کیں۔ سلطنتیں کیں۔ اپنے زمانے میں  
 نامی نامور ہوئے۔ اور پھر ایسے ہوئے۔ کہ گویا پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔  
 نہ ان کا نام ہے نہ نشان ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم کوئی انوکھے آدمی ہو۔  
 تم بھی اپنے ارادے سے پیدا نہیں ہوئے۔ اور قسم ہے اس ذاتِ یاقین  
 کی۔ کہ جس کے ہاتھ میں میری اور تمہاری دونوں کی۔ اور سب جانداروں  
 کی جان ہے۔ اپنے ارادے سے زندہ بھی نہیں ہوئے اور اپنے ارادے  
 سے مرے بھی نہیں۔ اور مرے بعد مہینے دو مہینے پیچھے نہ سہی۔  
 پچاس تلو دو سو ہزار برس بعد۔ روے زمین پر اتنا جاننے والا بھی  
 تو نہیں ہوگا کہ ہم تم بھی کوئی تھے۔

## ہماری تعلیم

کچھ خبر بھی ہے۔ کہ علم نے اس زمانے میں دوسری شان اختیار کی  
 ہے۔ ہم جو اپنے علوم پر نظر کرتے ہیں۔ تو ان کے ذہنی نتیجے پاتے ہیں  
 یا تو زبان کی تکمیل یا ذہنی کی تیزی۔ سو زمانے نے ایسا پلٹا دکھایا۔ کہ  
 دونوں نتیجے بیکار ہو گئے۔ جن زبانوں کی تکمیل کے نتیجے ہم عمر کا بڑا  
 حصہ صرف کیا کرتے تھے۔ اب ان زبانوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ رہی ذہنی  
 کی تیزی۔ یعنی حکمت انسانی۔ اس کا بھرم حکمتِ عملی نے اٹھا دیا۔ اور  
 ہم علم کے اعتبار سے بالکل کورے کے کورے رہ گئے۔ زبان کی تکمیل سے  
 جو اغراضِ دنیوی متعلق ہو سکتے ہیں۔ وہ اب انگریزی کی طرف منتقل  
 ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم میں سے اکثر ان اغراض کے سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں  
 لوگوں نے اسی کو انگریزی کی غرض و غایت سمجھ رکھا ہے۔ اور اسی لئے

اس کو سمجھتے ہیں کہ حکام وقت کی زبان ہے۔ اور اسی کے ذریعہ سے ہم حکام کے ساتھ باسانی خیالات کا مبادلہ یعنی عرض مطلب - فہم مافی الضمیر کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ حاکم اور محکوم میں باسانی خیالات کا مبادلہ بڑی ضروری اور بکار آمد چیز ہے۔ لیکن میں انگریزی کی ٹون کو خراب اونچا لیجانا چاہتا ہوں۔ حکام کے ساتھ خیالات کا مبادلہ تو انگریزی کے ادنیٰ ترین اور خفیس ترین فائدوں میں سے ہے۔ انگریزی کا اصلی اور عمدہ فائدہ جو مد نظر ہوتا چاہئے۔ یہ ہے۔ کہ زبان انگریزی علوم مفیدہ کی کلید ہے۔ یہ علوم یا تو سرے سے ایشیائی زبانوں میں ہیں ہی نہیں۔ یا ہیں بھی۔ تو زمانہ حال کی تحقیقات کے مقابلے میں تقویم باریہ کا حکم رکھتے ہیں۔ انگریزی زبان قوم اور ملک کو اسی وقت مفید ہوگی۔ جب یہ مقصود پیش نظر رکھ کر اس کو حاصل کرو گے۔ غرض یہ ہے کہ علم مقصود بالذات اور زبان انگریزی کو اس کا آلہ سمجھا جائے۔ افسوس ہے۔ کہ اس گمراہ کو ابھی تک لوگوں نے سمجھا ہی نہیں۔ یا سمجھا ہے۔ تو اس پر عمل نہیں کیا اور سمجھا اور اس پر عمل کیا ہوتا۔ تو اتنے ہی دلوں میں ہندوستان کی کاپا پلٹ گئی ہوتی۔ تحقیقات مزید اور ترقی اور ایجاد کا تو کیا مذکور ہے جو علوم زبان انگریزی میں مذکور ہیں۔ اور جس درجہ تک وہ پہنچ چکے ہیں۔ اتنے ہی پر کسی نے کچھ عمل کر کے دکھایا ہوتا۔ ہمارے بد تقسیم ہندوستان میں میٹرل کی کوئی کمی نہیں۔ کمی ہے تو اس کی ہے۔ کہ کوئی میٹرل کا استعمال کرنے والا نہیں۔ ایک تو نوکری کی لکیر کے فقیر سے بیٹھے ہیں۔ اور نوکری کی کیا اور کبریتا خر ہوئی جاتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ مثلاً سنو لی۔ اسے پاس ہوتے۔ تو نوٹسے روٹیوں کے لئے سرگرداں پڑے پھرتے ہیں۔

اور نوٹس بھی اب ہیں۔ یا کوئی دن جاتا ہے۔ کہ ٹو پاس۔ اور ٹو  
 جسے ٹو پاس حرمیں و پاس۔ انگریزی پڑھکر کچھ فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔ تو  
 پہلے نوکری کے ضبط کو سر سے نکالو۔ یہ جنوں پتھیں نہیں پہنچتے دے گا  
 کبھی ان باتوں پر بھی غور کیا کرو۔ کہ مثلاً مختارے اسی ستر میں کتنے  
 آدمی ہیں۔ اور ان میں کتنے ہیں۔ جو نوکری سے معاش پیدا کیا کرتے ہیں۔  
 حساب لگاؤ گے۔ نو فیصد کوئی چوتھے پانچویں درجہ کا ڈیسل منگے گا۔ ہر  
 مردم آزاری کے مواقع پاکر شیخی بگھارنے لگی تو بات اور ہے خوشحالی کا ایک  
 سٹنڈرڈ قرار دے تو۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں۔ کہ جس کی ٹو روپیہ ماہوار  
 کی آمدنی ہو اس کو اس زمانہ میں خوشحال سمجھنا چاہئے۔ اب دیکھو کہ  
 خوشحالی کے اسٹنڈرڈ کے لحاظ سے نوکری پیشوں میں فی صد کتنے ہیں۔ اور  
 دوسرے پیشوں میں کتنے تو پاؤ گے۔ کہ اس نسبت میں نوکرے پیشہ۔ چوتھے  
 پانچویں درجہ کے ڈیسل سے بھی دور ہٹے ہوئے ہیں۔ پس تم انگریزی پڑھکر  
 جو ایک نوکری پر دھنا دو۔ تو اس کے یہ معنی ہوں گے۔ کہ اس عمارت  
 کو جو برسوں کی محنت سے بنائی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے ڈھاتے ہو۔ عقلاً  
 شرعاً کوئی سا پیشہ بھی مہذب نہیں۔ مہذب اگر ہے۔ تو وہ آدمی ہے۔ جو  
 دنیا بازی بے ایمانی سے پیشے کو بدنام کرتا ہے دل پر دہداری اور نیکی کا  
 پر تو پڑا ہو تو جالو۔ کہ اعلیٰ عزت کیا ہے؟ خدا کے نزدیک بڑا بزرگ  
 وہ ہے۔ جو پڑا پر ہیزگار ہو۔ لوگ نہ اس لئے نوکری کے گردیدہ ہو رہے  
 ہیں۔ کہ اس پیشے میں تمکول اور خوشحالی زیادہ ہے۔ نہیں۔ بلکہ اس لئے۔  
 کہ ان کو اپنے اپناے جنس پر حکم چلانے اور ان کو ستانے۔ اور ایذا دینے  
 کا موقع ملتا ہے۔ لوگوں نے اسی کو عزت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ نیک دل



اور دیندار آدمی کی نظر میں اس سے بڑھکر کوئی بے عزتی کی بات نہیں۔  
 تم تو نصیحت کی بات کو اس کان سنتے اور اس کان نکال دیتے ہو۔ محکم  
 اور مردم آزاری کو عزت سمجھو۔ تو لوگری ذریعہ عزت ہے۔ اور پائی تابعداری  
 کے اعتبار سے دیکھو۔ تو وہ ایک طرح کی غلامی ہے۔ کتنی ہی بڑی لوگری  
 کیوں نہ ہو۔ آخر کسی نہ کسی کی محکومی تو اس میں ہو ہی گی۔ غرض لوگری  
 کو عموماً پیشہ معزز سمجھنا محض خیالی بات ہے۔ عزت اور ذلت کسی پیشہ  
 پر موقوف نہیں۔ بلکہ عزت اور ذلت کا مدار انسان کا اپنا کردار ہے۔ اگر  
 کوئی شخص کسی بڑی خدمت پر مامور ہے۔ اور وہ آدمی بھی معقول رکھتا  
 ہے اور بڑی شان سے زندگی بسر کرتا ہے۔ حکومت بھی ہے۔ اختیارات بھی  
 ہیں۔ اور سرکار میں رشد و رسائی ہے۔ اور وہ ناسخ بندگان خدا کو ایذا  
 دیتا۔ اور ان کے حقوق تلف کرتا۔ اور رشوت لیتا ہے۔ حقیقت میں  
 وہ سب سے زیادہ ذلیل ہے۔ نہ صرف پبلک کی نظر میں۔ بلکہ خود اپنی نظر  
 میں اور خدا کے نزدیک۔ لیکن ایک غریب آدمی جو محنت مزدوری سے  
 جائز طور پر معاش پیدا کرتا۔ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں۔ کوئی اس کا  
 شکاری نہیں۔ ایسا شخص اصلی عزت رکھتا۔ اور اس کا مستحق ہے۔

اس وقت جو اس تعلیم کے ساتھ تعلیم ہو رہی ہے۔ اور تعلیم کو  
 اس سے بھی زیادہ عام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اچھی طرح  
 طالب علموں کے ذہن نشین کر دینا چاہئے کہ لوگری کے خط کو سر میں  
 نہ آئے دیں۔ ورنہ تعلیم سے فائدے کی جگہ الٹ نقصان اٹھائیں گے۔ اور  
 ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی۔ اور نہ صرف اپنی زندگی۔ بلکہ اور بہت سی  
 زندگیوں جو ان کے ساتھ وابستہ ہیں سب کو تلخ کر دیں گے۔ میرے

اس بیان سے کوئی صاحب ایسا نہ سمجھیں۔ کہ میں تعلیم کی طرف سے لوگوں کے دلوں کو اچاٹ کرتا ہوں۔ میرا مقصود ہرگز یہ نہیں ہیں تو تعلیم کو اور اسی تعلیم کو جو ان دنوں ہو رہی ہے۔ ہر فرد بشر کے لئے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھ کو وہ دن آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ راگچہ جب تک وہ آئے آئے ہیں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ مگر مجھ کو وہ دن آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ جب کہ یہی تعلیم شرط زندگی ہونے والی ہے۔ اور زندگی سے میری مراد ہے معزز اور مطمئن زندگی۔ میرا مطلب صرف اس قدر ہے۔ کہ جو لوگ تعلیم پا رہے ہیں۔ اور تعلیم تو سبھی کو پانی چاہئے۔ غرض سارے تعلیم یافتہ اگر ایک ہی پیشے پر جھک پڑیں گے۔ گو وہ پیشہ فی حد ذاتہ کیسا ہی وسیع کیوں نہ ہو۔ یہ اُس کا ضروری اور بدیہی نتیجہ ہے۔ کہ سب جھوکوں مڑیں۔ لوگوں کی ضرورتیں متنوع ہیں۔ اور اس سے دنیا میں متنوع پیشے چل پڑیں ہیں۔ انسان کی ضرورتوں اور پیشوں کے متنوع سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں روزی کی کمی نہیں۔ مگر ہم ایک پیشہ خاص سے مقید ہو کر روزی کو تنگ کر لیتے ہیں۔ اب یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ نوکری کے علاوہ دوسرے پیشوں کے لئے تعلیم ہی کی کیا ضرورت ہے؟ جواب یہ ہے۔ کہ تعلیم سے تو کبھی کوئی اپنی پیشہ بھی اچھے نیانہ نہیں ہوا۔ ہاں تعلیم سینہ بسینہ ہوتی رہی ہے۔ یا نقل و تقلید سے۔ اس زمانے میں یہ نئی بات پیدا ہوئی ہے۔ کہ ایک ایک چیز اور ایک ایک کام علم مستقل قرار پایا ہے۔ مثلاً موسیقی۔ کہ ہمارے یہاں سینہ بسینہ اُس کی تعلیم ہوتی ہے۔ یا نقل و تقلید سے لوگ اُس کو حاصل کرتے ہیں۔ مگر تم نے انگریزی بیٹہ بچتے دیکھے ہوں گے۔

کہ اونچی اونچی میزوں کا ایک حلقہ ہے۔ لوگ مزامیر لئے اس کے گرد کھڑے ہیں۔ ہر ایک کے آگے ایک کتاب دھری ہے۔ صدر مقام پرنسٹن کھڑا ہوا ہاجے بگوا رہا ہے۔ انگریزوں کی ولایت میں تو یہ حال ہو گیا ہے کہ ورزی اور خجام اور موی اور لوہار تک اپنا پیشہ نہیں چلا سکتا۔ تا وقتیکہ اس نے سبقاً سبقاً اپنے پیٹے کی کتابی تعلیم نہ پائی ہو۔ اور یہ بات سب پر روشن ہے۔ کہ یہ ہندوستان کل باتوں میں یورپ کی تقلید کرتا چلا رہا ہے۔ اور تقلید کے بدول اس کو چارہ نہیں۔ یہ تعلیم کو کسی خاص پیشے کی نہ بھی ہو۔ تاہم اس سے اتنی آگاہی تو انسان کو ضرور ہو جاتی ہے۔ کہ وہ جس کام کو اختیار کرے گا۔ اس کو کر دکھائے گا۔ اور سلیقہ کے ساتھ کر دکھائے گا۔

## پرنٹ رتن ناتھ در سمر شار

لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ۴ برس کے تھے جب ان کے والد پرنٹ بیچنا تھ صاحب کا انتقال ہوا آپ عربی۔ فارسی میں اچھی پابقت رکھتے تھے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔ شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے مشاعرہ میں آپ آدودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے۔ وہاں سے علیحدگی کے بعد اپنا ایک خاص رسالہ مکتدہ سمر شار نکالنے لگے۔ مشاعرہ میں آپ حیدر آباد گئے۔ ہذا کسٹمی ہمارا جہ کشن پرشاو صاحب اس زمانے میں وزیر اوقاف تھے۔ سمر شار وہیں رہتے تھے۔ مشاعرہ میں حیدر آباد ہی میں آپ رہی ملک بٹا ہوئے۔

آپ فسانہ نگاری کے طرز جدید کے موجد ہیں۔ آپ کی تصانیف سے سپہر کسمار۔ جام سمر شار۔ فسانہ آزاد و بشور ہیں۔ ان سب

میں بہتر تصنیف فسانہ آزاد ہے۔ اس میں جس واقعہ منظر مثل نظر قدرت کو دکھایا ہے۔ اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ واعظ۔ انیسویں۔ بھٹیاری۔ جس کی زبان لکھی ہے۔ پورا خاکہ اتار لیا ہے۔ مستورات کی زبان ایسی صیح طور سے ادا کی ہے۔ گویا بیگمات ہی کی زبان ہے فسانہ آزاد لکھنؤ کے اس وقت کی سوسائٹی کا دلچسپ مرقع ہے۔

## لکھنؤ کا محرم الحرام

سینوں میں جگر پہ تیر غم چلتے ہیں مریخاروں پہ اشک شمع ساں دھلتے ہیں  
کیوں تفریق خانوں میں نہ روتی ہوئی دل بھی تو چراغوں کی طرح چلتے ہیں  
میاں آزاد سیلائی آدمی سیر سناٹے پر اوجھار کھائے ہوئے مڑ گشتی  
کی دھن جو سائی تو ریل کے انجن کی طرح چل کھڑے ہوئے۔ اور سوچے۔  
کہ چل کے محرم لکھنؤ کا دیکھ لیں۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گھر گھر غیلوں و  
شین۔ گھر گھر بکا و بین۔ گریہ و زاری۔ اشکباری۔ حم و غفیر۔ مجمع کثیر۔ ایک  
جلے تن بول اٹھے اور کیوں نہ ہو، مجالس عزا کی دھوم و دھام ہے لکھنؤ  
کا محرم الحرام ہے۔ لکھنؤ کی سوز خوانی۔ لکھنؤ کی خوش بیانی۔ لکھنؤ  
کی عزاداری۔ لکھنؤ کی سوگداری۔ از شام تا روم مشہور ہر مرد و بوم  
ہے تقریر خانوں میں دھوم۔ امام باڑوں میں ہجوم ہے۔ اور ان سب میں  
حسین آباد مبارک کا ابدرانی انجم ہے ان کے ساتھ ان کے ایک  
دوست ہوئے تھے۔ ان کی بقیاری کا حال بچہ نہ پوچھے۔ وہ لکھنؤ سے  
واقف نہ تھے۔ ٹوٹے جاتے ہیں۔ کہ شہید کر بلا کا واسطہ آمل مصطفیٰ کا صدر  
ہیں لکھنؤ کا محرم دکھا دو۔ مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک شخص نے

ایک آہ سرد کھینچ کر کہا: یہاں۔ اب وہ لکھنؤ کہاں؟ وہ لوگ کہاں۔  
 وہ دل کہاں؟۔ لکھنؤ کا محرم رنگیے بنیا جا عالم کے وقت میں دیکھتا  
 تھوڑی گویے اوج طور بھی عیش بخش کر جاتا۔ نامکوں کی شمشیر دو پیکر جب  
 دیکھو۔ میاں سے دلو انگل باہر۔ کسی نے ذرا تکی بھی چوڑی کی۔ اور انھوں  
 کھٹ سے سر وہی کا تلاء ہوا پاتھ چھوڑا۔ بھنڈارا کھل گیا۔ ایک ایک  
 گھٹے میں بینک بینک خانہ جنگیوں کی شہر آتی تھی۔ دکاندار جوتیاں چھوڑ  
 چھوڑ کر شک جاتے تھے۔ وہ دھکم دھکا۔ وہ بھڑ بھڑکا ہوتا تھا۔ کہ  
 واہ جی واہ!۔ انتظام کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔  
 ادنیٰ ادنیٰ آدمی ہزاروں لٹاتا تھا۔ اب کوئی بھی نذر حسین نہیں نکالتا  
 اب انیس ہیں نہ دیر مونس ہیں۔ نہ شمشیر ضمیر ہیں نہ دلگیر۔  
 افسوس جہاں سے دوست کیا کیا گئے اس بارغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے  
 تھا کون سا گل جس نے دیکھی نہ خراب وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے  
 دیر بردار کی تربت کو خدا عین کرے۔ واللہ خدائے سخن تھا۔ میر نے  
 غ۔ جب فضل دھن کھلا، جواہر کھلے، گوپا کہ زبان کلید گنجینہ ہے۔  
 ایک ہی رباعی پڑھی۔ اور سامعین چار موصوہ حیرت میں غرق ہو گئے۔  
 کہ اللہ اللہ یہ فصاحت۔ یہ بلاغت۔

نیراج امیر ابن امیر آتا ہے۔ دربار میں شاہوں کے فقیر آتا ہے  
 مشتاق سخن خلق چلی آتی ہے۔ لو مرثیہ پڑھنے کو دیر آتا ہے  
 اور انیس مرحوم کو خدا بخشے۔ باللہ العظیم۔ کلام کیا۔ جواہرات  
 کے ٹکڑے۔ قند و نبات کے ریزے۔ نور کے مرثیے ہیں۔ جو ہر شمس ہے  
 تو انھیں سوتیوں میں تولی کہ فصحاے عظمہ پاک ایران کہتے ہیں۔ کہ کجا

انہیں ہر کجا فردوسی ہر کجا کر بند مرصع ہر کجا شال طوسی ہر زم میں وہ  
 ڈھنگ - رزم میں وہ رنگ - کہ ۵

مضمون انہیں کا نہ چر با آترا اُترا بھی تو کچھ بگڑ کے نقشا آترا  
 نقاش نے سنو طرح کی سخت ٹھینچی تصویر نہ کھینچ سکی تو چسرا آترا  
 ”لیکن ہاتھی ٹٹا بھی - تو کہاں تک - اب بھی اس شہر کی سی عداوری  
 ہفت اقلیم میں نہیں ہوتی - آپ کیسے کہاں کی سیدھیان ہیں - بخت  
 اشرف - کر بلا - کاظمین - میر باقر کے امام باڑے - چو پٹیاں جہاں  
 جلو داخل حنا ہوں - واللہ - بہشت کی یہی سیدھی راہ ہے ۵  
 دربار جناب مصطفیٰ کو دیکھا ان آنکھوں سے شاکر بنا کو دیکھا  
 فروں میں پہنچے تو بخت میں پہنچے بہشت دیکھا جو کر بلا کو دیکھا  
 رنگ ریاں منائے پیدل چلے جاتے تھے - راہ میں وہ بھڑ - وہ ریل  
 پیل - کہ عیاداً باللہ - شانے سے شانہ بچھلتا تھا - ہوا جب - بعد خرابی  
 بسیار کہیں گذر پائے - تو ضیق النفس ہو جائے - ہانکے نر چھے - تکیے  
 ثقات - مقدس کین و ناکس غریب و امیر - برناؤ پیر - اڑے چلے آئے  
 ہیں - جدمر دیکھو زالی و حج - مومن پاک - مثل کعبہ سیاہ پوش - کوئی نام  
 حسین میں سر رہنہ چلا جاتا ہے - کوئی حلہ پوشان بہشت کی طبع  
 ہڑا ہڑا جوڑا بھڑکا تا ہے -

یہ لیجئے - آغا باقر کے امام باڑے میں کھٹ سے داخل - آہو ہو ہوا  
 خدا کی قدرت مجسم نظر آتی ہے - واہ میاں باقر - کیوں نہ ہو - نام کر کے  
 چکا چوندہ کا عالم ہے - لیکن گلی تنگ - تماشاچیوں کی عقل ونگ -  
 ع جاے تنگ است مردماں بسیار - مگر خلقت گھس پٹھکر دیکھ ہی

آئی ہے۔ ناک ٹوٹے۔ یا سر پھوٹے۔ آغا باقر کا امام ہارہ ضرور دیکھیں گے۔ وہاں سے جو طرارہ بھرا۔ ٹوکے پل پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں۔ کہ ایک پیر فرقت دقیاؤس کے ہمصر بیٹھے اگلے لوگوں کو رو رہے ہیں۔ واللہ لکھنؤ کے کھار بڑے نادردہ کار ہیں۔ ایسا بڑھا بنایا۔ کہ معلوم ہوتا ہے پوپے منہ سے آب بولا۔ اور اب بولا۔ وہی سن کے سے بال! وہی سفید بھکویں۔ اب۔ وہی جوتن! وہی پیشانی کی شکن۔ اب۔ وہی ہاتھوں کی چھبریاں وہی کمر خم! وہی سینہ ٹھکا ہوا۔ واہ رے کارگر!۔ تو بھی اپنے من میں کہتا ہے۔ اور تیرا بڑھا تو اللہ ہی اللہ۔

وہاں سے جو چلے۔ تو داروغہ میر واجد علی صاحب مرحوم کے امام ہارے میں آئے۔ یہاں شروع کھمبہ پر وہ جو بن ٹھا۔ کہ آفتاب اگر ایک نظر چھپ چھپا کہ وہ نور دیکھ پاتا۔ تو بارے غیرت کے بحر طلسات میں غوطے کھاتا۔ بے تکلف کرسیوں پر جا ڈٹے۔ اہل کاران سلیقہ شعار نے چینی ڈلی۔ الایچی پیشکش کی۔ وہاں سے حسین آباد مبارک میں پہنچے۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! یہ امام ہارہ ہے۔ یا روضہ رضوا! الہی! یہ مکاں ہے۔ یا بلع جناں! ہر درد دیوار سے چھڑ علی شاہ۔ قرووس آرا مگاہ کا نام روشن ہے۔ امام ہارہ سجا سجا دامن کا ایسا جوتن ہے۔ برجوں پر ضیاء موفور۔ تو منار نور علی نور۔ حیرت تھی۔ کہ یہ کوہ نور ہے۔ یا شعلہ طور ہے۔ سرخ تمیل پر یاقوت احمد ہیرا کھائے چراغاں کی قطار پر مہتاب پروانہ ہو جائے۔ پھر ہر مصفا جو نظر آئی تو آنکھوں نے عجب طراوت پائی۔

## بسنت کی بہار

اللہ اللہ! کیا روح افزا بہار ہے! جس طرف دیکھیے زعفران نثار ہے۔ صوفی صافی تہک مرید مغیب بادہ فروش ہے۔ بہار بسنت کا وہ جوش ہے۔ کہ ساقی تہک درخوش ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔

حکمرانی پر جواہر سلیمان بہار عشق بچاں بن گیا طغرائے فرمان بہار  
 زلف سنبل کو سمجھے گوش گل کو جانے رنگں شہلا کو کہنے چشم فشان بہار

بہار بلخ کا عالم حنا گلزار میں مسطور ہے۔ صفحہ قرطارس انور علی نور ہے۔ گلزار دبستاں ہیں کہ جنت کے چین۔ خور و غلباں ہیں۔ یا نسیم و نسیم۔ قمر و سی آئے۔ تو گلچیں ہو جائے۔ رضواں دیکھے تو شرابے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی ٹھٹھن۔ باد بہاری کے جھومکے سنا سن سنا کی لہک گل جھری کی تمک۔ کلیں کا چمکنا۔ پھولوں کا تمکنا شاخ گل کی کچ ادائی۔ سنبل کی آشفتمگی۔ گلوں کی رعنائی۔ درویدہ انگاہوں سے رنگں شہلا کی نظارہ بازی۔ زبان حلت سے سس کی زبان درازی۔ شاخ گل کا مستانہ دار جھومنا۔ اشجار پر پیوہ کا زمین کو بار بار چومنا۔ سنبل کی سرمستی۔ رنگں کی جام پرستی۔ نوہالان چین کے پاتھوں میں پھول کے جام۔ جیسے زندان مے آشتام بشار بلبلی بغہ خیر ہائے میستار تراتہ ریہ طوطی کی خوش بیانی۔ عنادل کی غول خوانی سکول کی کوگو۔ قمری کا نعرہ حق سرہ۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!

بہار آئی ہے عالم بے گل و نسیم و کوکبہ جو مان چین نازاں ہیں اپنے اپنے جوبن پہ عنادل جوش مسرت سے بے پر کی اڑاتے ہیں۔ غنچہ گل سن سن کر



زیر لب مسکراتے ہیں بشنم کے قطرے ہرے ہرے پتوں پر اس طح نمودار  
 ہیں جیسے کسی سبز پوش انگلوں کے ہاتھ میں لآلی آہار ہیں۔ درخت  
 چھوٹے پھلے۔ سرو سہی ساچے میں ڈھلے۔ سنسریں و سنسریں کا حسن بے عیب  
 و داغ۔ ٹرس و گل چمنستان کے چشم و چراغ۔ ۵  
 وہ بہار آئی ہوئے نغمہ سرا مریخ چمن غیرت باغ ارم آج ہے صحن گلشن  
 جوش ہے زمزمہ سنجی پہ ہیں مرقان بہار کیا تعجب ہے جو گویا ہو زبان سوسن  
 کرم ابر بہار کی سے ہے سیلاب زمین خاک اڑ کر نہیں ہوتی ہے غبار دامن  
 نئے مصنون ادا کرتی ہے ریزے کی زباں کھولتا مکنتہ سرسبتہ ہے غنچہ کا دہن  
 آپ بشنم سے کہاں کا سہ گل ہیں لہر نہ جل ترنگ آج بجائے کوئے عشوق چمن  
 آ بشاروں کا سر آئینہ بچائی ہے صبا تال و تپا ہے کف برگ سے ہر غل چمن  
 کوئی افسانہ زباں نہیں سکتا ہے خن و خاشاک سے کیا صاف ہے صحن گلشن  
 ایسی کف سے جو ہو بارش باباں بہار راہر شمشک کا حکم ہے نہ ہو تر دہن  
 پچھو لوں سے لہر نہ گلچینوں کی چھولی ہے۔ باغبان کی آنکھوں میں سرول  
 چھولی ہے۔ حوض باغ آئینہ کی صورت صاف۔ پانی مثل بلور شفاف  
 رویش صاف و پاک۔ پٹریاں بے خس و خاشاک۔ رنگیلے جوان نشاء  
 گلگشت میں خمور۔ بادہ مسرت سے چور۔ لکھنؤ میں ہر گلی کوچہ  
 دعفران زار ہے۔ کیوں نہ ہو؟ آخر مسرت کی بہار ہے۔ یوں تو ہر مسرت  
 طیلے پر تھاپ۔ سارنگی کی چھیڑ چھاڑ اور نغمہ سرائی کا انتظام ہے۔  
 مگر شاہ مینا صاحب کی درگاہ سب میں انتخاب۔ زیار نگاہ خاص دعاء  
 ہے۔ اللہ اکبر! اگر وہ مزار کہیں نوجوانوں کی وہ دھوم دھام ہے۔ کہ  
 جس طنز دیکھئے ار دھام عام ہے۔ غٹ کے غٹ جھوٹ جھوٹ چلے جاتے ہیں

غول کے غول اڑے آتے ہیں۔ وہ بھڑ بھڑکا۔ وہ دھکم دھکا۔ وہ ریل پیل۔ وہ شور و شرکہ الاماں!۔ الجھڑا ایک دوسرے کو رہتا ہے۔ دوسرا میسرے کو دھکیلتا ہے۔ کہیں تو آں حقانی غزلیں گاتے۔ صوفیوں کو وحید میں لاتے ہیں۔ کسی اہل دل کو حال آیا۔ کوئی آتسو بھر لایا۔ ہوشی کا نعرہ بلند ہے۔ سرود و غنا کا لطف دو چند ہے۔ فقط

## برات کی دھوم

ایک رئیس گردوں مدار و امیر بادشاہ کی ایک دختر فرخندہ اختر تھی۔ رئیس موصوف نے اس کو بنا ز و نعم پالا۔ جب لڑکی کچھ سیالی ہوئی تو اس کی شادی کی فکر پیدا ہوئی۔ بڑے بڑے نام بر آوردہ رؤسائے ذوی الاقدار کے ہاں سے پیغام آنے لگے۔ دور دور تک اس کے حسن و جمال کی شہرت ہوئی۔ آخر کار ایک رئیس دالا تبار۔ جمہ اقتدار کے ساتھ نسبت قرار پائی۔ پھر کیا تھا۔ طرفین سے تیاریاں ہونے لگیں۔ اب شوق کی اس درجہ افزائش ہے۔ کہ جی چاہتا ہے۔ سب جمع جہتا لٹا دیں۔ نگہ بند کر کے خرچے لگیں۔ ایک نے اسی ہزار روپیہ قرض لئے۔ دوسرے نے تعلقے کے کوڑے کئے۔ دونوں لنگوٹی پر پھاگ کھیلے لگے۔ جوڑے بنے خدمتگاروں۔ اماؤں۔ اخیلوں۔ نوکروں۔ چاکروں نے بیش بہا جوڑے پھڑکائے۔ خوب انعام و خلعت پائے۔ برات کے دن بڑے کرو فرستے برت بھی گئی۔ دونوں طرف خوب ٹھٹھاٹھ تھے۔ ۵

الماس کے واں تھے چھاڑ فائوں۔ یاں جلوہ فروز تخت طاؤس  
مہتاب سے چاندنی کا واں فرش۔ یاں چرخ سے چرخ ہیں سرعرش

گلگوں تھا کسی کا باد رقتار گل رنگ کسی کا تھا ہوا دار  
 ہاتھی تھے تو مستیوں کی دھن تھی گھوڑے تھے تو چابی کی لک تھی  
 وہ ماہ کہ تھا سوار شدید تھا یا بہ رکاب شوق مہینہ  
 سب سے پہلے نشان کا ہاتھی شب رنگ مست - صورت دیکھے انسان  
 ڈرجائے - اس کے بعد بڑی دور تک جلوس کی بہار - اور سائڈیوں کی قطار  
 تھی - عربی - ترکی - تازی - ویلا - کیپ - انواع و اقسام کے  
 رہوار باد رقتار - خوشترام - ویز لگام ساز دار - سچے سچائے - پرے کے  
 پرے جمائے - چاندی کا گنا پنے - بوسن کی صورت بنائے - چھم چھم کرتے  
 چلتے جاتے ہیں - آرائش کے تخت بڑے صناعان چابک دست کے بنائے  
 ہوئے نطف جلوس دو بالا کرتے تھے - معلوم ہوتا تھا - گلزار ارم کے  
 پھول پھولے ہیں - سرو بنایا - تو نقل کو حمل کر دکھایا - چانڈو بازوں کا  
 سخت قابل دید تھا - کوئی نشے میں مجھوم رہا ہے - کوئی نے گوچوم رہا ہے  
 کوئی گرمٹ تھا ہے غیس ہے - کوئی کنار پلو سنا ہے - بعینہ چانڈو خالے  
 کی تصویر کھینچ دی - جزیرے کا پہلی کا تخت - رہس منڈل دیکھنے سے  
 دل کو سرور حاصل ہوتا تھا - سواروں کا تخت ستم ڈھاتا تھا - سوار خالی  
 دروایاں پیشہ کرچ لٹکائے - گھوڑے کی باگ اٹھائے - دھاوا بولا ہی  
 چاہتے ہیں - قدم قدم پر آفتبازی چھوٹ رہی ہے - انار آسمان کی  
 خبر لاتے ہیں - پھلجڑی کی تعریف میں اچھے اچھے آتش زبانوں کی زبان  
 لال ہے - چرخ کا چکر دیکھ کر عقل چرخ تھی - کامل فن آتش بازوں  
 نے بڑی دلسوزی سے آتش بازی بنائی تھی - انار سے تھنہ درمیں نظر  
 آتا تھا - ہاجے والوں کی جماعت دہل کی دھوم - تماشا بیوں کا ہجوم

گوروں کی لال لال وردیوں سے گل لالہ کھلا تھا۔ تنگوں کی کالی کالی گرتیوں سے حاسدوں کا منہ کالا تھا۔ ایک سمت سے چوہدار عصاے نفرتی لئے پکڑیاں جمائے گھوم رہے تھے۔ دوسری سمت خاص بروار رنگین چھندیاں اٹھائے پھرتے تھے۔ رئیس۔ بھرتی۔ عمائد۔ لائق وغیرہ محدود تھے۔ جملہ سامان لطف و مذاق موجود تھے۔ نوشہ حسین و منہ جبین خلعت بیش بہا زیب تن کئے بصد طنطنہ و دبدبہ گلگون خوش عنال پر سوار تھا۔ گھوڑا ایسا شالیستہ کہ وجودہ پتیا بچہ تنک سوار ہو جائے۔ پاؤں کی سفیدی سے دھن بنا دیا تھا۔

نوشہ کے گھوڑے کے بعد کئی ہاتھی تھے۔ مکنا۔ اور ایک وستا اور دم کٹا اور پاٹھا۔ آن پر دن دن بارہ بارہ۔ چوہ چوہ برس کے لڑکے سوار تھے۔ الغرض خوب چکر کھا کر اور شوخوں کو جگا کر برات دس کے مکان سے تھوڑی دُور پر تھی۔ کہ آتش بازی سے ایک ہاتھی بھڑکا۔ دوسرے نے اس کا ساتھ دیا۔ فیلبان لاکھ تدبیریں کرتا ہے آگس لگاتا ہے۔ مگر وہ بری و دھت۔ میل ایک نہیں سنتے۔ تیسرا ہاتھی لپکا۔ تو ایک بڑھیا پچل گئی۔ ایک ہشتاخہ والا پس گیا۔ دن و کائنات و بالا ہو گئیں۔ گھبراہٹ اور بدحواسی سے پندرہ بیس آدمی زخمی ہوئے۔ اتنے میں آرایش لٹنے لگی۔ ہلڑ ہو گیا۔ برمنڈازوں کی ایک نہیں چلتی۔ آدھے سخت لٹ گئے۔ چھ ٹوپیاں اتر گئیں۔ تین لڑکوں کا زریور اچھوٹا نے ہتھیا لیا۔ ایک کا کان کٹ گیا۔ جلو ناک تو بچی۔ سبارک بارے خدا خدا کر کے دھن کے مکان پر برات پہنچی۔  
در تنک جو برات ادھر سے آئی کی سب نے ادھر سے پیشوا

باران گلاب بارش گل ہو کر بڑھے آگے با شجّل  
 ٹلیاں پئے ٹھیک بو دھول دھا بڑے چکھے پان کے مزیدار  
 جب عقد کی آن کے ساعت آئی دو رشتوں میں اک گرہ لگائی  
 یہاں آزاو گھنٹوں یہ کیفیت چکے چکے دیکھا کئے۔ اور یہ سنو چنے  
 لگے کہ اس قدر زرخیز بے وجہ بلا سبب مفت بیکار ضائع ہوا۔ اور  
 ہزاروں روپیہ غارت کئے۔ اگر یہی زرخیز امور رفاہ عام اور فائدہ  
 انام میں صرف ہوتا۔ تو سبحان اللہ!۔ احمس!۔ احمس!۔ کہ  
 ہندی اس آرائش پر لگتے ہیں۔ ہم نے کہیں سنا نہیں کہ اس فضول  
 و صوم و صوم سے کسی ملک کو فائدہ پہنچا ہو۔

ادبار کا کھٹکا آہٹم و جاہ میں ہے بھاگو بھاگو کہ خون اس راہ میں ہے  
 جاگو جاگو یہ خواب غفلت کیسا دیکھو دیکھو اجل کہیں گاہ میں ہے  
 ایسی برائیاں۔ یہ و صوم۔ یہ روم۔ درو اکیڑ۔ حسرت خیز  
 ہیں۔ مگر اہل ہند ان ہی کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ یہ اسی کو بڑا عروج  
 سمجھتے ہیں کہ تمام عمر کی آمدنی ایک برات کی نذر کر دیں۔ دو گھڑی کی  
 واہ وا۔ اس کے بعد حال تباہ۔ عیاذ باللہ! شادی کو غم سے تبدیل کرنا  
 کون دانائی ہے۔ لیکن جیف! صد جیف! کہ ہم ان امور پر نظر نہیں دالتے

شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی

پیدائش پانی پت ۱۸۳۷ء وفات پانی پت ۱۹۱۴ء

آپ پانی پت ضلع کرناٹک کے ایک معزز خاندان سے ہیں۔ آپ کے  
 بزرگ ہرات سے آئے اور پانی پت اور اس کے طحات مدو معاش کے طور پر

شہابی انعام میں ان کو ملے۔ ۱۸۳۷ء کے قریب آپ وہیں پیدا ہوئے میر محمد  
 دہلوی کے جھتیچے۔ سید جعفر علی سے آپ نے فارسی پڑھی۔ جو  
 اس زمانہ کے اعلیٰ فارسی دانوں میں تھے۔ اور حاجی محمد ابراہیم حسین  
 انصاری سے عربی کی تعلیم پائی۔ ۷۱ سال کی عمر سے آپ اکثر دہلی میں  
 رہے۔ منطق فلسفہ وغیرہ کی وہیں تکمیل کی۔ محققان شباب ہی میں خواب  
 مصطفیٰ خاں شیعہ ریشہ جہانگیر آباد کے صاحبزادوں کی تعلیم  
 آپ کے سپرد ہوئی۔ اس زمانے میں جو کچھ کہا۔ خواب صاحب سے اس میں  
 اصلاح لی۔ اس تعلق سے آپ کو آرزوہ۔ فیروز۔ رحمتاں۔ غالب کی  
 خدمات میں باریابی کے اکثر موقع ملے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ غالب مرحوم کے  
 حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے غالب نے آپ کی طبیعت کا اندازہ کر کے کہا کہ اگر تم شعر  
 نہ کہو گے تو قلم کر دو گے۔ ہرزا غالب کی وفات پر آپ نے اور مرزا قمر بان علی  
 بیگ سالک اور میر مہدی حسین مجروح نے مرثیے لکھے۔ مگر جو  
 مقبولیت آپ کے مرثیے کو حاصل ہوئی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔  
 ابتدا میں آپ کی شاعری کا بھی وہی ایشیائی شاعری کا رنگ تھا۔ جسے ایک  
 بعد جب آپ کو پنجاب صبا ڈپٹی لاہور میں کتابوں کی عمارت زمانہ حال  
 کے مطابق درست کرنے کی خدمت ملی۔ اس وقت مغربی لٹریچر پر غور کرنے کا آپ کو  
 بہت اچھا موقع ملا۔ اسی وقت اس راستہ کو یک کلم ترک کر کے طرز جدید اختیار  
 کیا۔ کہ قلم بالرائے صاحب نے لاہور میں ایک مجلس مشاعرہ قائم کی  
 تھی۔ اس میں بجائے مصرع طرح کے خاص عنوان پر شعرا کو طبع آزمائی کا  
 موقع دیا جاتا تھا۔ مولفانے بھی اس گلشن میں جڑت طرازی کے نئے پھول  
 چنانچہ نشاط امید۔ مناظرہ رحم و انصاف۔ حب  
 وطن۔ برکھارات وغیرہ اسی بزم کی یادگار ہیں۔

جب ڈپو سے تعلق کے ہم سال بعد آپ انگلو عربک اسکول دہلی کے مدرس بن گئے۔ اسی زمانہ میں سر آسمان چاہ کالج بنے دیکھنے کے لئے علی گڑھ آئے۔ مولانا بھی موجود تھے۔ ان کی باریابی ہوئی اور ۵۶ روپیہ ماہوار علمی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ ۱۹۰۷ء میں جب آپ علی گڑھ ڈیپوٹیشن کے ساتھ چمدر آباد گئے۔ اس وقت ثواب سر آسمان چاہ بہادر ملار المہام تھے۔ وہاں آپ نے کئی نظمیں پڑھیں۔ اس وقت وظیفہ میں اضافہ ہو کر سنو روپیہ ماہوار ملنے لگے۔ اس کے بعد ہی آپ بارہ بلاذمت سے سکرموش ہو گئے۔

مولانا اپنے طرز کے موجد اور نچرل اور قومی شاعری کے مجتہد۔ اور ہندوستان کے معجز بیان سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کا کلام صاف صاف دلاؤ۔ قومی اصلاح سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کی نثر کی خصوصیات یہ ہیں کہ الفاظ اور معنی کی خوبصورتی کو برابر لحاظ رکھا ہے۔ کلام میں کہیں اہمال و اشکال نہیں۔ لفظ البتہ بعض جگہ مشکل ہیں۔ سلاست سرسید کے کلام میں بہت زیادہ ہے۔ یا محاورہ اور دلچسپ عبارت کہنے میں پروفیسر آزاد یقینی بالائے ہیں۔ مگر فلسفیانہ اور مورخانہ نظر اور لٹریچر کے رموز پر جس قدر حقیقت مولانا حالی کو بھی سرسید مرحوم وہاں تک نہیں پہنچتے۔

نثر میں حیات سعدی۔ یادگار غالب۔ حیات جاوید متقدم شعور و شاعری اور نظم میں سدس درو جزر اسلام۔ دیوان حالی شکوہ ہند اور بہت سی شہنیاں آپ کی یادگار ہیں۔

شعراء میں گورنمنٹ عالیہ نے مولانا کو شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا۔ جو ان کی علمی خدمات کے اعتبار سے ہر طرح زیبا و مناسب تھا۔ ۱۳۱۰ھ میں مولانا کو داعی اجل کو لبیک کہہ کر اس دار فانی سے چل پے۔ قوی اور

نچول شاعری کا آفتاب غروب ہو گیا۔

## محاورہ اور روزمرہ

محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ بات چیت اہل زبان کے روزمرہ کے موافق ہو۔ خواہ مخالف۔ لیکن اصطلاح میں خاص اہل زبان کے روزمرہ بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ نہیں ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے۔ کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرہ یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے کہ اس کا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو بہتر نہ مفرد کے ہیں۔ کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں۔ جن پر الگ الگ لغت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا بلکہ دونوں کو ملا کر جب پانسات بولیں گے۔ تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ وہ ترکیب جس پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے۔ قیاسی نہ ہو بلکہ معلوم ہو۔ کہ اہل زبان اس کو اس طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پانسات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات تو بولا جائے گا۔ تو اس کو محاورہ نہیں کہنے کے۔ کیونکہ اہل زبان بھی اس طرح نہیں بولتے۔ یا مثلاً بلا ناغہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ناغہ۔ ہر روز کی جگہ ہر دن۔ روز روز کی جگہ دن دن۔ یا آٹے دن کی جگہ کئے روز بولنا۔ ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ یہ الفاظ اس طرح اہل زبان کے بول چال میں کبھی نہیں آتے۔ کبھی محاورہ کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے۔ جو کسی اہم



کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں۔ بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اُتارنا۔ اُس کے حقیقی معنی کسی جسم کو اوپر سے نیچے لانے کے ہیں۔ مثلاً گھوڑے سے سوار کو اُتارنا۔ گھوڑی سے کپڑا اُتارنا۔ کوٹھے پر سے پلنگ اُتارنا۔ لیکن اُن میں سے کسی پر محاورہ کے یہ دوسرے معنی صادق نہیں آتے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں نقشہ اُتارنا۔ نقل اُتارنا۔ دل سے اُتارنا۔ ہاتھ اُتارنا۔ پہنچا اُتارنا۔ یہ سب محاورے کہلائیں گے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اُتارنے کا اطلاقی مجازی معنوں پر کیا گیا ہے۔ یا مثلاً کھانا۔ اس کے حقیقی معنی کسی چیز کو دانٹوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اُتارنے کے ہیں۔ مثلاً روٹ کھانا۔ دوا کھانا۔ اینٹ کھانا۔ وغیرہ لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے معنی کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں غم کھانا۔ قسم کھانا۔ دھوکا کھانا۔ پچھاڑیں کھانا۔ ٹھوکر کھانا۔ یہ سب محاورہ کہلائیں گے۔

محاورہ کے جو معنی ہم نے اوّل بیان کئے ہیں۔ وہ عام یعنی دوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں۔ لیکن دوسرے معنی پہلے معنی سے خاص ہیں پس جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا۔ اُس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے۔ اُس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا یعنی جھگڑنا کرنا اس کو دونوں معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ترکیب اہل زبان کے بول چال کے بھی موافق ہے۔ اور نیز اس میں

تین بلنچ کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں گولا گیا ہے۔ لیکن رُوٹی کھانا۔ یا میوہ کھانا۔ یا پان سات۔ یا دتل بارہ وغیرہ صرت پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پاسکتے ہیں۔ نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے۔ کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اپنی زبان کی بول چال کے موافق تو ضرور ہیں۔ مگر ان میں کوئی لفظ محازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوا۔ آئندہ ہم ان دونوں معنوں میں تیز کے لئے پہلی قسم کے محاورہ پر روزمرہ کا اور دوسری قسم پر محاورہ کا اطلاقی کریں گے۔ روزمرہ اور محاورہ میں من حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو۔ تقریر و تحریر اور نظم و نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے یہاں تک کہ کلام میں جس قدر کہ روزمرہ کی پابندی کم ہوگی۔ اسی قدر فصاحت کے درجہ سے ساقط سمجھا جائے گا۔ مثلاً کلمتہ سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک پختہ سرا اور ایک کوس پر مینار بنا ہوا تھا۔ یہ جملہ روزمرہ کے موافق نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جگہ یہ ہونا چاہئے۔ کلمتہ سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سرا اور کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا۔ یا مثلاً۔ آج تک ان سے ملنے کا موقع نہ ملا یہاں نہ ملا کی جگہ نہیں ملا چاہئے یا وہ خاوند کے مرنے سے درگور ہوئی۔ یہاں دندہ درگور چاہئے۔ یا ۱۰ سو گئے جب سخت تپ بیدار نہ کھیں ہو گئیں یہاں ہو گئیں کی جگہ ہوئیں چاہئے ۲ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا یہاں کیا ہو گیا چاہئے۔

الغرض نظم ہو یا نثر۔ دونوں میں روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو۔ نہایت ضروری ہے۔ مگر محاورہ کا ایسا حال نہیں ہے۔ محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے۔ تو بلاشبہ بہت شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر

کر دیتا ہے۔ لیکن ہر شعر میں محاورہ کا باندھنا ضرور نہیں بلکہ ممکن ہے۔  
 کہ شعر بغیر محاورہ کے بھی وضاحت کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہو۔ اور ممکن ہے  
 کہ ایک لپٹ اور ادنیٰ درجہ کے شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و  
 پاکیزہ محاورہ رکھ دیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے۔  
 گو ہر اشک سے لہری ہے سارا دامن آج کل دامن دولت ہے ہمارا دامن  
 اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا۔ باوجود اس کے شعر تعریف  
 کے قابل ہے۔ دوسری جگہ بھی شاعر کہتا ہے۔

”اُس کا خط دیکھتے ہیں جب جگیا۔ طوطے ہاتھوں کے اڑا کرتے ہیں“

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے۔ نہ مضمون ہے۔ صرف ایک محاورہ بندھا  
 ہوا ہے۔ اور وہ بھی روزمرہ کے خلاف۔ یعنی اڑا جاتے ہیں، کی جگہ اڑا کرتے  
 ہیں۔ محاورہ کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہئے۔ جیسے کوئی خوبصورت عضو۔ بدن  
 انسان میں۔ اور روزمرہ کو ایسا جاننا چاہئے۔ جیسے تناسب اعضا بدن انسان  
 میں جس طرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسن  
 بشری کامل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسی طرح بغیر روزمرہ کی پابندی کے محض  
 محاورات سے چا و بیجا رکھ دیئے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

شعر کے معنوی خوبی کا اندازہ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں کر سکتے  
 ہیں۔ لیکن لفظی خوبییوں کا اندازہ صرف اہل زبان کا حصہ ہے۔ اہل زبان  
 عموماً اُس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جس میں روزمرہ کا لحاظ کیا گیا  
 ہو۔ اور اگر روزمرہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ اُن کو اور  
 بھی زیادہ مزہ دیتی ہے۔ مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق  
 ہے۔ عوام محاورہ یا روزمرہ کے ہر شعر کو سن کر سر و دھننے لگتے ہیں۔

اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی متبدل یا رکیک اور سبک ہو۔ اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سیلفگی سے باندھا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔ جب انہیں اسلوبوں میں وزن کی کھچاوٹ اور قافیوں کا متناسب دیکھتے ہیں۔ اور معمولی بات چیت کو شعر کے تسابیح میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں۔ تو ان کو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مگر خواص کی پسند اور تعجب کے لئے صرف روز مرہ کا وزن کے تسابیح میں ڈھال دینا کافی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک محض تک بندی۔ اور محض معمولی بات چیت کو موزوں کر دینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون معمولی روز مرہ میں کمال خوبی اور صفائی اور بے سٹکلگی سے ادا کیا گیا ہے۔ تو بلاشبہ ان کو بے انتہا تعجب اور حیرت ہوتی ہے کیونکہ فن شعریں اور خاصکر اردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عہدہ مضمون معمولی بول چال اور روز مرہ میں پورا پورا ادا ہو جائے۔ جن لوگوں نے روز مرہ کی پابندی کو سب چیزوں سے مقدم سمجھا ہے۔ ان کے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ تو جا بجا فروگزاشتیں اور کسر نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روز مرہ اور محاورہ میں بھی توڑا اتر جائے۔ تو لا محالہ اس سے ہر صاحب ذوق کو تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً میر انشاء اللہ خاں اس بات کو کہ افسردگی کے عالم میں خوشی اور عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ سخت ناگوار گذرتی ہے۔ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

شعر

نہ چھپاے نکست باو بہاری راہ لگ اپنی کچھ اٹھکیلیاں ٹوٹتی ہیں ہم بڑا بیٹھے ہیں  
یا مثلاً مرزا غالب اٹنے بڑے مضمون کو کہ "میں معشوق کے مکان پر  
پہونچا۔ تو اول خاموش کھڑا رہا۔ پاسبان نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا جب  
معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا۔ اور صبر کی طاقت نہ رہی  
تو پاسبان کے خیاموں پر گر پڑا۔ اب اس نے جانا۔ کہ اس کا مطلب کچھ  
اور ہے۔ اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے۔ دو مصرعوں  
میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔  
گدا بچھ گئے وہ چپ تھا۔ مری جو شامت آ  
یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں۔

روئے سے اور عشق میں بیکار ہو گئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاگ ہو گئے  
قاعدہ ہے۔ کہ جب تک انسان عشق و محبت کو اچھا تا ہے۔ اس کو  
ہر ایک بات کا پاس و لحاظ رہتا ہے لیکن جب راز فاش ہو جاتا ہے۔ تو  
پھر اس کو کسی سے شرم اور حجاب نہیں رہتا۔ اس شعر میں یہی مضمون  
ادا کیا گیا ہے۔ دھویا جانا ہے حیا اور بے لحاظ ہو جانے کو کہتے۔ اور پاک  
آزاد اور شہرے کو کہتے ہیں۔ روئے کے لئے دھویا جانا۔ اور دھوئے  
جانے کے لئے پاک ہونا۔ باوجود اتنی لفظی مناسبتوں اور محاورہ کی نشست  
اور روڑ مڑہ کی صفائی کے مضمون پورا پورا ادا ہو گیا ہے۔ اور کوئی بات  
ان پینچل نہیں ہے۔ یا مثلاً مومن خاں کہتے ہیں۔

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں کھرا گئے کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے  
آنکھیں چرانا۔ اغماض دے تو جی کرنا ہے۔ کھویا جانا، شرمندہ  
اور کھسیانہ ہونا۔ پا جانا، سمجھ جانا۔ یا تاڑ جانا۔ معنی ظاہر ہیں۔ اس شعر

کا مضمون بھی بالکل نیچرل ہے۔ اور محاورات کی نشست اور روز مرہ کی صفائی قابل تشریف ہے۔ اگرچہ اس کا ماخذ مرزا غالب کا یہ شعر ہے۔  
 کہ چہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق بہر ہم ایسے کھوئے چاہتے ہیں کہ وہ پا جائے  
 مگر مومن کا بیان زیادہ صفائی سے بندھا ہے۔  
 الغرض روز مرہ کی پابندی تمام احسانِ سخن میں عموماً۔ اور غزل میں خصوصاً جہاں تک ہوسکے نہایت ضروری چیز ہے۔ اور محاورہ بھی بشرطیکہ سلیقہ سے باندھا جائے۔ شعر کا زیور ہے۔

## نیچرل شاعری

نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے۔ جو لفظاً و معنیٰ دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے موافق ہو۔ لفظاً نیچر کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے۔ کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کے معمولی بول چال کے موافق ہو۔ جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔ کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روز مرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے نیچر یا سکند نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر کہ بے ضرورت معمولی بول چال اور روز مرہ سے بعید ہوگا۔ اسی قدر ان نیچرل سمجھا جائے گا۔ معنیٰ نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے۔ کہ شعر میں ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دنیا میں ہوا کرتی ہیں یا ہونی چاہئیں۔ پس جس شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا۔ وہ ان نیچرل سمجھا جائے گا۔  
 مثلاً میر حسن دہلوی کے یہ اشعار۔

کوئی رکھ کے زیرِ زخماں چھڑی رہی زکس آسا کھڑی کی کھڑی  
 رہی کوئی دانتوں میں اگلی کو لب کسی نے کہا گھر ہوا یہ خراب  
 ان دونوں شعروں کو نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ بیان بھی بول چال کے  
 موافق ہے۔ اور مضمون بھی ایسا ہے کہ جس موقع پر وہ لایا گیا ہے وہاں  
 ہمیشہ ایسا ہی واقع ہوا کرتا ہے۔ یا مثلاً ذوق کا یہ شعر ہے۔  
 رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح  
 اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ عشق میں اور ہر ایک مشکل  
 کے وقت انسان اپنے دل سے اسی طرح مشورہ کیا کرتا ہے۔ یا مثلاً ظفر کا

یہ شعر ہے۔  
 ترے رخسار و گیسو کو بتا شبیبہ زوں کیونکہ نہ ہے لالہ میں رنگ ایسا نہ ہے سبیل میں لونی  
 اس شعر کو بھی نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ عاشق کو فی الواقع کوئی رنگ  
 اور کوئی بومعشوق کے رنگ و بوسے بہتر۔ یا اس کے برابر نہیں معلوم  
 ہوتی۔ یا مثلاً مومن خاں کا یہ شعر ہے۔

”تم مرے پاس ہوتے ہو گو یا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا“  
 یہ بھی نیچرل شعر سمجھا جائے گا۔ کیونکہ جس سے تعلق خاطر بڑھ جاتا  
 ہے۔ اس کا تصور تنہائی میں ہمیشہ پیش نظر رہتا ہے۔ یا مثلاً داغ  
 کے یہ اشعار ہیں۔

”طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی  
 رہیں گی دم مرگ تک خوابیں یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی“  
 ان دونوں شعروں کا مضمون گواہی دوسرے کے ضد معلوم ہوتا ہے  
 مگر دونوں انہی اپنی جگہ نیچرل کے مطابق ہیں۔ فی الواقع ہوا و ہوس کا جھوٹ

بڑے زور شور کے ساتھ سر پر چڑھتا ہے۔ مگر بہت جلد اتر جاتا ہے۔  
اور فی الواقع دنیا کی خواہشوں سے کبھی نیت سیر نہیں ہوتی یا مثلاً  
غالب کا یہ شعر ہے۔

”ریخ سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے ریخ  
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں،  
یہ شعر بھی نیچرل ہے۔ اور فطرتِ انساں کے کسی قدر گہری اور  
پوشیدہ خاصیت کا پتا دیتا ہے۔ جس کے بیان کرے کے بعد کوئی شخص  
اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اوپر کے تمام اشعار جیسا کہ ظاہر ہے۔ ایسے ہیں جن کو لفظاً اور معنی  
دونوں حیثیتوں سے نیچرل کہنا چاہیے۔ اب ہم چند مثالیں ایسی دیتے  
ہیں جن کو لفظاً یا معنی یا دونوں حیثیتوں سے نیچرل نہیں کہا جاسکتا۔  
مثلاً ناسخ کا یہ شعر ہے۔

کبھی ہے دھیانِ عارض کا کبھی یادِ مرثد کو کبھی ہیں خارِ پہلو میں کبھی گلزارِ پہلو میں  
اس شعر کو صرف لفظاً نیچرل کہا جاسکتا ہے۔ لیکن معنی نہیں کہا جاسکتا  
معشوق کے تصور سے بلاشبہ عاشق کو فرحت ہو سکتی ہے۔ اور رنج بھی۔  
لیکن جب فرحت ہو۔ تو عارض اور مرثاں دونوں کے تصور سے فرحت  
ہوتی چاہیے۔ اور جب رنج ہو تو دونوں کے تصور سے رنج ہونا چاہیے۔  
یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ہلکیں جو خار سے مفاہم ہیں۔ ان کے تصور سے پہلو میں  
خار ہوں۔ اور عارض جو گل سے مشابہ ہے۔ اس کے تصور سے پہلو میں  
گلزار ہو یا مثلاً غالب کا یہ شعر ہے۔

نرخ سبجے جو ہر اندیشہ کی گرمی کساں کچھ خیال آیا تھا دشت کا کہ حراجِ گیا



جو ہر اندیشہ میں کیسی ہی گرمی ہو۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس میں  
صحرا اور دی کا خیال آنے سے خود صحرا جل اٹھے۔ یا مثلاً امیر مینائی  
کا یہ شعر ہے۔

کیا نزاکت ہے جو تو طے شاخ گل سے کوئی پھول  
آتش گل سے پڑے چھالے تمھارے ہاتھ میں  
نزاکت کسی درجہ کی کمیوں نہ ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ آتش گل یعنی  
خود گل کے چھوٹنے سے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں۔ یا مثلاً ذوق کا یہ  
شعر ہے۔

دفع ہے جس جا پہ گشتہ سرد مہری کا تری      بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کا فور کا  
سرد مہری میں اتنی ٹھنڈک ہو سکتی ہے۔ جتنی کہ بقطا سرد میں پھر اس کے  
گشتہ کی خاک میں اتنا اثر ہوتا کہ اس سے شجر کا فور پیدا ہو۔ محض الفاظ  
ہی الفاظ ہیں جن میں معنی کا بالکل نشان نہیں۔

ہر زبان میں نیچرل شاعری ہمیشہ قدامت کے حصہ میں رہی ہے۔ مگر  
قدما کے اول طبقہ میں شاعری کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ انھیں  
کا دوسرا طبقہ اس کو سٹول بناتا ہے۔ اور سانچے میں ڈھال کر اس کو  
خوشنما اور دلربا صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ مگر اس کی نیچرل حالت کو  
اس خوشنما اور دلربائی میں بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ ان کے بعد  
متاخرین کا دورہ شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ قدامت کی تقلید سے قدم  
باہر نہیں رکھتے۔ اور خیالات کے اسی دائرہ میں محدود رہتے ہیں۔ جو  
قدما نے ظاہر کئے تھے۔ اور نیچر کے اس منظر سے جو قدما کے پیش نظر تھا۔  
انکھ اٹھا کر دوسری طرف نہیں دیکھتے۔ تو ان کی شاعری رفتہ رفتہ نیچرل

حالت سے تنزل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نیچر کی راہِ راست سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی سمجھنی چاہئے۔ کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم رکھے۔ اور آلو نے ماش یا مونگ پانی میں پھینکے ہوئے کھاتے تھے۔ انھیں پانی میں اُبال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا۔ انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اُسی کو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلو کر اور دال کو دھو کر مناسب مصالح اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی کے پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنی چاہتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی موقع متوجع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا۔ کہ وہ مقدار مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے۔

ایسی مطلب کو ہم دوسری طرح پر دلنشین کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو۔ کہ فارسی زبان میں جس پر اردو شاعری کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جو لوگوں نے اول غزل لکھی ہوگی۔ ضرور ہے۔ کہ انھوں نے عشق و محبت کے اسباب اور وداعی محض نیچر اور سیدھے سادے طور پر معشوق کی صورت حسن و جمال۔ نگاہ اور ناز و انداز وغیرہ کو قرار دینا ہوگا۔ زن کے بعد لوگوں نے انھیں باتوں کو مجاز اور استعارہ کے پیرایہ میں بیان کیا۔ مثلاً نگاہ و ابرو یا غمزہ و ناز و ادا کو مجازاً چرخ و شمشیر کے ساتھ تعبیر کیا۔ اور اس جدت و تازگی سے وہ مضمون زیادہ لطیف و بامزہ ہو گیا۔ متاخرین جب اسی مضمون پر پل پڑے۔ اور ان کو قدما کے استعارے سے بہرہ کوئی اور استعارہ ہاتھ نہ آیا۔ اور جدت پیدا کرنے کا

خیال دامنگیر ہوا۔ اُنہوں نے تیغ و شمشیر کے حمازی معنوں سے قطع نظر پی  
اور اُس سے خاص سروہی یا اھیل تلوار مرو لینے لگے۔ جو قبضہ یا ہاڑ۔  
پیلا۔ آب اور تاب اور ڈاب سب کچھ رکھتی ہے۔ میان میں رہتی ہے۔  
لگے میں حامل کی جاتی ہے۔ زخمی کرتی ہے۔ ٹکڑے اُڑاتی ہے۔ سر اُتارتی  
ہے۔ خون بہاتی ہے۔ چورنگ کاٹتی ہے۔ اُس کی دھار تیز بھی ہو سکتی  
ہے۔ اور کند بھی۔ قاتل کا ہاتھ اُس کے مارنے سے تھک سکتا ہے۔ وہ  
قاتل کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر سکتی ہے۔ اُس کے مقتول کا مقدمہ عدالت  
میں دائر ہو سکتا ہے۔ اُس کا قصاص لیا جاسکتا ہے۔ اُس کے وارثوں کو  
خون بہا دیا جاسکتا ہے۔ غرضکہ جو خواص ایک لوہے کی اصلی تلوار میں  
ہو سکتے ہیں۔ وہ سب اُس کے لئے ثابت کرنے لگے۔

یا مثلاً اگلوں نے کسی پر عاشق ہو جانے کو مجازاً دل دادوں یا دل  
باختن یا دل فروختن سے تعبیر کیا تھا۔ رفتہ رفتہ متاخرین نے دل کو  
ایک ایسی چیز قرار دے لیا۔ جو کہ مثل ایک جواہر یا ایک پھل کے ہاتھ  
سے چھینا جاسکتا ہے۔ واپس لیا جاسکتا ہے۔ کھویا اور پایا جاسکتا ہے  
کبھی اُس کی قیمت پر تکرار ہوتی ہے۔ سودا بنتا ہے تو دیا جاتا ہے۔  
ورنہ نہیں دیا جاتا۔ کبھی اُس کو معشوق عاشق سے لیکر کسی طاق میں  
ڈال کر بھول جاتا ہے۔ اتفاقاً وہ عاشق کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور  
وہ آنکھ بچا کر وہاں سے اُڑا لاتا ہے۔ پھر معشوق کے ہاں اُس کی  
ڑھنڈیا پڑتی ہے۔ اور عاشق اُس کی رسید نہیں دیتا۔ کبھی وہ پاروں  
کے جلسہ میں آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ سارا گھر  
چھان مارتے ہیں۔ کہیں پتہ نہیں لگتا۔ اتفاقاً معشوق جو پاروں میں کنگھی

کرتا ہے تو وہ جوں کی طرح چھڑ پڑتا ہے کبھی وہ ایسا تپٹ ہو جاتا ہے کہ زلف یار کی ایک ایک ٹسکن اور ایک ایک لٹ میں اُس کی تلماش کی جاتی ہے۔ مگر کہیں کچھ سراغ نہیں ملتا۔ کبھی وہ بیچ باخیا کے تالہ سے یار کے ہاتھ اس شرط پر فروخت کیا جاتا ہے۔ کہ پسند آئے تو رکھنا ورنہ پھیر دینا۔ اور کبھی اُس کا بیلام بول دیا جاتا ہے کہ جو زیادہ دام لگائے۔ وہی لیجائے۔

یا مثلاً اگلوں نے معشوق کو اُس لئے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار کرتا ہے مجازاً صیاد باندھا تھا۔ پچھلوں نے رفتہ رفتہ اس پر تمام حاکم حقیقی صیاد کے مترتب کر دئے۔ اب وہ کہیں حال لگا کر چڑیاں پکڑتا ہے۔ کہیں اُس کو تیر مار کر گراتا ہے۔ کہیں اُن کو زندہ پتھڑے میں بند کرتا ہے۔ کہیں اُن کے پر توڑتا ہے کہیں اُن کو فوج کر کے زمین پر تھپاتا ہے۔ جب کبھی وہ تیر و کمان لگا کر جنگل کی طرف جا نکلتا ہے تمام جنگل کے بچھی اور پھیر و اُس سے پناہ مانگتے ہیں۔ سسکڑوں پرندوں کے کباب لگا کر کھا گیا۔ بیسیوں پنجرے قمریوں اور کبوتروں اور کوؤں اور بٹیروں کے اُس کے دروازے پر لٹکے رہتے ہیں۔ سارے چڑی مار اُس کے آگے کان بکڑتے ہیں۔

یا مثلاً اگلوں نے عشق الہی یا محبت روحانی کو جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ مجازاً شراب کے نشے سے تعبیر کیا تھا۔ اور اس مناسبت سے جام و صراحی۔ خم و پیما۔ ساقی و نے فروش وغیرہ کے الفاظ بطور استعارہ کے استعمال کئے تھے۔ یا محض شعراء متصوفین نے شراب کو اس وجہ سے کہ وہ اِس دارالضرور کے

تعلقات سے تھوڑی دیر کو فارغ الہال کرنے والی ہے۔ بطور تقاول کے محصل  
 الی المطلوب قرار دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اور اُس کے تمام لوازمات اپنے  
 حقیقی معنوں میں استعمال ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مشاعرہ بلا مبالغہ کلال  
 کی دکان بن گئی۔ ایک کتنا ہے لا۔ دوسرا کتنا ہے اور لا۔ تیسرا کتنا ہے  
 پیالہ نہیں تو آؤک ہی پلا۔ کچھ بہک رہے ہیں۔ کچھ ہچکار رہے ہیں۔  
 کوئی واعظ پر پھبتی کہتا ہے۔ کوئی تراہد کی ڈاڑھی پر ہاتھ لپکاتا ہے۔  
 کوئی شیخ کی بگڑی اچھالتا ہے۔ جوان بوڑھے۔ جاہل اور عالم رند اور  
 پارسا سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جو ہے۔ نشہ کے طار میں  
 انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جلدھر دیکھو۔ العطش العطش کی ہچکار ہے۔  
 اسی طرح متاخرین نے ہر مضمون کو جو قدما نیچل طور پر باندھ گئے  
 تھے نیچر کی سرحد سے ایک دوسرے عالم میں پہنچا دیا۔ معشوق کے دین کو  
 تنگ کرتے کرتے صفحہ روزگار سے یک قلم مٹا دیا۔ کمر کو چلی کرتے کرتے  
 بالکل معدوم کر دیا۔ زلف کو دراز کرتے کرتے عمر خضر سے بڑھا دیا تنگ  
 کو بڑھاتے بڑھاتے خدا سے بھی بدگمان بن گئے۔ جدائی کی رات کو  
 طول دیتے دیتے ابد سے جا بھڑایا۔ الغرض جب کچھ اُنھیں مضامین  
 کو جو اگلے باندھ گئے ہیں۔ اوڑھنا اور بچھوٹا بنا لیتے ہیں۔ تو اُن کو  
 مجبوراً نیچل شاعری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔  
 اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے۔ کہ متاخرین کی شاعری ہمیشہ اُن  
 نیچرل ہوتی ہے۔ نہیں بلکہ ممکن ہے۔ کہ متاخرین میں کچھ ایسے لوگ بھی  
 ہوں۔ جو قدما کی جولا نگاہ کے علاوہ ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی  
 کریں۔ یا اسی جولا نگاہ کو کسی قدر وسعت دیں۔ یا زبان میں تسنیت

مستفہدین کے زیادہ گھلاوٹ اور گونج وسعت اور صفائی پیدا کر لیں۔  
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ لکھنؤ میں میرا بیس نے مرثیہ کو بے انتہا  
ترتی دی ہے۔ اور نواب مرزا شوق نے مثنوی کو زبان اور  
بیان کے لحاظ سے بہت صاف کیا ہے۔ اسی طرح دلی میں ذوق۔  
ظفر۔ اور خاصکر داغ نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت و  
صفائی اور ہانپن پیدا کر دیا ہے۔

### مرزا اسد اللہ خاں غالب کی اردو نثر پر ریلو

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا شمس الدین علیہ السلام تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت  
کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر  
بامور کئے گئے۔ اور ہمہ تن مہر نیکروز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔  
اُس وقت بضرورت اُن کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔  
وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط۔ جن میں قوت متحیلہ کا عمل اور  
شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے۔ نہایت  
کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُن کی بہت مہر نیکروز کی ترتیب و  
انشا میں مصروف تھی۔ ضرور ہے۔ کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں  
خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنے طرز خاص میں شائق معلوم ہوئی  
ہوگی۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے۔ کہ انہوں نے غالباً شمس الدین علیہ السلام کے بعد  
سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط  
میں لکھتے ہیں۔ کہ ”فارسی زبان میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک  
ہے پیرانہ سری اور ضعف کے صدیوں سے محنت پر ڈوہی اور جگر

کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریبی کو زوال ہے۔ اور یہ حال ہے۔

بمضحل ہو گئے تو سب غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں غالباً اردو زبان میں تحریر اختیار کرنے کو مڑانے اول اول اپنی شان کے خلاف سمجھا ہو گا۔ مگر بعض اوقات انسان اپنے جس کام کو حقیر اور کم وزن خیال کرتا ہے۔ وہی اس کی شہرت اور قبولیت کا باعث ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے۔ مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے۔ ویسی نظم اردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ لوگ عموماً مرزا کو فارسی کا بہت بڑا شاعر جانتے تھے۔ اور اُن کی اردو زبان کو بھی ایک عالی رتبہ کلام عام انعام سے بالاتر سمجھتے تھے مگر لوگوں کا ایسا خیال کرنا محض تقلید تھا۔ نہ تحقیقاً۔ وہ خود اپنے ایک مرثیہ داں اور پایہ شناس دوست کو خط میں لکھتے ہیں "میرے فارسی قصیدے کہ جن پر محکو ناز ہے۔ کوئی اُن کا لطف نہیں اُٹھاتا۔ مگر بطریق اذعان۔ کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا تھا۔ داد سخن کہاں؟ اور ادراک پایہ معنی کہاں؟۔ مہر نیمروز کے یا اسات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں۔ میری خاطر نہ کیجئے۔ انصاف سے کہئے۔ کہ یہ نثر کہیں اور ہے۔ اور پھر اُس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو گا۔"

اگرچہ مرزا کی اردو نثر کی قدر بھی جیسی کہ چاہئے۔ ویسی نہیں ہوئی چنانچہ بعض اوقاف نثریوں میں دیکھا گیا۔ کہ اردو کے معالی اور ہندوستان خیال کی عبارت کو ایک مرتبے میں رکھا گیا ہے۔ لیکن پھر بھی مرزا کی اردو نثر کے قدر داں بہ نسبت ناقدر داںوں کے ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے

مرزا کی اردو نثر میں زیادہ تر خطوط و رفعات ہیں۔ چند تقریظیں اور دیباچے ہیں۔ اور قین مختصر رسالے ہیں۔ جو برہان قاطع کے طغاراوں کے جواب میں لکھے ہیں۔ لطائف غیبی۔ بیچ تیز اور نامہ غالب اس کے سوا چند اجزا ایک نامہ تمام قسط کے بھی ہیں۔ جو مرزا نے مرلے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور لطیف انگیزہ ان کے خطوط ہیں۔ جن میں زیادہ تر اردو کے معانی میں اور اس سے کم عموماً ہندی میں جمع کر کے چھپوائے گئے ہیں۔

مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے بڑا لاپے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا۔ اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہو سکی۔ انھوں نے انقب و آداب کا پڑانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں۔ جن کو مترسین نے لازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا۔ مگر درحقیقت فضول اور سہوہ الزکار تھیں سب اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میان۔ کبھی ہرغور وار۔ کبھی بھائی صاحب۔ کبھی ہمارا ج۔ کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں۔ اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے برسرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ادائے مطلب کا طریقہ بالکل ایسا ہے۔ جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً ان کو یہ لکھنا تھا کہ محمد علی بیگ میرے کوٹے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا۔ کہ لوہار کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ اس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا۔ کہ آج نہ جائیں گی؟ اس نے کہا آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو



انہوں نے اس طرح ادا کیا ہے۔ ”محمد علی بیگ اومر سے نکلا۔“ بھئی  
 محمد علی بیگ! لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟ حضرت! ابھی نہیں  
 کیا آج نہ جائیں گی؟ ”آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے۔“  
 میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے۔ اس میں لکھنا یہ ہے کہ  
 میرن صاحب آئے۔ اور ان سے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح  
 نہیں لکھتے بلکہ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔

”اے میرن صاحب! السلام علیکم“ حضرت! ”آداب“ کو صاحب! آج  
 اجازت ہے۔ میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ ”محظورا میں  
 کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا  
 ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟“ نہیں میرن صاحب! اس کے خط  
 کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خطا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا  
 ضرور ہے۔“ حضرت! وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خطا کیا ہوں گے؟  
 ”بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ۔ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے  
 ہو؟“ سبحان اللہ! اے میرن صاحب! آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھ سے  
 فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے؟ اچھا تم باز نہیں رکھتے۔ مگر یہ کہو۔ کہ  
 تم کیوں نہیں چاہتے۔ کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟ ”کیا عرض  
 کر دوں سچ تو یہ ہے۔ کہ جب آپ کا خط جاتا۔ اور وہ پڑھا جاتا۔ تو میں  
 سنتا۔ اور حقا اٹھاتا۔ آپ جو ہیں وہاں نہیں ہوں۔ تو نہیں چاہتا۔ کہ  
 آپ کا خط جائے۔ میں اب پشیمانی کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے  
 تین دن بعد آپ خط سون سے لکھے گا۔“ ”میاں! بیٹھو۔ ہوش کی خبر تو  
 تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی۔ بھولا

آئی۔ تجھاری باتوں میں آگیا۔ اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لاجل  
ولا قوتہ۔ اس کے بعد میر محمدی سے خطاب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں۔  
بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے اس کو غائب فرض کر لیتے  
ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں۔ وہ اس کو  
مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر محمدی کو لکھتے ہیں۔ میر محمدی  
جیسے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں عبارت اردو لکھنے کا کیا اچھا ٹوھنگ  
پیدا کیا ہے۔ کہ مجھ کو رشک آئے لگا ہے۔ سنو۔ ولی کے تمام مال و متاع  
و زر و گوہر کی ٹوٹ پھاپ احاطے میں گئی ہے۔ یہ مرزا عبارت خاص مرزا  
دولت تھی۔ شو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا ٹوٹ  
لے گیا۔ مگر میں نے اس کو بچل لیا۔ اللہ برکت دے۔

ظاہر ہے۔ کہ اس عبارت میں ایک ظالم سے مراد خود میر محمدی مجروح  
ہیں۔ کیونکہ قدر کے بعد وہ پانی پت کے محلہ مذکور میں کئی سال مقیم  
رہے تھے۔ مگر جو لوگ مرزا کی انکھیلی جالوں سے ناواقف ہیں وہ غلطی  
سے اس کے دوسرے معنی سمجھ لیتے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ  
راقم بھی پانی پت انصاری محلے کا رہنے والا ہے۔ ان الفاظ سے  
یہ دھوکا ہوا ہے۔ کہ مرزا صاحب نے میری نسبت لکھا ہے۔  
اور لطف یہ ہے کہ میں نے جس قدر ان کو سمجھا یا۔ کہ یہ خود میر محمدی  
ہی کی نسبت لکھا ہے۔ میری نسبت نہیں لکھا۔ اسی قدر ان کو اس  
بات کا زیادہ خیال ہوا۔ کہ میں ازراہ کسر نفسی کے ایسا کہتا ہوں۔  
مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں۔ ان میں اکثر اس قسم کے  
سوال و جواب ہوتے ہیں۔ جیسے کہ مرزا کی تحریروں میں ہم اوپر

دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں پر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُن کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دی جاتی ہے۔ ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا۔ اور جواب کہاں سے شروع ہوا مرزا ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے۔ اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال و جواب کے اخص میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں۔ جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ سوال کیا ہے۔ جواب کیا۔ شاید قصے یا ناول میں یہ بات نہ چل سکے۔ مگر خطوط میں تو مرزائے یہ راہ بالکل صاف کر دی ہے۔

مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ کہ اور لوگ اُس کی پیروی نہ کر سکیں۔ مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ شوخی تحریر ہے۔ جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے چل نہیں پڑتی ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بعض لوگوں نے خط و کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی اور ظرافت پر رکھنی چاہی ہے۔ مگر اُن کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے۔ جو اصل اور نقل یا روپ اور بہروپ میں ہوتا ہے۔ مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سر بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور تھوٹے متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے۔ اُس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی۔ جو تھوٹے پرواز کو طائر کے ساتھ۔ اگرچہ مرزا کے بعد نشرِ اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے۔ علمی۔ خلاقی۔ پولیٹیکل۔ سوشل۔ اور لیجسلیٹو کے لوگوں نے دیرِ بہا دے دی ہے۔

بایزگرافی اور نودل میں بھی متعدد کتابیں نہایت ممتاز لکھی گئی ہیں۔ باوجود اس کے مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بہ لحاظ دیکھی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو ٹھیکہ مخلوط اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا۔ اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیان کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اس میں ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی۔ اور اب جوان ہو گئی ہے۔ بعد وعا کے لکھتے ہیں۔ کیوں بھئی!۔ اب ہم اگر کولی آئے بھی۔ تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھلیچیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟ یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں کو جو اب رئیس لوہارو ہیں۔ ان کے بچپن کے زمانے میں ان کے رتھے کا جواب جس میں مرزا کو دادا صاحب لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں۔ اے مردم چشم جہاں ہیں غالب!۔ پہلے القاب کے معنی سمجھ لو۔ یعنی چشم جہاں ہیں۔ غالب کی پتی۔ چشم جہاں ہیں تمہارا باب مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر۔ اور اپنی تم۔ میاں تمہارے دادا تو نواب امیر الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمہارا دل دادہ ہوں۔

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۷ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انھوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۷ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا۔ اس کے جواب میں ان کو اس طرح لکھتے ہیں۔ دیکھو صاحب!۔ یہ باتیں سب کو

پسند نہیں۔ ۱۵۵۷ء کے خط کا جواب ۱۵۵۸ء میں بھیجے ہو۔ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا۔ تو یہ کہو گے۔ کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔“

ایک دوست کو رمضان میں خط لکھا ہے۔ اُس میں لکھتے ہیں۔ دھوب بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بھلاتا رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بھلاتا ہوں۔ اور یہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھتا اور چیز ہے۔ اور روزہ بھلانا اور بات ہے۔

جس زمانے میں پرہیز قاطع پر اعتراض لکھے ہیں۔ اور لوگوں مزا کی سخت مخالفت اور مؤلف پرہیز کی حمایت کی ہے۔ ایک خط میں صاحب پرہیز کا ذکر کرنے کے بعد اُس کی اور اُس کے طرفداروں کی نسبت لکھتے ہیں۔ اُن فریبگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے۔ جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا۔ وہ لکھ دیا۔ اِطامی و سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فریب ہو۔ تو ہم اُس کو مانیں۔ ہندوؤں کو کیونکہ مسلم اہل بیت جانیں۔ ایک گائے کا بچہ بزرگ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا۔ نبی اکرم اسیل اُس کو خدا جیسے ایک خط کے آخر میں جو ثواب علماء الدین خاں کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں۔ استاد مہر جان کو اس راہ سے کہ میری پچھی اُن کی چچی تھیں۔ اور یہ خجہ سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ دعا۔ اور اُس رُوسے کہ دوست ہیں۔ اور دوستی میں کئی بیسی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے سلام۔ اور اِس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں۔ ہندگی درود۔“

ایک خط میں برسات کی شدت کا ذکر کرتے کرتے لکھتے ہیں۔ دیوان خاں کا حال مجلس اسے سے بدتر ہے۔ میں مرتے سے نہیں ڈرتا۔ فقط ان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ ابرو کو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔

نواب علاء الدین خاں اور ان کے والد نواب امین الدین خاں میں کچھ شکر بچی ہے۔ باپ ولی آئے ہیں۔ اور بیٹے کو دیوار چھوڑ آئے ہیں۔ مرزا نواب علاء الدین خاں کو خط میں لکھتے ہیں۔ سنا گیا کہ نواب امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹلی میں مزدور اجلاں کیا۔ پر دن رہے ازراہ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے انھیں پوچھا۔ کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے۔ کہ جب میں یہاں آیا۔ تو کوئی وہاں بھی تو رہے۔ اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ اتنا ہی جتنا تم اس کو چاہتے ہو۔۔۔ سننے لگے۔ غرض کہ میں نے بظاہر ان کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں کے (یعنی احمد بخش خانیوں کے) دلوں کا اللہ مالک ہے۔

ایک دفعہ کثرتِ اخراجات سے تنگ آکر بعض ضروری خرچ بند کر دئے ہیں۔ یہاں تک کہ شراب پینا بھی چھوڑ دیا ہے۔ نواب علاء الدین خاں نے اپنے والد کے اشارے سے اس کا سبب دریافت کیا۔ اور مولوی حمزہ خاں کی طرف سے بطور نصیحت کے مرزا صاحب کو شعر لکھا ہے۔ چوں پر شدی حافظ از میکدہ بیروں شوہ اس کا جواب اس طرح لکھتے ہیں۔ بھائی تو سلام کنا۔ اور کنا۔ کہ صاحب! وہ دمانہ نہیں ہے۔ وہ متحضر اس سے قرض لیا۔ ادھر درباری مل کو جا مارا۔ ادھر

خوب چند۔ چین سکھ کی کوٹھی جا ٹوٹ۔ ہر ایک پاس ششک مہری  
 موجود شہد لگاؤ اور جاؤ۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھکر یہ بات کہ رطل  
 کا خرچ بالکل پھینچی گئے سر۔ با ایں ہمہ کبھی خال نے کچھ دیدیا کبھی  
 اور سے کچھ دلوادیا۔ کبھی ماں نے کچھ آکرے سے بھیجیدیا۔ اب میں اور  
 پاسٹھ روپے آٹھ آنے کا کٹڑی کے۔ سو روپے رام پور گئے۔ قرض  
 دینے والا ایک مختار کار۔ وہ سو ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول تین قسط  
 اس کو دینی پڑی۔ آٹھ مہس جڈا۔ چوکیدار جڈا۔ سود جڈا۔ مول جڈا۔  
 بی بی جڈا۔ بچے جڈا۔ شاگرد پیشہ جڈا۔ آمد وہی ایک سو پاسٹھ تنگ  
 آگیا۔ گڈا مشکل ہو گیا۔ روز مرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟  
 کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قدر درویش بجاں درویش۔ صبح کی بترید  
 متروک۔ چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب و گلاب موقوف پیش  
 بائیں روپے کی منہائی۔ روز مرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا۔ بترید  
 شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا۔ کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے، پوچھا  
 کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا۔ کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔  
 بارے۔ مہینہ پورا نہیں گذرا تھا۔ کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری کے  
 اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا خیر ہو۔ صبح کی بترید  
 رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ چونکہ بھائی نے وجہ  
 موقوفی و بجالی پوچھی تھی۔ اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا۔  
 ایک خط میں تعلقات خانہ داری کی اس طرح شکایت کرتے ہیں۔  
 مہسنو! عالم دلو ہیں۔ ایک عالم ارواح۔ اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم  
 ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے۔ مَلِكُ الْمَلِكِ الْيَوْمِ

اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے۔ **لِلّٰہِ الْوٰجِدُ الْقَهَّارُ**۔ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے۔ کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے۔ کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں زونیکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا۔ سالوں رجب ۱۳۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بٹری میرے پاؤں میں ڈال دی کہ اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا۔ اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نشر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس ابلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پابان کار مجھے قائلیت سے پکڑ لائے۔ اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے تو ہتکڑیاں اور بڑھادیں۔ پاؤں بٹری سے نوکار۔ ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار مشقت مقررری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت زائل ہو گئی۔ بے چارہوں سال گذشتہ بٹری کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بٹھا گا۔ میرے گھر۔ مراد آباد ہوتا ہوا۔ راہ پور ہو چکا۔ کچھ دیر کم دو مہینے وہاں رہا تھا۔ کہ پھر کچھ آیا۔ اب عہد کیا۔ کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھالوں کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھے کب صادر ہو۔ ایک تعینات سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بعد نجات سپدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا۔

الغرض ہر راز کے خطوط و رفقات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے جن میں اس قسم کی غرافت اور منسی کی باتیں مندرج نہوں۔ یہاں تک



کہ بیچ وافر دگی کا بیان بھی اس قسم کی چھپر چھاڑ سے خالی نہیں ہوتا۔  
 منشی بنی بخش مرحوم کو لکھتے ہیں۔ ”بھائی صاحب! میں بھی تمھارا  
 ہمدرد ہو گیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸۔ ربیع الاول کو شام کے وقت  
 میری وہ کھچھی۔ کہ میں نے بچپن سے کچ تک اس کو ماں سمجھا تھا۔ اور  
 وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی۔ مرغی۔ آپ کو معلوم رہے۔ کہ بچوں میں  
 گویا نو آدمی مرے۔ تین پٹھیاں اور تین چچا اور ایک بابا اور ایک دادی  
 اور ایک دادا۔ یعنی اس مرحومہ کے ہونٹے سے میں جانتا تھا۔ کہ یہ نو آدمی  
 زندہ ہیں۔ اور اس کے مرنے سے جانا۔ کہ یہ نو آدمی کچ ایک بار مر گئے۔“  
 فتح دہلی کے بعد جو شہر میں سٹاٹا ہو گیا ہے۔ اس کی کیفیت ایک  
 خط میں منشی ہر گویاں لکھتے کہ اس طرح لکھتے ہیں۔ ”صاحب!۔ تم  
 جانتے ہو۔ کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اور کیا موقع ہوا۔ وہ ایک جنم تھا۔  
 کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں  
 معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کئے۔ اسی زمانے  
 میں ایک اور بزرگ تھے۔ کہ وہ ہمارے تمھارے دوست۔ اور منشی بنی بخش  
 اس کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ اشخاص  
 نہ وہ معاملات۔ نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر  
 دوسرا جنم ہو گیا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی  
 ایک خط میں نے منشی بنی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب تجو  
 آیا۔ اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی مرحوم بہ منشی ہر گویاں و تخلص  
 یہ لکھتے ہو۔ کچ آیا۔ اور جس شہر میں میں ہوں۔ اس کا نام بھی دہلی  
 اور اس محلے کا نام بھی پٹی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک دوست

اس جہنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ! ڈھونڈو گئے کو مسلمان  
اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب۔ کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں۔  
تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔  
بعض خطوط میں یاس و حسرت و افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی اور  
بے اعتباری کا بیان نہایت مؤثر طریقے میں کیا ہے۔ جس سے ان کے  
خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً۔

ایک خط میں لکھتے ہیں "نا توانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے ٹکھا کر دیا۔  
ضعف۔ سستی۔ کاہلی۔ گراں جانی۔ رکاب میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے  
بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زاو راہ موجود نہیں۔ محالی ہاتھ جاتا ہوا  
اگر نا پسیدہ بخش دیا۔ تو خیر۔ اگر باز پرس ہوئی تو سفر مقرر ہے۔ اور بادیر  
زاویر ہے۔ دوندخ جاوید ہے۔ اور ہم ہیں۔ ہر کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔  
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے۔ مرنے کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے  
ایک اور خط میں منشی ہر گو مال کو لکھتے ہیں "تم مشفق سخن کر رہے  
ہو۔ اور میں مشفق فنا میں مستغرق ہوں۔ بو علی سیستانا کے علم اور نظیری  
کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موزوم جانتا ہوں۔ زیست یسر کرنے کو  
کچھ تھوڑی سی راحت و رکار ہے۔ باقی احکمت اور سلطنت اور شاعری اور  
ساحری سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا۔ تو کیا ہے۔ اور  
مسلمانوں میں بنی ہوا۔ تو کیا ہے دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا ہے۔ اور گم  
نام چئے۔ تو کیا ہے۔ کچھ معاش ہو۔ کچھ صحت جسمانی۔ باقی سب وہم ہے۔  
اسے یار جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے۔ مگر میں ابھی اسی پایہ پر ہوں۔  
شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اٹھ جائے۔ اور وجہ معیشت اور صحت و

راحت سے بھی گذر جاؤں۔ عالم بے رنگی میں گذر پاؤں۔ جس سناٹے میں ہوں۔ وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں سیراب ہے۔ نہتی نہیں بند ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ ماما کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور نہ ہوئے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا؟

ہر ژا نے بعض اردو خطوط میں اور خاصہ اردو تقریظوں میں مسجع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ایسا التزام محکمات بارہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اردو جو بمقابلہ عربی یا سنسکرت وغیرہ کے ایک نہایت محدود زبان ہے وہ اس قسم کے تصنیع اور ساختگی کی مطلقاً نہیں معلوم ہوتی۔ مگر مرزا نے جس قسم کی مسجع عبارت اردو خطوط یا تقریظوں وغیرہ میں لکھی ہے۔ اس پر یہ گرفت مشکل سے ہو سکتی ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مسجع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے۔ کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی رعایت سے خواہ مخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تو اس میں تصنیع اور آورو کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرے فقرہ کم وزن ہو جاتا ہے۔ مگر مرزا کی مسجع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی سبب تکلفی پائی جاتی ہے۔ جیسی پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اس شخص سے بن پڑتی ہے۔ جو باوجود خوش سلیقگی اور لطف طبیعت کے شاعری میں غایت درجہ کا کمال رکھتا ہو۔ اور وزن و قافیہ کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کر چکا ہو۔ یہاں اس کی مثالیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرزا کے اردو رقعات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ مگر

معلوم رہے کہ متفقہ عبارت مرزا خاصکر ان خطوں میں لکھتے تھے جن سے ہنسی ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ورنہ وہاں کا ایمان۔ مصائب کا ذکر۔ یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار۔ ہمیشہ سید صی ساوی نشر عاری میں کرتے تھے۔ مثلاً سید یوسف مرزا کو ان کے باپ کی تعزیت میں لکھتے ہیں۔

یوسف مرزا کیونکر نہ کچھ لکھوں۔ کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو؟ مگر صبر۔ یہ ایک پیشوہ فرسودہ ابنائے روڈ گار ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ اور یہی کہا کرتے ہیں۔ صبر کرو۔ ہائے۔ ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اس سے کہتے ہیں۔ کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پیٹے بیٹھا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔ بھاری داوی لکھتی ہیں۔ کہ ربانی حکم ہو چکا تھا۔ اگر یہ بات سچ ہے۔ تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا۔ نہ قید حیات رہی۔ نہ قید فرگاہ۔

انہیں کو بیٹے کی تعزیت اس طرح لکھتے ہیں۔ اے میری جان بابا۔ میری آنکھ۔ وہ خدا کا مقبول بندہ تھا۔ وہ اچھی روح اور اچھی قسمت لے کر آیا تھا۔ یہاں رہ کر کیا کرتا؟ ہرگز غم نہ کرو۔ اور اگر ایسی ہی اولاد کی خوشی ہے۔ تو ابھی تم خود نیچے ہو۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اولاد بہت نانا۔ نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ وہ اپنی اہل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے۔ کہ وہ

اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو دکھوتے۔ ہاں مظفر الدولہ کا غم بوجہ  
واقعات گر بلائے معطل ہے۔ یہ داغ جیتے جی نہ مٹے گا۔  
ہر زمانے چند تقریظیں اور دیباچے بھی اردو زبان میں کیے ہیں۔  
اور ان سب میں مسیح اور مقفے عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے جو بے تکلفی۔  
اور صفائی ہر زمانے کے خطوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ ان تقریظوں اور  
دیباچوں میں نہیں ہے۔ خصوصاً مسیح کی روایت نے ان میں آورد اور  
تقصیح کا رنگ زیادہ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن ہر زمانے کو اس میں معذور سمجھنا  
چاہئے۔ جو لوگ تقریظوں اور دیباچوں کی فرمائش کرتے تھے۔ وہ بے تکلفی  
بارودہ کے ہرگز خوش ہونے والے نہ تھے۔ جو طریقہ اس زمانے میں رائج ہو  
لکھنے کا بھلا ہے۔ اس کو آپ بھی بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں۔ اور ہر زمانے  
کے وقت میں تو اس کا کہیں نام و نشان ابھی نہ تھا۔ ہاں ہمہ ان میں  
سے بعض تشریں ہر زمانے کی روش خاص میں نہایت ممتاز ہیں۔

## شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

پیدائش اعظم گڑھ ۱۸۵۷ء وفات اعظم گڑھ ۱۹۱۴ء

آپ ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک مشہور خاندان میں پیدا ہوئے  
آپ نے منطق فلسفہ ادب مشہور ادیب مولوی محمد فاروق صاحب جمیل  
سے حاصل کیا۔ اور علم حدیث مولوی حافظ احمد علی صاحب محدث سہارنپور  
سے۔ اور فقہ مولوی ارشد حسین صاحب سے اور تفسیر اور کچھ علم ادب  
مولوی فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے اخذ کیا۔ ۱۷ سال کی عمر میں  
آپ نے درج نظامیہ سے بالکل فراغت حاصل کر لی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد چند روز آپ ایمن عدالت دیوانی رہے۔ یہ ملازمین ہندوستانی۔ کچھوڑ کر علی گڑھ چلے گئے۔ وہاں سمیع اللہ خاں صاحب کی سفارش سے سمر سید نے آن کو کالج کی پروفیسری عنایت کی۔ ۱۹ برس تک کالج سے یہ تعلق آپ کو رہا۔ اسی زمانے میں پروفیسر آر ٹالڈ نے آپ کو علوم جدیدہ سے آگاہ کیا۔ اور فرینچ زبان سکھائی اور خود ان سے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ کالج کے تعلق ہی کے زمانے میں آپ نے بلاد اسلامیہ کا سفر کیا۔ جس کا مقصد صحت یہ تھا۔ کہ الفاروقی کے لئے تاریخی مواد فراہم کریں۔ کچھ عرصے کے بعد سیر کشمیر کو گئے۔ وہاں کے ملیہ نے سخت نقصان پہنچایا۔ صحت نے اسی وقت سے جواب دے دیا۔ ۱۸۹۷ء میں ۳۷ سال کی عمر میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب گورنمنٹ کی جانب سے عطا ہوا اور ملت تک الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو رہے۔

سمر سید کی وفات کے بعد ۱۸۹۵ء میں آپ کالج سے علیحدہ ہو کر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ وہاں سلسلہ تحقیقہ میں دوسو روپیہ ماہوار وظیفہ تصنیف آپ کو مقرر ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد تین سو روپیہ ہو گیا۔ عرصے تک وہیں مقیم رہ کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ حیدر آباد سے واپس آکر لکھنؤ میں قیام کیا۔ اور تدریۃ العلماء کے کام میں مشغول ہوئے آخر عمر میں تمام تعلقات کو ترک کر کے سیرۃ بنو کی تالیف و تصنیف میں مشغول ہوئے۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ۱۵ دن اسہال کے حادثہ میں طویل رہ کر اپنے وطن مالون اعظم گڑھ میں انتقال کیا۔

آپ فطرتاً ہی اور سلیم الطبع تھے۔ تاریخ اور فلسفہ سے آپ کو ابتدا سے دلچسپی تھی۔ علوم مشرقیہ میں خاص استعداد تھی۔ طرہ بیان آپ کا سادہ۔ مگر زور دار اور مدلل تھا۔ تحریر فلسفیانہ اور محققانہ تھی۔ جس میں سچے تاریخی

وانعادت ہوتے تھے۔ رنگ آمیزی کو دخل نہ تھا۔ عربی نظم و نثر پر اچھی قدرت تھی  
فارسی نظم کسی طرح کا نہیں اہل زبان سے الگ نہیں ہو سکتی۔ اردو میں ان کا  
حسن بیان ایسا تھا کہ سرسید فرماتے تھے کہ "اہل و ہل اس پر رشک کرتے ہیں"  
تصنیفات آپ کا بہت ہیں۔ حسب ذیل تصنیفات زیادہ مشہور ہیں۔

سفر نامہ مصر و روم و شام۔ الفاروقی۔ الغزالی۔  
الغمان۔ المامون۔ الکلام۔ الجہیزہ۔ تاریخ اسلام۔  
سوانح مولانا روم۔ اورنگ زیب۔ موازنہ انیس و  
ویر۔ شعر الجہیزہ جلدوں میں آپ کی آخری تصنیف سیرۃ النبی  
چار جلدوں میں ہے جس کو نا تمام چھوڑا۔

## میر انیس کی شاعری کے خصوصیات فصاحت

علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے۔ کہ لفظ میں جو حروف  
آئیں۔ ان میں تناظر نہ ہو۔ الفاظ نا مانوس نہ ہوں۔ قواعد صرفی کے  
حاصل نہ ہو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ کہ لفظ در حقیقت ایک قسم  
کی آواز ہے۔ اور چونکہ آوازیں بعض شیریں دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں  
مثلاً طوطی اور بھیل کی آواز۔ اور بعض مکروہ اور ناگوار مثلاً ککے اور  
گدھے کی آواز۔ اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شست  
سبک و شیریں۔ اور بعض ثقیل بھیسے ناگوار۔ پہلی قسم کے الفاظ کو  
فصیح کہتے ہیں۔ اور دوسری کو غیر فصیح۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں۔  
کہ فی نفسہ ثقیل و مکروہ نہیں ہوتے۔ لیکن ترتیب و تقریر میں ان کا استعمال

نہیں ہوا ہے۔ یا بہت کم ہوا ہے۔ اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداء  
 استعمال کئے جاتے ہیں۔ تو کافوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو  
 فنِ بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں۔ اور اس قسم کے الفاظ  
 بھی فصاحت میں خلل انداز خیال کئے جاتے ہیں۔  
 مہرانیس کی کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے۔ کہ باوجود اس کے  
 کہ انھوں نے اردو شعرا میں سے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے۔  
 اور سیکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجہ  
 کے الفاظ ان کو استعمال کرنے پڑے۔ تاہم ان کے تمام کلام میں  
 غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔ اکثر جگہ عربی فارسی کے الفاظ  
 جو اردو زبان میں کم مستعمل ہیں ضرورت سے لاسنے پڑے ہیں لیکن اس  
 قسم کے الفاظ جہاں آئے ہیں۔ فارسی ترکیبوں کے ساتھ آئے ہیں۔  
 جس سے ان کی غرابت کم ہوئی ہے۔ ورنہ اگر اردو کی خاص ترکیب میں  
 ان الفاظ کا استعمال کیا جاتا۔ تو بالکل خلاف فصاحت ہوتا۔ مثلاً  
 انگشتی۔ خاتم۔ رخِ باوہ۔ ثنا۔ حسن۔ اور اس قسم کے سیکڑوں ہزاروں  
 الفاظ ہیں۔ جو بجا سے خود فصیح ہیں۔ لیکن ٹھیک اردو میں ان کا استعمال  
 نہیں ہوتا۔ مہرانیس ایک موقع پر کہتے ہیں: ”ذریعہ رسول کی خاطر  
 جلانی نار، نار کا ٹٹپا اس موقع پر نہایت ناگوار اور بیگناہ ہے۔  
 لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبوں کے ساتھ اردو میں مستعمل ہوتا  
 ہے۔ مثلاً نار دوزخ۔ نارِ جہنم۔ تو وہ غرابت نہیں رہتی۔“  
 فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے۔ بعض الفاظ فصیح ہیں۔  
 بعض فصیح تر۔ بعض اس سے بھی فصیح تر مہرانیس صاحب کے کلام کا



بڑا خاصہ یہ ہے۔ کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار ہو۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے۔ تو ان کے مقابلہ میں میر صاحب کے ہاں فصیح الفاظ ہوں گے۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے۔ تو میر صاحب کے یہاں فصیح تر ہوں گے۔ مرزا دبیر کی تخصیص نہیں۔ تمام مرثیہ گوئیوں کے مقابلہ میں میر انیس صاحب کے کلام کا یہی حال ہے۔

ہم مثال کے طور پر دو چار شعر نقل کرتے ہیں۔ جن سے فصاحت اور فصاحت کے اختلاف مراتب کا اندازہ ہو سکے گا۔

مرزا دبیر: ”کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود میں“  
 میر انیس: ”سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں“  
 مرزا دبیر: ”آنکھوں میں پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو“  
 میر انیس: ”آنکھوں میں یوں پھرے کہ مرزا کو خبر نہ ہو“  
 مرزا دبیر: ”رُویا میں بھی حسین کو رُویا ہی کرتے ہیں“  
 میر انیس: ”حسرت ہے کہ خواب میں بھی رُویا کیجئے“  
 مرزا دبیر: ”جیسے مکاں سے دلوں میں صاحب مکاں“  
 میر انیس: ”جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے“

## ابتدال

فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے۔ کہ چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ آسان کثیر الاستعمال ہو۔ اس لئے لوگ مبتدل

اور سوتی الفاظ کو بھی صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں میں سفید و سیاہ کا فرق ہے۔ مرزا و میر صاحب جہاں واقعہ نگاری اور معاملہ بندی میں میر انیس کی تقلید کرتے ہیں۔ اکثر ان کے کلام میں مبتذل الفاظ آجاتے ہیں۔ مثلاً جہاں حضرت شہر یاقو نے حضرت عباس کی لاش پر نوچہ کیا ہے۔ حضرت شہر یاقو کی زبان سے فرماتے ہیں سع ہے مرے دیور مرے دیور مرے دیور! ایک اور جگہ فرماتے ہیں سع ”ہمارے تو ان کی سال گرہ کا نکال لا“

ابتذال کی صاف اور بڑی مثال نظیر اکبر آبادی کا کلام ہے۔ اگر یہ مبتذل نہ تھا۔ تو سادگی اور صفائی میں نظیر کا کلام میر انیس یا میر تقی سے ٹکڑ کھاتا۔

ابتذال کے معنی عام طور پر یہ سمجھے جاتے ہیں۔ کہ جو الفاظ عام لوگ استعمال کرتے ہیں۔ وہ مبتذل ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ سیکڑوں الفاظ عوام کے مخصوص الفاظ ہیں۔ لیکن سب میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔ ابتذال کا معیار مذاق صحیح کے سوا کوئی چیز نہیں۔ مذاق صحیح خود بتا دیتا ہے۔ کہ یہ لفظ مبتذل اور پسند اور سوجھنا ہے۔

میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کی جزئی جزئی واقعات اور حالات کو بیان کرنا پڑتا ہے لیکن یہ ان کی انتہائی درجہ کی قادر الکلامی ہے۔ کہ پھر بھی ان کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔

### کلام کی حفاظت

یہ بحث مفرد الفاظ کے متعلق تھی۔ لیکن کلام کی فصاحت میں صرف

لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں۔ بلکہ یہ بھی ضرور ہے۔ کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے۔ اُن کی ساخت ہیئت۔ نشست۔ ٹہنگی۔ اور گرانی کے ساتھ اُس کو خاص تناسب اور توازن ہو۔ ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ میرا نہیں کا مصرع ہے۔ ع۔ فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور۔ صحرا اور جنگل ہم معنی ہیں۔ اور دونوں فصیح ہیں۔ میرا نہیں نے جا بجا ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے۔ اور ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کیا ہے۔ لیکن اگر اس مصرع میں صحرا کے بجائے جنگل کا لفظ استعمال کیا جائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہو جائے گا۔ میرا صاحب کا ایک شعر ہے۔

طائر ہوا میں مست ہر ن سبزہ دار میں جنگل کے شیر گونج رہے تھے پھار میں  
یہاں جنگل کے بجائے صحرا لاؤ۔ تو مصرعہ بھس بھسا ہو جاتا ہے۔  
شبنم اور اوس ہم معنی ہیں۔ اور برابر درجہ کے فصیح ہیں۔ لیکن میرا صاحب کے اس شعر میں

نما کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا  
اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے۔ تو فصاحت خاک میں بچاؤ گی  
لیکن یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہے۔ اس مصرعہ میں  
ع۔ شبنم سے بھر دیے تھے گھڑے گلاب کے۔ شبنم کے بجائے اوس لاؤ  
تو فصاحت بالکل ہوا ہو جائے گی۔

اس میں نکتہ یہ ہے۔ کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا شعر ہے۔ اس لئے یہ ضرور ہے۔ کہ جن الفاظ کے سلسلہ میں وہ ترکیب دیا جائے۔ اُن آوازوں سے اُس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مخالف سُر کو ترکیب دینا ہوگا۔ نغمہ اور راگ مفرد آوازوں یا سُر کو نام ہے۔ ہر شعر بجائے

خود دلکش اور دلاویز ہے۔ لیکن اگر دو مخالف سُرّوں کو باہم ترکیب دیدیا جائے تو دونوں مکروہ ہو جائیں گے۔

راگ کے دلکش اور مؤثر ہونے کا گڑ یہی ہے۔ کہ جن سُرّوں سے ایسی ترکیب ہو۔ اُن میں نہایت تناسب و توازن ہو۔ الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صورت اور سُرّ ہیں۔ اس لئے اُن کی لطافت پُشیمنی اور روانی اُسی وقت تک قائم رہتی ہے۔ جب تک گرد و پیش کے الفاظ بھی لئے میں اُن کے مناسب ہوں۔

میرزا دبیر صاحب کا مشہور مصرعہ ہے۔ ع۔  
 زینر قدم والدہ فردوس ہیں ہے

اس میں جتنے الفاظ ہیں۔ یعنی زینر قدم والدہ۔ فردوس ہیں۔ سب بجاے خود فصیح ہیں۔ لیکن اُن کے باہم ترکیب دینے سے جو مصرعہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس قدر بھڑا اور گراں ہے۔ کہ زبان اس کا تحمل نہیں کر سکتی۔ شاید تم کو خیال ہو۔ کہ مصرعہ کی ترکیب چونکہ فارسی ہوئی ہے اس لئے ثقل پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں سیکڑوں شعروں میں ایسی قسم کی فارسی ترکیبیں ہیں۔ لیکن یہ ثقل نہیں پایا جاتا۔ مثلاً میرا بنیں صاحب کہتے ہیں۔

میں ہوں سروار۔ شباب جن غلہ ہیں۔ میں ہوں خالق کی قسم دوش مجھ کا کیں پہلے مصرعہ میں فارسی ترکیب کے علاوہ توالی اضافت بھی موجود ہے۔ لیکن یہ بھڑا پن اور ثقل نہیں ہے۔

جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کا تناسب توازن۔ تو درخت پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجاے خود

بھی فصیح ہوتے ہیں۔ تو وہ پورا مصرع یا شعر فصیح کہا جاتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی۔ نشست کی خوبی۔ ترکیب کی ولادیری۔ برجستگی۔ سلاست اور روانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الفاظ کے توازن اور تناسب سے کلام میں جو فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک خاص مثال میں آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ میرا فیس۔ حضرت علی اکبر کے اذان دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہیں۔ ع۔ تھا بلبل حق گو کہ چمکتا تھا چمن میں۔ اسی مضمون کو میر صاحب دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہیں۔ ع۔ بلبل چمک رہا تھا ریاض رسول میں وہی مضمون ہے۔ وہی الفاظ ہیں۔ لیکن ترکیب کی ساخت نے دونوں شعروں میں کس قدر فرق پیدا کر دیا ہے۔

میرا فیس کا تمام کلام اس خوبی سے معمور ہے۔ اور ان کا ہر شعر اس وصف کا مصداق ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

قطرہ کو جو دوں آپ تو گوہر سے ملا دوں	تعریف میں چشمہ شومندر سے ملا دوں
کانٹوں کی نزاکت میں گلی تر سے ملا دوں	ذرہ کی چمک مہر منور سے ملا دوں
اک بھول کا مضمون تو سنو رنگ سے باز دوں	گلہ رنگہ معنی کونٹے ڈھنگ سے باز دوں
تھکیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں دھر	تھا فوج قاہرہ میں تلامح کہ ابحر
پانی میں تھے شنگ اُبھرتے نہ تھے مگر	جگر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھڑو
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے	فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں تینہ موڑ موڑ کے
تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشان	چھایا تھا سب پر عجب علمدار تو حوال
ترکش بھی تھے ہراس سے کھولے ہوئے زبان	گوشہ اہل کا ڈھونڈ رہی تھی ہر اکال

یہوں کا بے گماں تھا ارادہ گریز کا سُنہ گند ہو گیا تھا ہر اک تیغ تیز کا

## کلام کی اصلی ترتیب کا قائم رہنا

ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے۔ وہ بحال خود قائم رہے۔ مثلاً فاعل مفعول۔ مبتدا۔ خبر۔ متعلقات فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں۔ یہ ہی ترتیب شعر میں بھی قائم رہے۔ اگرچہ اس میں تبدیلیاں کہ شعر میں اس ترتیب کا بعینہ قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے صرف ایک آدمہ شعر۔ یا بہت سے بہت شعر دو شعر میں اتفاقاً یہ بات پیدا ہو جاتی ہے لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا اکمال یہی ہے کہ اگر اُس کو نثر کرنا چاہیں تو کتنے ہو سکے۔ اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے۔ جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے۔ اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہیے کہ اگر اصل ترتیب پوری قائم نہیں رہ سکتی۔ تو بہر حال اُس کے قریب قریب پہنچ جائے۔ جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔ اُسی قدر شعر زیادہ صاف۔ برجستہ۔ رواں۔ اور ڈھلا ہوا ہوگا۔ اور اُرو میں جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ صفت میراثیں صاحب سے زیادہ کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

## روزمرہ اور محاورہ

جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کے بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتی ہیں۔ اُن کو روزمرہ کہتے ہیں۔ روزمرہ اگرچہ

ایک جہاگاہ وصف سمجھا جا  
ایک فرد خاص ہے۔ یہ ظاہر ہے  
پہلے آئیں گے۔ جو سادہ صاف اور سہل  
نقل اور گرائی بھی ہو۔ تو رات دن کے بول  
وہ سمجھ کر صاف ہو جاتے ہیں۔ روزمرہ کے لئے  
میرا نہیں کے کلام میں نہایت کثرت سے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال  
پایا جاتا ہے۔ اور اس پر ان کو ناز بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں  
فرغان خوش الحان چن بولیں کیا مر جاتے ہیں سن کے روزمرہ میرا

### حسن کلام

حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ  
سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے۔ اور  
آواز کے مختلف اقسام ہیں۔ مہیب۔ شیر۔ رعب۔ سخت۔ نرم۔ شیریں۔ لطیف۔  
ایسی طبعی الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے  
ہیں۔ بعض نرم اور شیریں۔ اور لطیف ہوتے ہیں۔ بعض سے جلالت اور  
شان ٹپکتی ہے۔ بعض سے درو اور سنگینی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی بنا پر  
غزل میں سادہ۔ شیریں۔ سہل اور لطیف الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔  
تخصیص میں زور دار اور شاندار الفاظ کا استعمال پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔  
اسی طرح رزم۔ نرم۔ مدح و ذم۔ فخر و ادعا۔ وعظ و ہند۔ ہر ایک کے لئے  
جدا جدا الفاظ ہیں۔ شعرائے سن سے جو اس نکتہ سے آشنا ہیں۔ وہ ان  
مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اور یہ ان کے کلام کی تاثیر کا بڑا زور ہے۔

لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہیں۔ یا ہیں۔ لیکن ایک خاصہ  
 اُن پر چڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین میں ایک ہی قسم کے الفاظ  
 اُن کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اُن کا کلام بجز ایک خاص رنگ  
 کے بالکل بے اثر ہوتا ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ مستعدی سے نرم اور  
 فردوسی سے نرم نہیں سمجھ سکی۔

میر انیس صاحب نے نرم۔ نرم۔ نرم۔ نرم۔ ہجو۔ نوحہ سب کچھ لکھا ہے  
 لیکن جہاں جس قسم کا موقع ہوتا ہے۔ اُسی قسم کے الفاظ اُن کے  
 قلم سے نکلتے ہیں۔ درمیانہ شعر لکھتے ہیں۔ تو فرماتے ہیں۔ ۵  
 طاقت اگر دکھاؤں رسالت آپ کی رکھدوں زمین پر چہرے ڈھال آفتاب کی

جلال وغینہ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ ۶  
 کم بختانہ تمہارے اسد کردگار سے ٹکنا ٹکارتا ہوا غصہ کچھار سے  
 کیا جانے کس نے روک دیا ہے دیر کو سب دشت کو بچتا ہے غصہ ہے شیر کو  
 دیکھ دو ان اشعار میں جو الفاظ آئے ہیں۔ جس طرح اُن کی معنویت ہے  
 غیظ و غضب ہے اُسی طرح الفاظ کی صورت و لہجہ سے بھی مراد ہے۔  
 غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔

## مولانا عبد الحلیم شرر عباسی

مستشرقین میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کے سن میں آپ کی شہداء  
 ہوئی۔ آپ کے والد ماجد جناب حکیم افضل حسین صاحب عربی کے اعلیٰ  
 تعلیم یافتہ اور فارسی کے پکڑے عصر تھے۔ واجد علی شاہ کے ملازم تھے۔  
 آٹھ برس کے سن میں آپ کو اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے۔ وہاں حافظ الخیر



صاحب سے قرآن مجید ختم کیا۔ اور اپنے والد سے کچھ انتہائی کتابیں اور  
 ملا یا قر صاحب سے قرآن و نحو۔ اور مولوی سید علی حیدر صاحب  
 طباطبائی سے کچھ منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ اسی زمانہ تعلیم میں  
 انگریزی زبان بھی سیکھ لی۔ اور حکیم محمد مسیح صاحب سے طب پڑھی۔  
 اور چندے مطب بھی کیا۔ کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں لکھنؤ آنا ہوتا تھا  
 علم کا شوق بیکار نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں مولوی محمد کمالی  
 صاحب اور مولوی عبد الباقی صاحب سے مشروبات معقولہ تھام  
 کیں۔ ۱۸۷۷ء میں آپ کے والد نے آپ کو لکھنؤ بھیج دیا۔ یہاں آکر آپ نے  
 آفتاب ہند جناب مولانا عبدالحی صاحب نور اللہ مرقدہ سے تمام کتب  
 درسیہ تمام کیں۔ اور جناب مفتی میر عباس صاحب سے عربی علم اذی  
 کی تعلیم پائی۔ ۱۸۷۸ء میں علم حدیث کا شوق آپ کو واپس لے گیا۔ اور مشہور  
 محدث جناب مولوی نذیر حسین صاحب سے صحاح ستہ اور مؤطا  
 امام مالک فقیر جلالین ختم کر کے لکھنؤ واپس آئے۔ تعلیم میں آپ  
 مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی کے شاگرد ہیں۔ جو اس زمانہ  
 کے مشہور حافظ و شارح ہیں۔ حیدر آباد و کمن میں قیام فرمادیں۔ اور  
 برکات دولت آصفیہ سے مالا مال ہیں۔

۱۸۷۹ء میں آپ اوودھ اخبار کے اسٹنٹ اوڈیٹر  
 مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں محکمہ شہر نام ایک ہفتہ وار رسالہ آپ نے نکالا۔  
 جس میں بہت نازک رنگین شاعرانہ مذاق کے مضامین نکلتے رہے۔ اوودھ اخبار  
 کی اوڈیٹری ترک کرنے کے بعد آپ نے ایک دلچسپ ناول لکھا۔ جس کو  
 بہت مقبولیت ہوئی۔ جنوری ۱۸۸۰ء سے آپ نے دگداز جاری کیا۔ جو  
 اپنے رنگ کا بے نظیر چہ ہے۔

۱۹۷۰ء میں آپ جیدر آباد تشریف لے گئے۔ نواب وقار الامرا بہادر محبین المہارم مال نے اپنے خزانہ پیگاہ سے ۱۰ روپیہ باہار انکی تنخواہ مقرر فرمائی جیدر آباد کے قیام کے زمانہ میں آپ نے تاریخ مسدود لکھی۔ جس کے مسودہ کو دیکھ کر نواب وقار الامرا بہادر نے پانچ ہزار روپیہ انعام کے طور پر خزانہ ریاست سے دلوائے۔ ۱۹۷۰ء میں آپ نواب وقار الامرا بہادر کے صاحبزادے نواب ولی الدین خان بہادر کے ہمراہ انگلستان تشریف لے گئے۔ انگلستان میں ۱۱ سال رہے۔ اور وہیں فرانسیسی زبان سیکھی۔ اور اتنا دیک حاصل کر لیا۔ کہ فریجی زبان کی کتابوں کو سمجھ لیں اور اس زبان کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر لیں۔ انگلستان سے واپسی کے چھ ماہ بعد نواب وقار الامرا بہادر سے باضابطہ اجازت حاصل کر کے۔ پھر لکھنؤ آئے۔ اور یہاں آکر برابر علی حیات میں مشغول رہے۔

۱۹۷۰ء میں آپ پھر جیدر آباد تشریف لے گئے۔ اور وہاں اسٹیشن ڈاکٹر کمر تعلیمات مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں جناب مولوی عمر مرزا صاحب مرحوم اور مولوی ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے۔ کے ہمراہ آپ بھی اپنی خدمت سے سبکدوش ہوئے۔ اس وقت سے برابر لکھنؤ میں قیام ہے۔ اور علی مشاغل سے کوئی دم غالی نہیں۔

نعمتیں طاعانہ خیالات کا اظہار کرنا۔ تاریخی اور عشقہ ناولوں کو دلچسپ پیرایہ میں ادا کرنا۔ تاریخی حالات کو تحقیق سے لکھنا۔ قدرتی منظر۔ دلی جنات کو ایسے ظہور پر لکھنا کہ پڑھنے والے کے دلی پر اس کا سچا اثر قائم ہو جائے۔ آپ کا حصہ ہے۔ جس میں اس وقت کوئی آپ کی ہماری نہیں کر سکتا۔ ناولوں کی بات تمام ہندوستان نے مان لیا ہے کہ آپ سے بہتر کوئی لکھنے والا نہیں۔ آپ کثیر التماہیف ہیں۔ آپ کی حسب ذیل چند تصانیف نہایت قابل قدر ہیں۔

تاریخ سندھ - عصر قدیم - فلورنڈا - ماہ ملک -  
ایام عرب - فردوس بریں -

## خاموش آسمان

اے پر فلک! تجھ میں کتنا بڑا ضبط اور تیرا کس بلا کا ظرف ہے  
تو خدا جانے کب سے تغیرات عالم کا تماشا دیکھ رہا ہے مگر زبان سے ایک  
حرف نہیں نکالتا۔ واقفیت حاصل کرنے میں تو استقدر گرم ہے۔ اور  
ہمارے واقعات کا پتہ لگانے کی بجھے استقدر دُھن لگی ہوئی ہے کہ دن کو  
اگر سورج کی روشنی تجھے ہمارا تماشا دکھائی ہے تو رات کے اندھیرے  
میں ہماری کیفیت دریافت کرنے کے لئے تو اپنی مشعلیں روشن کر لیتا  
ہے۔ اور ہمارے یہاں کوئی بات نہیں ہوتی جسے دریافت نہ کر لیتا ہو  
لیکن یہ کیا قیامت ہے کہ تو سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے مگر کتنا کچھ نہیں  
تیری خموشی کا ظلم توڑنے کے لئے ہم نے تیرے کواکب پر غور کیئے کرتے کرتے اور  
آج کے اثر دن کا تجربہ اٹھاتے اٹھاتے ہیئت اور نجوم کے سہ مشہور فن  
پیدا کر دیے۔ اور تیری خموشی سے بھی بہت کچھ پوچھ لیا۔ مگر افسوس تیرے  
منہ سے آواز نہ نکلی۔ کاش تو اتنا ہی بتاتا کہ تیری ہی کیفیتوں سے  
اخذ کر کے ہم نے جو کچھ دریافت کیا ہے وہ سچ ہے یا نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ عبرت بین نگاہیں اکثر پڑانی چیزوں کو صفحہ عبرت خیال  
کرتی اور جن چیزوں نے قیامت کی مار کھائی ہے۔ ان سے اگلوں کی  
سرگذشت پوچھتی ہیں۔ وہ اگلی پر اثر داستانیں سننے کے لئے کبھی منہم  
قصور کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ اور کبھی سسنان قبرستانوں کی طرف

اور سلف کے کارنامے کبھی وہ قدما کی یا کاروں سے دریافت کرنا چاہتی ہیں اور کبھی ان کی بوسیدہ ہڈیوں سے۔ گو یہ سب تیری طرح سے خاموش و بے زبان ہیں۔ مگر تجسس نگاہوں کے سامنے عبرت و حسرت کا کوئی نہ کوئی صفحہ ضرور پیش کر دیا کرتے ہیں۔ ہم جس طرح اگلوں کی ہڈیوں سے اس عمدہ عتیق کے واقعات دریافت کرتے ہیں اسی طرح اپنی ہڈیوں کو مرتفع عبرت بنانے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان ہڈیوں ہی پر موتوں نہیں۔ ہم دنیا کی ہر دیرپا چیز سے پرانی سرگزشت پوچھتے اور اسی کے ذریعہ سے نئے دلوں کے پاس اپنا پیغام بھیجتے ہیں۔

مصر کے عالی شان اور سربراہ فلک ابرام خدا جانے کب سے یونہیں سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ اور اے فلک خاموش! تیرے ساتھ نہ معلوم کیسی سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ بے زبانی کی باتوں سے نہ کبھی تیرا جی بھرتا ہے اور نہ وہ اکتا کے سر ہٹاتے ہیں ان کی معرفت ہمارے پاس اگلوں کے بہت سے پیغام پہنچے۔ اور ہم نے بھی آئے دلوں کے لئے انہیں اپنا معتبر قاصد قرار دے رکھا ہے۔

یونان پاٹ نے ان کے قدم کے پاس کھڑے ہو کے کہا تھا: تم مر رہے ہو۔ وراز سے یوں ہی خاموش کھڑے ہو۔ قراعنہ کے ہسیلوں گھرانوں کا عروج و زوال اور صد سلطنتوں کا ادبار و اقبال تمہاری نظر سے گذر رہے۔ کل تم نے یہ دیکھا تھا کہ اسکندر اعظم اپنے گھوڑے پر سوار تمہارے قدم کے پاس کھڑا ہوا ہے۔ اور آج اسی شان سے مجھے دیکھ رہے ہو؟ یہ کہہ گئے اس نے یقیناً درخواست کی ہوگی کہ تم نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہو بتاؤ۔ اور اگلوں نے تمہاری معرفت جو جو پیغام بھیجے

ہوں پہونچا دوئے اس کے جواب میں اہرام نے زبان سے تو کچھ نہ کہا ہوگا  
مگر اس میں شک نہیں کہ اپنی خموشی اور بے دہانی کی زبان سے بہت  
کچھ حالات کہہ دئے ہوں گے۔ اور نیپولین نے انھیں عبرت کے کاٹوں  
سے سن بھی لیا ہوگا۔

مگر بظاہر ہمیں اہرام کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ انسان اگر عرش  
کی آواز سن سکتا ہو اور خدا نے اُسے زبان حال سمجھنے کی لیاقت و قوت  
عطا کی ہو تو اُسے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ قریب الاندام  
دیواروں سے سر ٹکراتا اور شکستہ قبروں کی ٹھوکریں کھانا فضول ہے۔  
اس لئے کہ ہمارا سما اور پرانا داستان گو اسے آسمان! تو ہے۔ جو ہر وقت  
ہماری نظر کے سامنے ہے۔ اگر تو بتائے پر اُسے یا تیری صورت سے  
اقتباس کرنے کی قوت ہو تو ہم کون سی اگلی بات ہے جسے نہیں معلوم کر سکتے  
لیکن قیامت تو یہ ہے کہ اسے خاموش آسمان! تو زبان حال سے کبھی  
کچھ نہیں کہتا۔ تیری وضع و قطع میں کبھی کوئی ایسا تغیر بھی نہیں ہوتا  
جس سے کسی انقلاب کا پتہ لگ سکے۔ لوگ کچھ بوڑھا کہتے ہیں۔ اور  
تو نے ہمارے وہم و خیال سے زیادہ اتنی بڑی عمر پائی ہے کہ اُس کے  
محافضے کچھ بوڑھا کہنا غلط بھی نہیں۔ لیکن بچپن جوانی اور بوڑھاپا  
ایسی عمریں ہیں جن کے اعتبار سے ہر شخص اور ہر چیز میں کسی نہ کسی  
قسم کا انقلاب ضرور ہوا کرتا ہے۔ بچپن میں ننھے ننھے ہاتھ پاؤں اور  
چھوٹی سی سمجھ ہوتی ہے۔ جوانی میں توانا و تند رست اعضا اور شباب  
کا زور شور ہوتا ہے۔ پھر بوڑھاپے میں ہر چیز کا انحطاط ہوتا ہے۔  
اور کمزوری و بے دست و پائی اپنا زور شور دکھاتی ہے۔ اسے آسمان!

تو بوڑھا ہے تو چاہئے تھا کہ کبھی ہم نے تیری طفولیت اور تیرے شباب  
 کو بھی دیکھا ہوتا۔ ممکن ہے کہ نوع انسانی نے صرف تیرا بوڑھا پایا ہی دیکھا  
 ہو۔ اور تیرا بچپن و شباب اس کی عمر اور اس کے ہوش و حواس سمجھانے  
 سے پیشتر ہی گزر گیا ہو۔ لیکن آخر بوڑھا یا بھی تو ہمیشہ ایک رنگ اور  
 ایک حالت پر نہیں رہتا۔ مگر تو نے کس بلا کی کاٹھی پائی ہے۔ یا کون سا  
 کشتہ کھا ہے۔ کہ ہر چیز میں انقلاب ہے اور نہیں ہے تو تجھ میں۔  
 خیر اے مکار آسمان! تو چاہے کیسی ہی متانت کی شان دکھائے  
 اور کتنے ہی بڑے ضبط سے کام لے مگر ہم تجھ سے تیری سرگزشت  
 پوچھیں گے۔ اور تو جواب دے یا نہ دے ہم تجھ سے قبولوای کے چھوڑیں گے۔  
 اور ایسی ایسی تپے کی باتیں کہیں گے کہ تجھ سے انکار کرتے ہی نہ بن  
 پڑے گی۔ کیا تو اس سے انکار کر سکتا ہے کہ کبھی تیرے نیلے سا بھان  
 کے نیچے اور تیری ان رات کو کھٹنے والی آنکھوں کے سامنے ہم نہ تھے۔  
 بلکہ ہر طرف یا پتھر میدان رنگ کے تو دے اور یا درختوں کے نیچے  
 جھل تھے جن میں ہمارے سوا کوئی متحرک مخلوق نہ تھی۔ ہوا کبھی  
 آہستہ اور کبھی زور شور سے چلتی اور عجب ہنگامہ مچاتی تھی۔ پھر اس کے  
 بعد ایک وہ زمانہ تھا کہ جس طرح نظر اٹھا کے دیکھتے طبع طبع کے میب  
 اور عظیم الجثہ جانوروں کا شور و ہنگامہ تھا۔ یہاں تک کہ ہمارا زمانہ  
 ہوا اور ہمیں تو اس محنت و جانفشانی میں مشغول دیکھ رہا تھا کہ  
 جنگلوں کو کاٹ کاٹ کے زمین صاف کر رہے تھے۔ موزی جانوروں اور  
 وحشی درندوں کو مار مار کے اپنی نسل کے لئے امن و امان کی حکومت  
 قائم کر رہے تھے۔ کیا تو کہہ سکتا ہے کہ ان باتوں کو تو نے نہیں دیکھا؟

نہیں دیکھا ہے مگر عرشِ معلیٰ کے قریب ہونے کے باعث تجھ میں نہ کہا ہوگا  
کی ایسی قوت پیدا کی گئی ہے کہ قدرت کے بھیدوں کو افشا کرنے سے بہت  
کے کاؤں

## سکندر کا تابوت

ان اگر جوت

صاحبِ اہم نے مشاعرے بہت دیکھے ہیں۔ اور بہت سے وقت و وقت  
بھی دیکھے ڈائے جن میں بڑے بڑے شعرا کو غول سرائی کر سہام  
گرامی قصحا کو دادِ فصاحت دینے دیکھا ہوگا۔ لیکن ایسی بول ہے۔  
انجمن کبھی نہ دیکھی ہوگی جیسی کہ سکندر کی موت کے وقت بوجہ وقت  
کے گردِ شہرِ بابل میں دیکھی گئی تھی۔  
سکندر نے بڑے بڑے حکیم اور فلسفی مختلف ممالک سے معلوم کر کے  
سے بلوائے اپنی صحبت میں جمع کئے تھے۔ جن کی بائیں سُنے میل سے بھی  
لطف آیا کرتا تھا۔ ان حکیموں میں یونان کے بھی تھے فارس میں ہونٹا  
تھے اور ہندوستان کے بھی تھے۔

جب ہندوستان سے واپس جا کے وہ بابل میں مریا تو آسری کے  
دامن اور لشکرِ قاتلوں میں رات بھر گہرام میا رہا۔ صبح کو اس کو بڑھایا  
مرصع تابوت تیار کر کے رکھ دیا گیا۔ اور سکندر اس میں لٹا کر کسی  
اس وقت تمام حکما تابوت کے گرد حلقہ کئے ہوئے تھے۔ اور اس  
حسرت و اندوہ سے خاموش تھے کہ کسی حکیم نے نہایت ہی جوش و شہابی لائے تھے  
بڑھ کے تابوت پر پاختہ رکھا اور کہا: آہ! جو بڑے بڑے حکما  
کو اسیر کر لیا کرتا تھا آج وہ خود اسیر ہے! اور اس کے بڑے حکما

سے کہا ”اب سب صاحب بھی تابوت پر ہاتھ رکھ رکھ کے اپنے جذباتِ دلی کو ظاہر کریں۔ دیکھوں آپ کیا کہتے ہیں“ یہ سنتے ہی سب حکیموں نے بڑھ بڑھ کے اور تابوت پر ہاتھ رکھ رکھ کے اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کر دیئے۔

ایک بولا ”بادشاہ سونے چاندی کو اپنے صندوق میں بند کیا کرتا تھا۔ اور آج خود زرنگار صندوق (تابوت) میں بند ہے۔“  
دوسرے نے بڑھ کے کہا ”آہ! اس جسم نے کیسا دنیا کو چھوڑا اور اب تابوت میں جانے کی اسے کیسی جلدی تھی!“

تیسرا بولا۔ ”کیسی حیرت کی بات ہے کہ جو سب پر غالب تھا مغلوب ہو گیا اور جو ضعیف تھے رنگ رلیاں سنارپے ہیں۔ اور بچوے نہیں سکا۔“  
چوتھے نے کہا۔ ”یہ وہ شخص ہے جس نے موت کے خیال کو تو مخفی رکھا۔ اور اپنی آرزوئیں عالم پر آشکارا کر دیں۔ پھر موت کو سمجھ دیوں اور کیوں نہ ٹالا کہ آرزوئیں برآئیں؟ یا اپنی امیدوں کو اتنا مختصر ہی کیوں نہ رکھا کہ وہ موت کی دست برد سے بچ جائیں؟“

پانچویں نے کہا۔ ”او غم زدہ کوشش کرنے والے! تو نے وہ چیز جمع کی جس کی احتیاج رکھنے کے باعث تو ذلیل و خوار ہوا۔ پھر اس کے بوجھ نے تیرے ساتھ بے وفائی کی۔ اور اس کی تحصیل کے گناہوں کو تو نے کمایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تو نے جو کچھ پیدا کیا غیروں کیلئے تھا۔ اور اس کا گناہ تیری ہی گردن پر ہے۔“

چھٹے نے کہا۔ ”تو ہمیں اکثر نصیحت کیا کرتا تھا مگر اس مرجانے سے زیادہ بلیغ نصیحت کبھی نہیں کی تھی۔ لہذا جو عقل رکھتا ہو سمجھے۔“



اور جو چشمِ عبرت رکھتا ہو عبرت پکڑے۔“

ساتویں سنے کہا ”بہت سے ہیبت زدہ مجھ سے دور اور میرے خوف سے کانپتے رہتے۔ اور آج وہ میرے سامنے اور پاس گھڑے ہیں۔ اور مجھ سے نہیں ڈرتے۔“

آٹھویں سنے کہا ”بہت سے ایسے ہوں گے کہ جب تو تقریر کرتا ہوتا تھیں آرزو ہوتی کہ تو خاموش ہو جائے۔ آج اُنھیں کو تمنا ہے کہ کوئی لفظ تیری زبان سے نہیں اور تو خاموش ہے۔“

نواں بولا ”کنکٹوں نے اس غرض سے اپنی پیاری جہانیں دیں کہ تو نہ مرے اور نہ بچ جائے مگر آخر تو مر ہی گیا۔“

دسواں بولا ”مجھے حکم تھا کہ آپ سے جدا نہ ہوں۔ اور آج کوئی مہربر نہیں بن بڑتی کہ کیونکر آپ تک رسائی ہو۔“

گیارہواں بولا ”آج کا دن عظیم الشان دن ہے۔ اس کی جو مصیبتیں جا رہی تھیں لیٹ آئیں۔ اور اس کی جو برکتیں آ رہی تھیں واپس گئیں لہذا جس شخص کی سلطنت چھن گئی اُس پر جس کسی کو رونا ہوا اُسے روئے بار ہواں بولا ”اے صاحبِ جبروت! تیرا جبروت اس طرح دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا۔ جیسے بدلی کو ہوا اڑا لے جاتی ہے۔ اور تیری سلطنت کے آثار یوں مٹ گئے جس طرح کبھی اڑ جاتی ہے۔“

تیرہویں سنے کہا ”اے وہ شخص جسے ساری دنیا باوجود اس طول و عرض کے تنگ نظر آتی تھی اب بتا کہ اس گز بھر زمین پر جس پر تیرا قابو رکھا ہوا ہے تیرا کیا حال ہے۔“

ہجودھویں سنے کہا ”اُس شخص پر تعجب کرو جس کی یہ وضع و حال ہو

دولت کے فراہم کرنے میں بڑی شہرت حاصل کی۔ مگر وہ دولت ہی کیا تھی۔ ایک حقیر یا ذرا سی مٹ جانے والی چیز۔ یا ایک پڑانا بوسیدہ کھوکھل درخت۔“

پندرہواں بولا۔ ”لوگو! اس چیز کی طرف رغبت نہ کرو جس کی مسرت ناپائدار ہو اور جس کی لذت جاتی رہتی ہو۔ آج تو تم پر مکمل گیا کہ کون چیز مٹنے والی ہے؟ اور کون رہنے والی؟“  
سولہواں تابوت پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ”دیکھو اس سونے والے کا وکار کیسا تشریف لے گیا؟ اور بدلی کیسی چھٹ گئی؟“  
سترہویں نے فارم آگے بڑھا کے کہا۔ ”اے وہ شخص جس کا غصہ موت تھا۔ مجھے موت پر غصہ نہ آیا؟“

اٹھارہویں نے کہا۔ ”اس گزرے ہوئے بادشاہ کو تم نے دیکھا اب جو بادشاہ زندہ باقی ہے اسے دیکھ کے نصیحت پکڑ سکے؟“  
ایسویں نے کہا۔ ”جس کی آواز پر شوشی سے کان لگے رہتے تھے آج وہ خود خاموش ہے۔ لہذا جو خاموش تھے ان کے لئے موقع ہے کہ بولیں۔“  
بیسویں نے کہا۔ ”عنقریب وہ بھی تجھ سے آٹے گا جو تیری موت پر خوش ہوا ہو۔ جس طرح تو اس سے جا ملا جس کے مرنے کی تجھے خوشی تھی“  
ایسویں نے کہا۔ ”یہ کیا ہوا کہ اب تو کوئی ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا۔ حالانکہ تودہ ہے جس کی نظر میں ساری دنیا حقیر و ذلیل تھی۔ اور کیا ہوا کہ تو تنگی مکان سے نہیں گھبراتا۔ حالانکہ شہروں کی چار دیواری میں بھی تیرا دم گھٹتا تھا؟“  
بایسویں نے بڑھ کے کہا۔ ”دنیا کا یہ انجام ہے۔ اس لئے اسے

پہلے ہی سے چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔“  
اب حکماء و فلسفی خاموش ہوئے تو سکندر کے واروئے بادری خانہ  
نے آ کے تابوت پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ”دوسرے جوان مجھے ہارے ہیں۔ اور  
کھانے چنے ہوئے ہیں۔ مگر سالارِ قوم کا پتہ نہیں۔“  
اسکے بعد خواجہ نے آ کے کہا۔ ”مجھے دولت جمع کر کے رکھنے کا  
حکم تھا اب یہ دولت کس کے حوالے کر دوں؟“  
اتنے میں کسی اور شکستہ دل نے آ کے کہا۔ ”یہ ساری لمبی چوڑی  
زمین اب سمٹ کے سات بالشت کی رنگہی۔ (جس پر تابوت رکھا ہوا  
ہے) اگر یہ انجام پہنچے سے معلوم ہوتا تو اس کے آور چور کا پتہ لگانے  
کے لئے تو گھر سے کیوں قدم باہر نکالتا؟“  
اب دارا کی بیٹی روشنک جو اس کی بی بی تھی بڑھ کے آئی اور بولی  
”تم سب نے جو کچھ کہا اس سے تعریف اور طعن و تشلیع کی تو آتی  
ہے۔ میں تو بس اتنا کہوں گی کہ مجھے اس کی خبر نہ تھی کہ جس سے  
دارا سے عجم کو مغلوب کیا۔ کبھی وہ خود بھی مغلوب ہوگا۔ پھر سب کی طرف  
دیکھ کے کہا۔ ”جو جام اس نے پیا اُسے تمہارے لئے چھوڑ گیا ہے۔“  
لہذا اب اس کے بعد اُسے تم سب پھر پھر کے پتیا“  
اس کے بعد جب سکندر کے مرنے کی خبر اس کی ماں کو پہونچی تو  
بولی۔ ”آہ! میرا بیٹا تو دنیا سے چل بسا مگر اس کی یاد میرے دل  
سے نہیں مٹتی“

## کنج عزالت

دنیا کے جھگڑ و اترام سے نجات پانے اور۔ تنہا رہی تکلیفوں سے بچنے کے لئے کوئی مامن بھی ہے؟ جہاں ہم اطمینان سے بیٹھ سکیں۔ اور کوئی ہمیں نہ ستائے۔ غایغ الہالی کی زندگی بسر کریں۔ اور کوئی ہمارے عیش کو بے مزہ نہ کرے۔ کسی فکر کو پاس نہ پہنچنے دیں۔ اور کسی ترو دو کی ہم تک رسائی نہ ہو۔ اگلے کہ گئے ہیں سرع ہیچ آفت نہ رسد گوشہ تنہائی را لیکن وہ گوشہ تنہائی کہاں ہے؟ ہم نے تو ہزار ڈھونڈھا کہیں نہ پایا۔ لاکھ سہارا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر وہ کدھر ہے؟ کس سہرزمین میں ہے؟ اور کس اقلیم میں واقع ہے؟ جہاں جاتے ہیں اور جس طرف نظر اٹھائے دیکھتے ہیں اس سچے مامن اور حقیقی جگہ پناہ کا سراغ نہیں لگتا۔ جہاں تک فکریں نہ پہنچنے پاتی ہوں۔ اور خیالات پریشان کی رسائی نہ ہوتی ہو۔

کیا وہ ظلمات میں ہے جہاں آب حیات ہے؟ جس کی تلاش میں لگے ہزار سرگرداں رہے مگر نہ پایا۔ جس کی جستجو میں بڑے بڑے سپاہیوں نے دنیا کی خاک چھانی اور نہ پہنچ سکے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت خضر سکندر کو آب حیات کے چشمہ پر لے گئے۔ جام حیات پیا۔ اور چاہا کہ سکندر کو بھی پلائیں مگر اس چشمہ کے کنارے اس قدر جاندار زندگی کے ہاتھوں سے عاجز اور موت کے آرزو مند دکھائی دیے کہ سکندر کو جینا بلائے جان نظر آیا۔ اور یہ خیال کر کے کہ ایسے جینے سے مرنا بہتر ہے۔ آب حیات کے پینے سے انکار کر دیا۔ مگر خضر نے سیر ہو کے پیا۔ جس کے

پیٹے ہی وہ موت سے آزاد اور ملک الموت کی پہونچ سے باہر ہو گئے۔ مگر  
 ناکام و نامراد اسکندر جس نے بہادری کے ساتھ زندگی و موت کی کشمکش  
 میں بڑھا گوارا کر لیا تھا فکروں کا ناقابل برداشت بوجھ اپنے سر پر  
 لادے ہوئے واپس آیا۔ اس سے بحث نہیں کہ دونوں میں سے کون  
 اچھا رہا۔ مگر بظاہر ہمیں تو دونوں برابر نظر آتے ہیں۔ آج ہماری  
 آنکھوں کے سامنے نہ حضرت ہی موجود ہیں اور نہ اسکندر۔ خضر نے اگر  
 آپ حیاتِ الٰہی کے ابدی زندگی حاصل کی تو سکندر کو بھی اُس کے کارناموں  
 نے آج تک مرنے نہیں دیا۔ دونوں کے نام بڑی دنیا تک رہیں گے۔  
 اور کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ موت و زندگی نے اُن کے جسموں  
 کے ساتھ جو سلوک چاہے کیا ہو مگر اُن کے ناموں پر موت کا زور  
 بالکل نہیں چل سکا۔ چنانچہ زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔  
 یہ مانا کہ سکندر دنیا سے زحمت ہو گیا۔ اور خضر موجود سے جاتے ہیں  
 مگر خضر و سکندر میں اصلی فرق زندگی اور موت کے لحاظ سے نہیں  
 بلکہ ایک دوسری حیثیت سے ہے۔ سکندر نے چاہے خضر کے آبِ حیات کو  
 نہ پیا ہو مگر اُسے آبِ حیات کا ایک دوسرا چشمہ مل گیا۔ جس کی وجہ  
 سے اُس نے بھی ابدی و سرمدی زندگی حاصل کر لی۔ مگر جو چیز خضر کو  
 ملی اور سکندر کو نہ مل سکی وہ سچ عزت یا گوشہ تنہائی ہے۔ بدیہ  
 سکندر کو وہ سچ عزت نہیں مل سکا۔ جسم توں اور آرزوؤں۔ ہوسوں  
 اور تنہاؤں کا ایک بار عظیم سر پر لئے ہوئے وہ چاروں طرف پھرا۔  
 اور کہیں وہ خوشی اور بے فکر کا مامن نہ مل سکا۔ جہاں اپنے سر  
 کے بوجھ کو کچھ نیک کے وہ بے پروائی اور آرام کی زندگی بسر کرتا۔

لاکھ سہارا مگر کچھ زور نہ چلا۔ اور آخر اُسی بوجھ کے دباؤ سے بیمار پڑ کے بابل میں مر گیا۔

مگر خضر کو وہ گوشہ عزلت مل گیا جہاں نہایت اطمینان سے بیٹھے ہیں کوئی فکر پاس نہیں کھینکنے پاتی۔ کسی آفت کا سامنا نہیں ہوتا۔ کوئی خطرہ دل میں نہیں آتا۔ اور کوئی سودا و بارگ میں نہیں سہا۔ دنیا میں ہیں مگر کوئی اُن تک پہنچ نہیں سکتا۔ زندہ ہیں مگر زندگی کی تلخیوں سے آزاد ایک کونے میں خاموش و بے غرض بیٹھے ہیں۔ اور دنیا کے تغیرات ایک دائمی تھیر بن کے اُنہیں روز ایک نیا تماشا دکھاتے اور اور عالمِ تنحالی کے ایک ٹر ہر لحظہ اُن کے سامنے نیا کھیل کھیلتے ہیں۔ بچوں کی اُس کسر میں کی طرح جس میں شبشبہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہر گھڑی پہلا نقشہ بگاڑتے اور نیا بناتے ہیں۔ دنیا کا جغرافیہ روز بدلتا ہے۔ پل پل میں پڑانا کارخانہ غائب اور نیا قائم ہوتا ہے۔ ہر روز ایک نیا بہار میدان میں آ کے جو ہر شجاعت دکھاتا۔ ہزاروں اور لاکھوں غیر آزاروں کو مشغول کرتا۔ شہرت و ناموری حاصل کرتا۔ اور خاک میں مل جاتا ہے۔ بڑے بڑے مہتر عالم و فاضل حاذق طبیب و معالج کامل فن صناعت و مہندس ناموری کے اسٹیج پر آتے اور اپنے کمالات و مہر دکھانے کے بعد نہایت ہی حسرت و فاکامی کے ساتھ دوسروں کے لئے جگہ چھوڑ کے چلے جاتے ہیں۔ گم نام اور کم مایہ ملک عروج پکڑتے۔ دو حشمت میں نمود حاصل کرتے۔ اور پھر دولت میں پڑ جاتے ہیں۔ سلطنتیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اور قومیں ناموری کے ملاء اعلیٰ پر پہنچ کے گر جاتی اور حقیقی ادبار کے تحت الشری میں پہنچ جاتی ہیں۔ ان تمام انقلابات

عالم سے سب متاثر ہوتے۔ سنتے اور روتے۔ خوشیاں مناتے اور بتلا کے  
 الم ہوتے ہیں۔ مگر اکیلا ایک شخص اپنے خاموشی کے گوشہ عزت سے ان  
 چیزوں کا تشا دیکھتا اور لطف اٹھاتا ہے۔ وہ کون ہے؟ حضرت خضر۔  
 شعرا ان پر چاہے جیسی آڑی ترجیحی آئیں۔ آج کل کے انگریزی داں  
 چاہے ان کی زندگی سے انکار ہی کیوں نہ کریں۔ مگر انہیں پروا نہیں  
 ہماری طرح ناجزہ کار ہوتے تو لوگوں کے تاننے اور شاعروں کے چھیننے سے  
 کبھی نہ کبھی برا فروختہ ہو کے اپنے کنج عزت سے باہر نکل آتے۔ مگر  
 نہیں ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ پرواہ ہی نہیں کرتے کہ دنیا  
 والے ان کی نسبت کیا کہتے ہیں۔

خضر نے سکندر کو آب حیات کے چشمہ تک پہنچا دیا مگر اپنا وہ عزت  
 کہہ اور حادث روزگار سے بچنے کا مہین نہ دکھایا کہ اسے جیتے میں وہ  
 آنے کی آسید ہوتی۔ اور یہ اندیشہ نہ پیدا ہوتا کہ زندگی عذاب ہو جائیگی  
 اسے اگر خضر کا وہ ماسن مل جاتا تو پھر وہ بٹھاپے کی بے دست و پائی  
 کا ذرا بھی خیال نہ کرتا۔ اور ہوس ملک گیری سے بھی دست بردار  
 ہو جاتا۔

یہ ہے کہ دنیا میں کنج عزت ہی وہ زبردست قلعہ ہے جہاں تک حلویش  
 روزگار کی رسائی نہیں ہوتی۔ اور دست برد زمانہ جس کا کچھ بگاڑ نہیں  
 سکتی۔ بڑی بڑی سلطنتوں اور بڑے بڑے فاتحوں نے دنیا میں سیکڑوں  
 ایسے مضبوط اور زبردست قلعہ بنائے ہیں جن پر لوگوں کو بڑے دعوے  
 تھے۔ بابل و قینوا کے ایسے قدیم شہروں سے زیادہ محفوظ اور بھرپور کے  
 شہر اور قلعہ کون ہوں گے؟ مگر زمانے کے بے روک ہاتھوں نے سب کو

مٹا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل کے قلعے پرانے قلعوں سے زیادہ محفوظ اور ناقابلِ گزر ہوتے ہیں۔ جن کے قریب تک بھی دشمن کا گزر نہیں ہو سکتا مگر اس میں بھی کسی کو شک نہ ہوگا کہ زمانے کا دستِ ستم کبھی نہ کبھی ان کو ہمارا گریہ دیگا۔ اور آفاتِ ارضی و سماوی کی فوجیں اور مروجہ ایام کے علم اور آفتیں مٹا کے رہیں گے۔

لیکن کچھ تنہائی کے سیدھے سادے اور بے تکلف قلعہ تک نہ کوئی دنیا کا زبردست سے دیر دستِ فاتح پہنچ سکتا ہے۔ اور نہ ان قدر قیامت آوروں کی رسائی ہو سکتی ہے جو دنیا کی ہر چیز کے مٹانے پر تیار رہا کرتے ہیں۔ فلک بے مہر کے ستم ساری دنیا پر ہوتے ہیں مگر اس گوشہٴ عزلت تک اس کا ہاتھ بھی نہیں پہنچ سکتا۔

انفرض کچھ عزلت ہی وہ مقام ہے جہاں ہم ہر قسم کے آزار اور ہر طرح کے آلام و حوادث سے نجات پاسکتے ہیں۔ مگر افسوس اس کا پتہ نہیں۔ اور نہ کوئی پتہ دینے والا ہے۔ خضر نے سکندر کے ایسے خامی دوست کو آبِ حیات کا چشمہ بتا دیا مگر اس گوشہٴ عزلت کا پتہ نہ دیا جہاں وہ کمالِ فارغِ البالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو بھلا ہمیں یا کسی اور کو کیا پتہ دینگے؟ بعض بعض بزرگوں سے کبھی کبھی خضر سے ملاقات بھی ہو جایا کرتی ہے۔ مگر افسوس ہمیں کہیں نہ ملے۔ ورنہ آج کے پوچھتے اور انتہا کرتے کہ کبھی ہمیں بھی اپنے سچے عشرتِ کردے کی سیر کروا دیجئے۔ دیکھیں تو سہی وہاں کیا ہے اور کیسے کیسے سامانِ عیشِ میاں ہیں۔ کہ کسی قسم کی فکر پاس نہیں پٹکنے پاتی اور آلام و ہوم دور رہتی دیر رہتے ہیں۔



لیکن ایسا نہیں ہے۔ جس گوشہٴ عورت میں انکار و آلام سے نجات ملتی ہے وہاں کچھ ہی نہیں۔ نہ کوئی عیش کا سامان ہے۔ نہ کسی قسم کی دلچسپی کے کھیل ہیں۔ نہ ہمارے مذاق کا دلائقی فریضہ ہے نہ جدید آلات و ذرائع عیش ہیں جو سامان کے معجزات سے ان دلوں پیدا ہو گئے ہیں۔ وہاں جو کچھ لذت و مسرت ہے اسی بات کی ہے کہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ وہاں پہنچنے کے بعد شک پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم بھی ہیں یا نہیں۔

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ عورت کہیں گور غریباں کے پاس ہوگا۔ بیشک یہ خواب گاہ عدم کے مست خواب جس بے فکری کے ساتھ قیامت سے شرط باندھ کے لیٹے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ عورت میں پہنچ گئے ہیں۔ جہاں خاموش لیٹے ہیں۔ نہ کسی سے بولتے ہیں نہ جانتے ہیں۔ اور یہاں تک بے پروا ہیں کہ زمانہ خود ان کے جسم کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے بڑا نہیں مانتے۔ گوشت سڑ کے خاک ہو جا تو پروا نہیں۔ ہڈیاں گل کے مٹی میں مل جائیں تو فکر نہیں۔ ہم دونوں ہر مرتبہ کسی محشر خرام کی ٹھوکر سے مر کے ذندہ ہوئے مگر یہ کسی کی نہیں سنتے ان پر نہ کسی کے لب جان بخش کی مسیحا جلتی ہے اور نہ انہیں کسی شونخ ادا کی قیامت خرابیاں جگاتی ہیں۔ جن رخ پر لیٹ گئے لیٹ گئے پھر کروٹ بھی نہیں بدلتے۔ یقیناً وہ کچھ عورت ہیں پہنچ گئے ہیں اور وہ لطف اٹھا رہے ہیں جس کے جان دینے پر بھی نصیب ہوئی نہیں امید نہیں۔

لیکن نہیں سنتے ہیں کہ ان خاموشانِ ازل کو بھی قیامت کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ چاہے ہم سے نہ بولیں۔ ہماری بات کا جواب نہ دیں۔ اور

اس کے روافد نہ ہوں کہ ان کی خاموشی کی لذت کسی اور کو بھی نصیب ہو سکے۔ مگر زندگی تا بعد الموت کے جھگڑوں اور ثواب و عذاب کے اندیشوں سے نہایت پریشان و مشرد ہیں۔ کھٹکا لگا ہوا ہے کہ دیکھئے آئندہ کیا ہوگا۔ اور روزِ جزا میں کیسی پیش آئے گی۔ افسوس وہ گوشہ عزت جہاں فکروں اور خطروں کا گزر نہ ہو یہاں بھی نہیں ملا۔

تو اُسے کہاں ڈھونڈ چھیں؟ کیا مالوس ہو کے بیٹھ رہیں؟ مگر بامے خیریں اور روزِ روز کے آلام و حوادث بیٹھتے بھی تو نہیں دیتے۔ جب کسی آفت کا سامنا ہوتا ہے یہی جی چاہتا ہے کہ وہ کچھ عزت لے جاتا ہے یہاں پہنچتے ہی دروازہ بند کر کے بیٹھ رہتے۔ اور اس آفت سے نجات لگاتی اور جس گھڑی مصیبت سر پہ آئے پڑ جاتی ہے دل کا لقا خفا شروع ہوتا ہے کہ اسی گوشہ تنہائی کو ڈھونڈ لکاو جہاں حضرت خضر مسرت و آرام اور اطمینان و امن و امان کے ساتھ جا کے بیٹھ رہے ہیں۔

جس طرح کیمیا کے متعلق ہزاروں آدمیوں پر شبہ ہوتا ہے۔ اور پھر بھی پتہ نہیں چلتا کہ اُس کا نسخہ کسے معلوم ہے۔ اسی طرح ہمیں ہر گز وہ اور ہر شخص پر دھوکا ہوتا ہے کہ اُسے گوشہ عزت کا راستہ معلوم ہوگا۔ لیکن جستجو کے بعد کوئی ایسا نہیں ملا جو ادھر کا راستہ بتائے اور ہم راہِ نجات کے مسافریں کے وہاں پہنچیں۔

زیادہ تر گمان تارک الدنیا لوگوں اور علمائے روحانیوں پر ہے کہ انھیں اس منزلِ نجات کا سراغ لگ گیا ہے۔ اس لئے کہ انھیں جیسا اطمینان قلب حاصل ہے۔ اور سامانِ دنیوی کو یہ جی پی پے پروائی اور کمالِ استغنا کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کسی کو نہیں دیکھا۔ گوان ہیں

بھی بہت سے ایسے دنیا پرست ہیں جن کے دل میں ہمارے دلوں سے زیادہ ہوسہیں بھری ہوئی ہیں۔ مگر انھیں کی وضع میں چند ایسے سچے بھلاور ضرور بھی ہیں جنہوں نے نفس کشی اور جہاد نفسانی کے ذریعہ سے کج عزالت کے زبردست قلعہ کا پتہ لگا کے اسے فتح کر لیا ہے۔ کاش آج ملک ہماری رسائی ہوتی۔ اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کے ہم احتجاج کرتے کہ ہمیں بھی وہیں پہنچا دیجئے جہاں آپ ہیں۔ لیکن قیامت تو یہ ہے کہ جو اطمینان قلب کے سچے عزالت کردے میں پہنچ گیا اسے ساری دنیا سے نفرت ہوگئی۔ ہم اسے ہزار تلاشی کریں وہ ہم سے دور ہی دور رہتا اور ہماری صورت دیکھ کے بھاگتا ہے۔

لیکن جب اور سب راستے بند ہیں تو ہمیں ایسے ہی فاتح کج عزالت کا انتظار کرنا چاہئے شاید کہیں ملجائے۔ ہماری التجائیں اس کے دل پر اثر کریں۔ اور وہ ہمیں اس حقیقی مامن میں پہنچا دے۔ گوشہٴ مہنائی کے ملنے کی اگر کوئی سبیل ہے تو بس یہی ہے۔ اور اثنا سہارا بھی ہمیں زندگی بسر کر دینے کے لئے کافی ہے۔

## فیروز کوہ کی گھاٹیاں

جنوں آمادہٴ عشق تباں پیوستہ می ماند بصحرایا بودی یا بکوکے یا بہ بازار  
سلسلہ کے موسم بہار میں علاقہٴ عتور کے مشہور پہاڑ فیروز کوہ کی گھاٹیاں اور وادیاں دیکھنے کے قابل ہیں۔ سرسبز اونچے پہاڑ۔ رنج بارھوں مینے محل سہر کے ہشتی تھے پہنے رہتے ہیں (آسمان کی طرف سر اٹھائے گویا خدا کی مہربانیوں اور قدرت کی فیاضیوں کا شکر ادا

کر رہے ہیں۔ صد ہا چٹے اور آشمار جو ان سرکش خود پرستان باغِ سخن کے سبز دامنوں میں چٹکی کا لہریا بناتے ہوئے نیچے تک چلے آئے ہیں۔ ان کی معشوقانہ دلچسپی و دلکشی میں جان ڈال رہے ہیں۔ اونچی نیچی وادیاں جو ان قدرتی معشوقان سبز پوش کے آغوشِ شوق بنی ہوئی ہیں۔ یہ مستانِ علق کو اسی طرح اپنی طرتِ یلانی اور کھینچتی ہیں جس طرح قصہء عالمِ طائی کے کوہِ ندا کی جدا سے یکا انھی لوگوں کو بیتاب کر کے اپنے پاس جلاتی تھی۔ موسم کی رنگین طبعی نے انھیں پھولوں کا ایسا رنگ برنگ زیور پہنا دیا ہے کہ کوہستان بدخشاں کے بابل ہزار داستان وطن کو خیر باد کہہ کے انھیں وادیوں میں آ بے ہیں۔ اور جبکہ نہیں اپنے رقص کا تماشہ دکھاتے وقت جو سن میں آگے کے بلند آواز ہیں نغمہ شورِ عشق گھاتی ہیں تو وہ بھی اپنے معشوقوں یعنی شاہدانِ چین کے پہلو میں بٹھیکے اپنے راز و نیاز کی داستان چھیڑ دیتے ہیں۔ ایک ہر لطف و برضا سبزہ زار انھیں پہاڑیوں کے آغوش میں پچاس ساٹھ میل تک مہ جہینوں کی حرفِ برہم کی طرح پیچیدگیوں اور خم و پیچ کا تماشا دکھاتا اور اپنی رعنائی پر ناز کرنے والے پہاڑیوں کے چھلی چھلیا کھیلتا چلا گیا ہے۔

ساننے خاص فیروز کوہ کی چوٹی پر وہ زبردست اور عالی شان قلعہ ہے جو دولتِ غوریہ کا مرکز ہے۔ جس نے دوہی چار برس ہوئے دولتِ غزنویہ کا چراغ گل کیا ہے۔ اور ہندوستان کی دولت و حشمت لوٹ کے وہاں کے سونے کی طلائی کلس اپنے بڑوں پر نصب کرائے ہیں۔ جو آفتاب کی کرنوں میں شو وے دے دے کے غوری خاندان کے

عروج و اقبال کے ستارے بن گئے ہیں۔ اور عجب آن بان سے چمک رہا ہے اس وادی میں ہزار ہا جانور ہرن اور چکارے۔ ٹیل گاؤں۔ اور بارہ شگھے کمال آزادی و بے خطری سے چرتے اور آہشاروں میں پانی پیتے ہیں۔ نغمہ سنج اور نظر فریب رنگوں کے طیور شاداب و شگفتہ۔ جھاڑیوں پر بے گھٹکے اور بے خوف بیٹھ کے چمکتے اور ادھر ادھر اڑتے بھرتے ہیں۔ چوند و پرند کی یہ آزادیاں کہہ رہی ہیں کہ گویا انسان کا یہاں کبھی گزر ہی نہیں ہوا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ وادی خاص فیروز کوہ کے دامن میں ہے۔ جہاں آج کل اقبال مندی کا طوطی بول رہا ہے۔ اور سلطان ہوا الفتح غیاث الدین فتح سام خوری کا دور دورہ ہے۔ جس کی بدولت ان پہاڑوں کا کوئی شمع اور اس سر زمین کا کوئی چہہ نہیں جدھر سے ہر مہینے میں ہزاروں تیر آزما اور ہاتھی ترچھے جوان گزر نہ جاتے ہوں۔ پھر ان وحشی جانوروں میں یہ آزادی و بے خطری کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس وادی کو جو پچاس ساٹھ میل تک پہاڑوں کے اندر ہی اندر لہراتی اور معشوقانہ مست خرامی کی شان دکھاتی چلی گئی ہے۔ سلطان نے خاص اپنے لئے ایک نرہت بخش تفریح گاہ اور اپنی مشرق سپہ گری کے لئے ایک حوصلہ افزا شکار گاہ بننا رکھا ہے۔ قطعی حرمان ہے کہ کوئی شخص ان پہاڑوں کے دامن میں شکار نہ کیلے۔ اور اگر کسی نے بھی کسی جانور کو تیر کا نشانہ بنا دیا تو جان سے مارا جائے گا۔ لہذا کسی کی مجال نہیں کہ کسی طائر یا وحشی چوپائے کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھ سکے۔ چنانچہ اسی شاہی فرمان کی برکت ہے کہ اس دلچسپ مرغزار اور روح افزا وادی میں شکاری اور

شکار باہم ایسے ماتوس رہتے ہیں کہ گویا شہر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں اور دوست دشمن شہر و شکر بنے ہوئے ہیں۔ ہر نیاں کبھی کسی مقام پر ٹھہرے کسی کی نشیلی آنکھوں کی تصویر دکھاتی ہیں۔ اور کبھی وسیع وادی میں چوڑیاں بھر کے کسی کی شورخ ادائی اور کسی مست ناز کے سچل پن کا سماں پیش نظر کرتی ہیں۔

ہانگماں ایک خوبصورت ہرنی ایک پہاڑ کے نشیبی دامن سے ایسی بدحواسی کے ساتھ جس کی اس دامن و امان کے مقام میں آمید نہیں کی جاسکتی تھی بھاگتی اور چوڑیاں بھرتی نکلی۔ وہ مسطح میدان کا زیادہ حصہ نہیں طے کرتے پانی تھی کہ تین چار دو نگاہ سے طلعتیں پہاڑی گھوڑی پر سوار اور سر سے پاؤں تک جواہرات میں لدی ہوئی نمودار ہوتیں۔ تیر و کمان ان کے ہاتھوں میں ہیں۔ تریش نشانوں پر بھری ہوئی ہیں اور نوجوانی و شباب کے پروں سے اڑتی ہوئی میز چنگال شاہینوں کی طرح اس ہرنی کے پیچھے گھوڑے ڈالے چلی آتی ہیں۔ (از ماہ ملک)

## چاندنی رات سنسان میدان اور ایک سوار

اجندائے سرا کی رات ہے اور خزاں کا موسم ہے۔ دو گھنٹے سے زیادہ رات نہ آئی ہوگی۔ تارے کھلے ہوئے اور تین روز کا چاند آسمان کے مغربی کونے سے ذرا بلندی پر چمک رہا ہے۔ ہم جس مقام کا حال بیان کر رہے ہیں وہاں اس وقت عجب کیفیت ہے۔ مغرب کی طرف جدھر چاند کا گورا چہرہ نظر آ رہا ہے آدھر سفید بالوں کے سیکڑوں ٹیلے چھوٹی

چھوٹی پہاڑیوں کی طرح کوسوں پھیلتے چلے گئے ہیں۔ جہاں یہ ناہموار ٹیلے نہیں ہیں وہاں بھی قدرت نے سفید رنگ کی اجلی چاور بچھا دی ہے جو ہر وقت بجھی رہتی ہے۔ اور کبھی نہیں میلی ہوتی۔ خصوص اس وقت چاند کی دھیمی روشنی میں یہ قدرتی منچر کے ہاتھ کا دھویا ہوا فرش کچھ ایسے روپ پر ہے کہ دیکھتے ہی دل بے اختیار ہر جاتا ہے۔ سوا مغرب کے اور سب طرف سنگستان پہاڑیاں باہم ملی ایک دوسرے سے اُجھی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں۔ ان پہاڑیوں میں اکثر تو ایسی ہیں جن پر رویدگی نے نظر فریب مخملی غمیش بچھا دیا ہے اور پڑے پڑے درخت جنھیں فصل خرواں ہنوز بالکل برہنہ نہیں کر سکی ہے۔ اپنی پٹھ مروہ اور بے روپ شبنیاں آزاد جنگلی طیور کے شب لہر کرتے کے لئے پہلائے ہوئے ہیں۔

بعض پہاڑیاں اپنی سیاہ ڈراوٹی صورت سے اس سناں سین میں مسافروں کے لئے وحشتناک نمونہ دکھا رہی ہیں۔ جن پر ہوائے سوکھے اور سکڑے خشک پتے لا لاکے بچھا دیے ہیں۔ اس موسم کی ہوا معمولاً تیز چلتی ہے۔ اور اس کی خاصیت ہے کہ ہر چیز پر ایک افسردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت بھی ہوا کے جھونکے بڑے زور شور سے اوتھے اونچے قلآن سے ٹکراتے ہیں۔ افسردگی کے آثار تو رات کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ مگر ہاں سوکھے پتوں کی کھڑکھڑانے کے باعث ہر طرف سے سخت آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اور کوہستانی دروں اور قلوں کے سین میں گونج اٹھتی ہیں۔

ایسے وحشت انگیز مقاموں میں خصوص اس وقت بالکل سناٹا ہرنا

چاہئے۔ لیکن نہیں مغرب و جنوب کے کونے کی طرف سے پتوں کے گھوڑا کھڑانے کی آواز معمول سے زیادہ سنائی دیتی ہے۔ اور چند منٹ کے بعد ایک سوار نظر آتا ہے جو ایک بہت نیچی گھائی کی راہ سے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا چلا آ رہا ہے۔ گھائی میں جا بجا خشک چشموں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے بہاؤ کی جگہ پر بہت سی بالو جمع ہو گئی ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ سوار اپنی معمولی تیز روی سے گھوڑا بڑھائے چلا آتا ہے۔ پتوں کی کھڑکھڑانے کی آواز آتے آتے بعض اوقات رک جاتی ہے اور وہی سکوت پیدا ہو جاتا ہے جو اس مقام کے نمایاں ہے۔ آخر سوار اس جیشے کو طے کر آیا جس میں گھٹنوں گھٹنوں پائی ہے۔ اور بہاؤ کے رُخ نشیب پا کر تیزی سے بہ رہا ہے۔ چشمہ یہاں سے تھوڑی دور پر انہیں پہاڑیوں سے نکلا ہے۔ اور بہت سی وادیوں اور چھوٹی چھوٹی نہروں کو لیتا ہوا جنوب کی طرف دو پہونچکر نہر المقطع (دریائے کسون) میں مل گیا ہے۔ اور کیفون (کیفہ) کے پاس پتھر رزم میں گرا ہے۔ سوار نے یہ نہر بھی طے کی۔ اس کے بعد کچھ دیر بھر گیا۔ اور پھر خدا جانے کیا دل میں آئی کہ اپنے سامنے والے پہاڑ پر جو جانب مشرق واقع تھا پڑھنے لگا۔

اگرچہ چاندنی کی کم کم اور کمرے کے باعث ماند پڑ جاتے والی روشنی اسی پہلو پر پڑتی تھی مگر گھوڑے کا لیجانا نہایت دشوار تھا۔ سوار کی طبیعت میں خدا جانے کس قیامت کی ضد اور ہٹ تھی کہ گھوڑے کے بہاؤ پر چڑھ جانے کی دقتوں کو بالکل خیال میں نہ لایا۔ اور حتی الامکان بالکل صاف اور سیدھا راستہ دیکھ کر اوپر چڑھنے لگا



ٹھوڑی دیر میں اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ پلٹ کر دیکھا تو نظر بہت دور  
تک کام کرتی تھی۔ کوہ کادل کی سفید چٹانیں تو کھڑے اور ہفت باری  
کی وجہ سے نظر نہیں آتی تھیں۔ ہاں وہ سفید ٹیلے اور میدان البتہ  
دکھائی دیتے تھے جن پر ریگ نے چاندنی کے پھرنگ فرش بچھا دیا ہے۔  
پہاڑ کی بلندی پر پہنچ کے سوار نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایسا  
معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر آواز کو جو کئی طرف سے آجاتی ہے وہ غور  
سے سنا ہے۔ مگر کسی قسم کی آواز نہیں سنی گئی۔ وہ گھوڑے سے  
اُترا۔ اس کی گردن پر پہاڑ کے ٹھیکیاں دیں اور دیر تک اس کے  
بال برابر کرتا رہا۔ ناگماں تھی طرف سے ایک چچ کی آواز آئی۔  
(راز ملک العزیز اور درجن)

## منازل حیات

یہ مضمون مولوی عبدالرشید صاحب دہلوی کے ایک ناول منازلِ اہلِ اہل  
سے لیا گیا ہے۔ مولوی عبدالرشید صاحب شمس العلماء مولوی نذیر احمد  
صاحب مرحوم دہلوی کے بھائی نہایت قابل اہل زبان ہیں۔ آپ نے یہ ناول  
عورتوں کی تعلیم کے شے لکھا ہے۔ جیسا کہ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی نے  
توبۃ النصوح وغیرہ لکھی ہے۔ اس کی زبان نہایت پیاری ہے۔ خیالات نہایت  
پاکیزہ۔ جس سے اخلاق پر عمدہ اثر پڑ سکتا ہے۔ اس ناول میں انسان کی  
عمر کے چار زمانوں کے حالات کا سچا فوٹو ایک مقام پر دکھلایا ہے۔ وہ  
مضمون یہاں منتخب کیا جاتا ہے۔

## گلزار شیر خوارگی

یہ ایک چھوٹا سا مگر خوشنما و شاداب باغچہ تھا۔ مختلف عمروں کے آدمی مرد اور عورتیں باد بہاری کا لطف اٹھاتے پھر رہے تھے۔ صبح سعادت کا وقت تھا۔ گلابے رنگیں کی پیاری صورتوں نے زمین چمن کو پو قلموں کر رکھا تھا۔ شبنم نے موتیوں کے ہار بچھا دیے تھے۔ باد صبا فرحت و اہسا ط کے مژدے دیتی پھر رہی تھی۔ عورتوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ مرد جو حق ہاتھ میں ہاتھ دے ملتے بولتے۔ ادھر ادھر ٹپل رہے تھے۔ امیدوں نے اُن کے ہرے مالا مال اور دل چوچال کر رکھے تھے۔ ہرے بھرے گلزار آکھوں کے سامنے لہلہا رہے تھے۔ اور مانوں کے قدرتی چنبے کشت آئینہ کو روز تازہ کر رہے تھے۔ انہماک نظر اور حد خیال تک چپہ چپہ اور ڈرہ ڈرہ شاداب دکھائی دیتا تھا۔ وسط چمن میں ایک دودھ سی نہر کہیں لے رہی تھی۔ کیا بے فکری کا زمانہ تھا! مسافر! وہی چھوٹے چھوٹے بچے۔ بھوک لگی کنارے پر آئے۔ منہ جھکایا۔ اور سیر ہو گئے۔ ہاسے۔ کیا نعمت تھی! کہ کیچے سے لگا کر دنیا بھر کی کلفت دور ہو جاتی تھی۔ افکار و ملال خواب و خیال ہو جاتے تھے۔ رنج و غم غلط ہو جاتا تھا۔ کیا دولت تھی! جس کے مقابل ہفت اقلیم کی سلطنت بیچ و بے وقعت تھی۔ بادشاہ وقت کا حکم اتنا نامناسب تھا۔ کہ ہر شخص مسافر نوازی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس خدمت سے محروم رہ جاتا تو اپنے تئیں نہایت بد قسمت تصور کرتا۔ کیا مبارک سرزمین تھی! جو مرد و نظر آیا شگفتہ۔ جو عورت دکھائی دیا۔ وہ بلغ بلغ عورتوں کے پرے کے پرے جس وقت مسافر کو گود

میں نے کرگلکشت کو بکھلتے تھے۔ درختوں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔  
 یہ محافظ و خبرگیر جو مسافروں کی خدمت پر متعین تھے۔ ایسے اچھے لوگ  
 تھے کہ ستو طرح سے شمار تھے۔ ذرا مسافر کی پھانس لگی۔ اور بے چین ہوئے  
 ان لوگوں کی پٹیاں ستارہ صبح کی طرح روشن تھیں۔ اور ان کے دل برکت  
 نور سے مہمور۔ محبت کا سرمہ ان کی آنکھوں میں لگا ہوا تھا۔ اور خدمتگزار کی  
 کی روشنی ان کے چہروں پر چمک رہی تھی۔ مگر کا نام نہ تھا۔ رہا کا کام نہ  
 نہ تھا۔ خالص محبت تھی۔ اور سچی خدمت۔ اللہ اللہ! کیا لوگ تھے!  
 کہ جان تک دریغ نہ کرتے تھے۔ خوش قسمت میزبان تھے۔ کہ کامیابی کے  
 ساتھ ہمانوں کی خدمت کرتے تھے۔ اگر کوئی مسافر ان کی خدمت ہی میں  
 ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو جاتا تھا۔ تو گوتے تھے اور بیٹے تھے۔ یہاں ایک  
 بات دیکھ کر بہت ہی تعجب ہوا۔ بہت کم مسافر ایسے نظر آئے۔ کہ خدمت  
 محافظین کو مد نظر رکھا۔ اس خدمت کا معاوضہ تو خیر ناممکن تھا۔ جب وہ  
 وقت آتا۔ کہ وہ ان کے محتاج ہوتے۔ تو یہ آنکھ چرا جاتے۔ لہذا ان فضائل  
 کے پابند ہو جاتے۔ غیروں سے محبت کرتے۔ دوستوں سے احتلاط کرتے۔ خود  
 محافظ ہو کر مسافروں کی خدمت کرتے۔ لیکن وہ خدمت فراموش کر دیتے۔  
 جس کی بدولت خدا نے اس قابل کیا۔ پھر بھی وہ اللہ کے بندے ہر حال  
 میں خوش تھے۔ جس کو سنا یہ ہی کہتے ہیں کہ خدمت کرو۔ تمھاری سعادت  
 ہے۔ نہ کرو کچھ شکایت نہیں۔“

منزلوں مسافروں کے ہمراہ جاتے۔ اور حتی المقدور آنکھ سے اوجھل نہ  
 ہونے دیتے۔ ہر منزل میں خدمت کرتے۔ اور ہر مصیبت میں شریک رہتے  
 ان میں بعض ناعاقبت ایسے بھی تھے۔ جو عقل کی آنکھوں پر پردہ

ڈال لیتے تھے۔ اور درجہ محبت کو کمال پہ پہنچا کر جا بیجا کا امتیاز کھودیتے تھے۔ اپنے برے اعمال اور ناقص افعال کا نمونہ دکھا کر مطلب اہلی خطا کر دیتے تھے اور پہلے ہی منزل سے مسافر بیچاروں کی باٹ مارنی شروع کر دیتے تھے۔

## سراے طفولیت

سراے طفولیت ایک عالی شان محل حیات آباد میں آسمان سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ شہر کے ہر چار طرف چوڑی کی تختہ عارتیں بنی ہوئی تھیں۔ سراے کے دروازہ خاص پر رنگ رنگ کے جھنڈے ہوا میں لہا رہے تھے۔ دیواروں کی گنگاریاں۔ محرابوں کی نقش و نگار موسم بہار کا مزہ دے رہے تھے۔ رنگا رنگ کے جواہرات جوڑے ہوئے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ لوگ خوش حال اور قانع البال نہ کوئی مفلس نہ کنگال بازار کشادہ و بارونتی۔ دکان دار خلیق و منکسر مزاج عجیب مقام تھا کہ ہر طرف بے فکری کے ڈنگے بچ رہے تھے۔

سراے کے اندر ہر طرف وسیع و بچتہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ بے فکری کا دور اطمینان و قانع البالی کی حکومت تھی۔ امیری کا کارخانہ تھا۔ بادشاہت کا زمانہ تھا۔ محافظ زیادہ وہی تھے۔ جو منزل اول میں تھے۔ مگر محبت کا مژ پیلے سے بڑھ گیا تھا۔ مسافروں کی قدر و منزلت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کیا مبارک سر زمین تھی! کہ سچ و غم پاس آکر نہ پھٹکتا تھا۔ ناعاقبت اندیشی۔ انواع و اقسام کی نعمتیں ان کے دسترخوان پہ چین دیتی تھی۔ کھیل کود کے خلعت گراں بہا زیب تن۔ خوشی کا تاج سر پہ لگائے ہوئے۔ ادھر ادھر پھرتے تھے۔ کیا دن تھے۔ کہ پھر نہ آئے۔ اور کیا جگہ تھی

کہ دوبارہ دیکھتی نصیب ہوئی!۔ بعض وحسد کا گزرنہ تھا۔ فکرِ معیشت کا پتہ نہ تھا۔ دولت و عشرت کا امتیاز نہ تھا۔ نخوت و غلبت کا نام نہ تھا۔ جو ضرورت ہوئی۔ وہ رفع۔ جو خواہش ہوئی۔ وہ پوری آن کی بھولی بھولی باتوں اور سیدھے سادے معاملوں پر آسمانِ انصاف سے موتی برس رہے تھے۔ فراغت و اطمینان کا باغ خوشی و خرمی کے پھول بچھاؤں کہ رہا تھا۔ محبت و پیار کے ہار گلے میں بڑے تھے۔ کامیابی کے گلہستے طاقتوں میں چھپے ہوئے تھے۔ آرام و آسائش کی بیدیں دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ غرض ہر قطع گزارِ ارم بنا ہوا تھا۔

محافظ و خیرگیر کیسے کیسے خدمت گزار!۔ کہ حکم کی دیہ اور تعمیل کو تیار۔ ایسے ایسے ناز بردار۔ کہ ذرا سے اشارے پر جاں نثار کر لے کو آمادہ۔ انتظام اتنا معقول۔ کہ بڑے بڑے سرکش و تاجدار مسافروں کے سامنے عاجز و لاچار تھے۔ اس منزل کا تمام زمانہ آزادانہ و بیباکانہ گزرنے لگا۔ ضرورت سے پہلے اور حاجت سے پیشتر ہر چیز تیار اور موجود۔ نہ کسی بات کا کھٹکا تھا نہ کسی قسم کا خوف۔ نہ عزت کی خواہش تھی۔ نہ دولت کا ارمان۔ نہ نخوت کے اسباب۔ نہ غرور کا سامان۔ جو ملا۔ کھا لیا۔ جہاں نیند آئی۔ وہاں پڑ رہے۔ طبیعت میں شہ نہ تھا۔ اور دل میں فساد نہ تھا۔ کیا ہوگا؟ کا فکر نہ تھا۔ کیا ہو گیا۔ یہ یاد نہ تھا۔ کوئی بات خلافِ مزاج ہوئی۔ رو دیے۔ کوئی چیز اچھی ہاتھ آگئی۔ ہنس دیے۔ مگر طبیعتوں میں قبولیت کا مادہ موجود تھا۔ جو سننے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ جو دیکھتے تھے۔ وہ کرتے تھے۔ نتائجِ سفر کا وارو مدار اسی جگہ تھا۔ ذرا سی لا پرواہی بدرجہ سے بدرجہ بنا دیتی تھی۔

## چمنستان شباب

چمنستان شباب کی سرحد میں داخل ہوتے ہی طبیعت خود بخود منکشف ہونے لگی۔ ہوا کے فرصت بخش جھٹکے دل و دماغ کو تازہ کرنے لگے۔ پھولوں کی تیز اور مست خوشبو سے گوسوں تک جنگل مہک رہا تھا۔ بچوں جوں آگے بڑھتے گئے۔ دل میں امنگ اور خواہشیں پیدا ہوتی گئیں۔ پاس پہنچ کر دیکھا۔ ایک خوشنما باغ دور تک چلا گیا ہے۔ دروازے لگے ہوئے ہیں۔ چار دیواری کھینچی ہوئی ہے۔ مگر اندر جانے کے واسطے اجازت عام ہے۔ کسی قسم کی رُوک ٹوک نہیں۔ آگے قدم بڑھایا۔ تمام عالم سرسبز و شاداب نظر آیا۔ ہر قطعہ چین بہشت بریں بنا ہوا ہے۔ رنگ برنگ کے پھول کھل رہے ہیں۔ خوشبوؤں سے ہوا اور ہواؤں سے باغ کو لہکا رکھا ہے۔ گلاب کے تختے پھیلے ہوئے ہیں۔ میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے بہ رہے ہیں۔ بار آور درخت چھنڈ کے چھنڈ چھوم چھوم کر دھن کو چوم رہے ہیں۔ طائران خوش الحان ڈالوں پر بیٹھے چکار رہے ہیں۔ ہرے پھرے درخت کھڑے لہلہ رہے ہیں۔ پرند کیلیں کر رہے ہیں۔ کھلے قطار در قطار چلے گئے ہیں۔ کیلے کی چھاؤں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ سنگ مرمر کے حوض تپتے ہوئے ہیں۔ رنگ برنگ کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ وسط چمن میں ایک بارہ دری ہے۔ پٹا پٹی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مچل رومی و کاشانی کا فرش بچھا ہوا ہے۔ کینیزان نہ تو سر سے پاؤں تک جوہرات میں ڈوبی زین برق لباس سے آراستہ پیراستہ ادھر ادھر پھر رہی ہیں۔

سراے طفولیت کی طرف سے مسافر بھاگے دوڑے چلے آ رہے

تھے۔ چمنستان شباب کے اسباب دیکھ کر اس طرح دل دادہ ہوتے تھے۔  
 کہ گویا اب تمام عمر یہ فرحت و شگفتگی اُن کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔  
 اس سرزمین کی ہر چیز میں کچھ ایسا مقناطیسی اثر تھا کہ دل خود بخود  
 کھینچا چلا جاتا تھا۔ دو چار صورتیں ایسی بھی دکھائی دیں۔ جنہوں نے  
 اس بات کا پتہ لگا لیا۔ کہ یہ دل قریب جلوے عارضی و فانی ہیں۔  
 غور سے دیکھا۔ تو درحقیقت تمام چمنستان ایک جادو کا کارخانہ تھا  
 گلاب کے پودے کا ٹٹوں سے پٹے پٹے اٹھے۔ چنبیلی کے پتھوڑوں میں شہد  
 کی مکھیاں چھپی بیٹھی تھیں۔ سیلوں میں سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے۔  
 چشموں کا پانی دیکھنے میں صاف شفاف۔ مگر پینے میں زہر ہلاہل۔ چور۔ قزاق  
 گرہ کٹ۔ آکھائی گیرے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ اور اپنے فن کے  
 ایسے کامل و ہوشیار۔ کہ کیسا بھی تجربہ کار آدمی کیوں نہ ہو۔ بات کی۔ اور  
 گرفتار ہوا۔ نشتے کا سا عالم تھا۔ جو نظر آیا۔ وہ بچو و سرشار۔ دیواروں  
 پر خوبصورت تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ مگر تصویر ایک بھام نزویر تھا۔ ذرا  
 ہنسی کا اٹھا کر دیکھا۔ اور گلے کا بار ہوئی۔ جو چہرہ تھی۔ دیکھنے میں کچھ برتنے  
 میں کچھ۔ ہوا کے خوشگوار چھوکوں تک میں سہکتا ملی ہوئی تھی۔ ذرا ہوا لگی  
 اور مسافر کچھ کا کچھ ہوا۔ بارغ کے اُس طرف ایک بیابان تھا۔ ڈھاکے کا  
 جنگل گوسوں دور چلا گیا تھا۔ جانور صحرائی ہر طرف بسے ہوئے تھے۔ درندوں  
 کی خوفناک آواز سے رات کو تمام جنگل گونج جاتا تھا۔ بھڑیے بسا اوقات  
 اندر گھس آتے تھے۔ شیروں کے گرجے کو خون لگا ہوا تھا۔ جیتے ہر وقت تاک  
 لگائے رہتے تھے۔ ہاتھیوں کا غول بارہا اُور نکل جاتا تھا۔  
 چمنستان شباب کے پانی میں خاص طور پر یہ تاثیر تھی۔ کہ مسافر

اپنی اصلیت بھول جاتا تھا۔ حرص و تمنا دامنگیر ہو جاتی تھی۔ خواہش و ارمان کا ہجوم ہو جاتا تھا۔ مزاج میں سخت آ جاتی تھی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ جاتے تھے۔ حسن و عشق کی تصویریں دل کو شوشہ گر لیتی تھیں۔ اہلانِ حقوق ظلم و تعدی عادات ہو جاتے تھے۔ خوفِ خدا غارت ہو جاتا تھا۔ خود غرضی کا چال ایک طرف بچھا ہوا تھا۔ علائق کی زنجیریں دوسری طرف پڑی ہوئی تھیں۔ غرض از ابتدا تا انتہا جہنستان اور بارہ دری ایک سانچا تھا۔ کہ مسافر کو ڈھالا۔ اور دوسری طرف پھینک دیا۔ گرفتارانِ پلا ہاتھ میں ہتکڑیاں پاؤں میں بیڑیاں جکڑے ہوئے اور کسے ہوئے دیکھے کھا کھا کر باہر نکلے تھے۔ زمانہ گذشتہ کی ناوگاہ دو چار کلنگ کے ٹکے وٹن پانچ بدنامیوں کے تنے باقی رہ جاتے تھے۔ گناہوں کی بھاری گٹھری سر پہ ہوتی تھی۔ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ مگر جو قدم اٹھاتا تھا۔ پھر ٹپٹ نہیں سکتا تھا۔

یہ لوگ اپنے پاؤں میں کٹھا ڈیاں مارتے تھے۔ ورنہ خود جہنستانِ شباب کے واقعات اگر چشمِ بصیرت سے دیکھتے۔ اور نالِ صحیح کرے۔ تو اصلاح کو کافی تھے۔ بیمار پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ مصیبت زدہ ہرج چلا رہے تھے۔ قبرستانِ قبروں سے اور مڑکھٹ کھو پڑیوں اور ہڈیوں سے پٹ رہے تھے۔ کوئی ماں کے غم میں سوگوار تھا۔ کوئی باپ کے رنج میں بے قرار کسی کی بہن چھٹ رہی تھی۔ کسی کا بھائی خدا ہو رہا تھا۔ ایک جوان بیٹی کو تو رہا تھا۔ دوسرا بیٹے پر جان کھو رہا تھا۔ کوئی تو رہا تھا۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ کہیں پیدائش۔ کہیں موت۔ کہیں چھٹی۔ کہیں ہمارے کہیں دن۔ کہیں رات۔ زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز پرچ میں ڈوبی



ہوئی۔ مرد مہنوم۔ عورتیں متفکر۔ غرض جو تھا بڑھ چلا ہو۔ یا جوان۔ جوان۔ حیران و پریشان۔ عظیم الشان محل و بیان۔ پڑے تھے۔ سکین و پچھتہ عمارتیں۔ سنسان کھڑی تھیں۔ آبادی بے شمار تھی۔ مگر ہر ایک اپنے دکھ درد میں گرفتار تھا۔ بہت سے ایسے بھی تھے۔ جن کو خدا نے ہر اعتبار سے مالا مال کر رکھا تھا۔ غنایت ایزدی شامل حال تھی۔ صاحب اولاد تھے۔ فایز بہال تھے۔ مگر غور سے دیکھا تو رنج و آفات میں بال بال جکڑے ہوئے تھے۔ مسابقت و غفلت کی انگلیاں ان کے کانوں میں بھسی ہوئی تھیں اور طبع و حرص کے پردے آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے۔

## عالم صغیر یا دریائے انحطاط

چھستان اشباب کے اس کنارے پر حیات آباد سے ملا ہوا۔ دریائے انحطاط نہیں لے رہا تھا۔ لوگ کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر پارا تڑتے۔ کئی کشتیوں میں کر رہے تھے۔ موجوں کے تھپہڑے۔ پانی کے گرداب۔ پہاڑوں کی چٹانیں۔ باد مخالف کے جھٹکے۔ دہارے کے سائے بھی مشکل سے آنے دیتے تھے۔ غفلت و لاپرواہی کے ناخدا جب کسی بلا کا سامنا کرتا تھا۔ پرہیزگار رکھ کر بیٹھ جاتے۔ مسافروں کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ساتھ کی کشتیاں برابر ڈوبتی چلی جاتی تھیں۔ اور انہی پر بادیاؤں کا خیال بھول کر نہ آتا تھا۔ حیات ابدی کا تکیہ لگائے ہوئے۔ ہوس داروں کے پیٹھے زائے سننے چلے جاتے تھے۔ اختتام سفر کا کوئی وقت معین نہ تھا۔ زندگی کے تمام سامان کشتیوں میں موجود تھے۔ اور دنیا بھر کے کاروبار پانی میں ہو رہے تھے۔ عاقبت اندیشی کا گزر نہ تھا۔ انجام

پر نظر نہ تھی۔ غور کا سودا دماغوں میں سایا ہوا تھا۔ طبع زر و سہت  
حقیقت پھر رہی تھی۔ ذرائع تا جا بڑگو میں ٹوٹ رہے تھے۔ بے ایمانی کی گھٹا  
سروں پر چھائی ہوئی تھی۔ نام و نمود کے کدے نئے کوسوں تک تیرہ و تار کر  
رکھا تھا۔ تانہ تار کی دنیا کا ابر تلا ہوا سروں پر کھڑا تھا۔ مگر ہٹ و دھرمی  
اور خود پسندی کی خوبصورت ویسیاں آنکھ اٹکھانے کی مہلت نہ دیتی تھیں  
ریا کاری کا مذاظم برپا تھا۔ مگر دفریب کے گھڑیاں منہ کھولے بیٹھے تھے۔  
اتلان حقوق کے بھنور جا بجا پڑے تھے۔ مگر یہ امید کے بندے نہ پھو  
من و دیگرے نیست کے نعرے مار رہے تھے۔

گناہ اور قصور کے اونچے اونچے پہاڑ پرا جمائے کھڑے تھے۔ قلب نما اور  
دور بینیں خاک کام نہ کرتی تھیں۔ باپ کی ناؤ مگر کھاک بیچ منہ صا میں  
ڈوبتی تھی۔ ساتھ کی کشتیوں کو ڈوبتا دیکھ کر بھی باقی ماندہ ہمسفر  
احتیاط نہ کرتے تھے۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا۔ کہ جو ڈوبا۔ وہ اسی نتیجے کا  
سزاوار تھا۔ جھک کو کوئی کھٹکا نہیں۔ دوسری کشتیوں کی تباہی دیکھ کر ہستے تھے  
اور جب اپنے اوپر آکر پڑتی تھی۔ تو چیخے جاتے تھے اور ڈوبتے جاتے تھے۔

وریاء، انحطاط میں ایک جزیرہ نظر آیا "جزیرہ ندامت" چند  
نیک سیرت بزرگ صورت پھوس کی جھونپڑیاں ڈالے ہوئے سرنگوں بیٹھے  
تھے۔ ان کی سپید ڈاڑھیاں۔ ان کے چہروں پر نور برسا رہی تھیں۔  
فضیلت کے بڑے بڑے علمائے سر سے بندھے ہوئے تھے۔ مگر فتنہ برادری  
کی چھینٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور کھٹے پڑی ہوئی پیشانیوں پر کلنگ  
کاٹکا چمک رہا تھا۔ افعال گذشتہ کا تاسف اور اعمال کی پشیمانی  
چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ سر سے پیر تک عرق خجالت میں ڈوبے

عروسہ نے آسمان پر نگاہ تھی۔ اور لب پر اللہ ہی اللہ تھا۔  
ایک گروہ دیکھا۔ تو نے بالکل بیکار ہو گئے تھے۔ منجھ سے بات نہ نکلتی  
تھی۔ سر پر موت منڈلا رہی تھی۔ مگر حسرت و ارمان دونوں طرف مڑ چلی  
ہلا رہے تھے۔ انقلاب زمانہ نے ان کی صورتیں بگاڑ دی تھیں۔ دنیا ان سے  
بھاگ رہی تھی۔ اور وہ دنیا کو پٹ رہے تھے۔

ایک جرم غیر عورتوں کا ایسا ملا۔ کہ اس کمری میں بھی جب کہ قبروں  
میں پاؤں لگائے۔ بیٹھی تھیں۔ اپنی نمائش ظاہری سے فرصت نہ تھی۔  
نفس و خند کا جال آنکھوں میں پھیلا ہوا تھا۔ نخوت و غیبت کے تیل  
سے سرگندہ سے ہوئے۔ کذب و افترا کا دیور پہنے ہوئے۔ نافرمانی کا جھومر  
لگا ہوا۔ گر و فریب کا ٹکڑہ لگائے ہوئے۔ حیات ادبی کا پٹہ کھائے ہوئے  
تن تن کر اپنے حزن صورت کو دیکھ رہی تھیں۔ ایک شخص کو دیکھا۔ آنکھوں  
سے اندھا۔ ہاتھوں سے ٹولا۔ پاؤں سے لنگڑا۔ منجھ میں دانت نہیں پیٹا  
میں آنت نہیں۔ ڈاڑھی سفید بچکے کا پر۔ پلکیں رولی کا کالا۔ ایک درخت  
کے نیچے کھڑا بیاج کے ٹوٹے کو زور رہا تھا۔

اس سے ملی ہوئی سرحد عدم آباد تھی جن کی پختہ سنگین ضعیف آسما  
سے باتیں کر رہی تھی۔ بلندی کا یہ حال تھا۔ کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکتا  
تھا۔ وسعت و رفعت کی یہ کیفیت تھی۔ کہ اندر کی آواز باہر نہ آتی تھی  
مسافروں کو لوگ پھاٹک تک پہنچا سکتے تھے۔ آگے کا کچھ حال معلوم نہ  
ہو سکتا تھا۔ دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ جس پر لکھا ہوا تھا۔  
مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنا سفر نیک نامی کے ساتھ پورا کر کے آئے۔

## مرزا محمد رفیع سودا

پیدائش دہلی ۱۱۲۵ھ وفات لکھنؤ ۱۱۹۵ھ

سودا کا تخلص۔ مرزا محمد رفیع۔ نام۔ شہر دہلی کو آگے کہاں سے فرشتا  
ان کے باپ مرزا محمد شفیع میرزایان کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری  
تھا۔ مرزا محمد شفیع بطریق تجارت وارد ہندوستان ہوئے۔ ہند کی خاک و ان  
گہر نے ایسے قدم پکڑے کہ یہیں رہے

سودا ۱۱۲۵ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں پرورش اور تربیت پائی  
کابلی دروازہ کے علاقہ میں ان کا گھر تھا۔ بموجب رسم زمانہ پہلے سلیمان علی  
خان و قادیان کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ خان آرزو کے شاگرد  
نہ تھے۔ مگر ان کی صحبت سے فائدہ بہت حاصل کئے چنانچہ پہلے فارسی  
شعر کہا کرتے تھے۔ خان آرزو کی فہمائش سے اردو زبان میں شعر کہنے لگے  
طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دہلی جیسے شہر میں انکی استاد  
نے خاص دھام سے اقرار کیا کہ ان کے سامنے ہی ان کی غزلیں گھر گھر اور  
کوچہ و بازار میں خاص دھام کی زبانوں پر چامی تھیں۔

جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا۔ تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے  
لئے دینے لگے۔ مرزا بڑے نازک مزاج اور نہایت غیور تھے۔ ایک دن کسی  
بات پر بادشاہ سے تاراض ہو گئے۔ ہر چند بادشاہ نے بلوایا۔ نہ گئے۔ دہلی  
کے اکثر ائمہ خصوصاً مہربان خان و بسنت خان ان کی بڑی قدر کرتے  
تھے فارغ البالی سے بسر ہوتی تھی۔

جب ان کے کلام کا شہرہ لکھنؤ تک پہونچا۔ تو نواب شجاع الدولہ  
نے کہاں استیاقی سے خط لکھ کر خرچ سفر بھیجا۔ اور طلب کیا۔ انھیں

دلی چھوڑنا گوارا نہ ہوا۔ جواب میں فقط اس رباعی پر حسن معذرت کو ختم کیا۔  
 سودا اپنے دنیا تو بہر کوکب تک؟ آوازہ ازیں کو چہ پاں کوکب تک؟  
 حاصل ہی اس سے نہ کہ دنیا ہوئے بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر کوکب تک؟  
 کئی برس کے بعد وہ قدر دان مر گئے زمانے بدل گئے۔ سودا بہت گھبرائے۔ ساتھ  
 پندرہ برس کی عمر میں انکو دلی چھوڑنا پڑا۔ چند روزہ فرتخ آباد میں قیام پناہ  
 کے پاس رہے وہاں سے لکھنؤ پہنچے۔ **نواب شجاع الدولہ کی**  
 ملازمت حاصل کی۔ وہ بہت اعزاز سے ملے۔ اور ان کے آنے پر کمال خورندگی  
 ظاہر کی۔ لیکن یا تو بے کلفتی سے یا طعن سے اُنکا کیا کہ ”مرزا وہ رباعی تمہاری  
 اب تک میرے دل پر نقش ہے“ اور اسی کو کمر پڑھا۔ انہیں اپنے حال پر  
 بڑا رنج ہوا۔ اور بیاس و تعدادی پھر دوبارہ نہ گئے۔ یہاں تک کہ شجاع الدولہ  
 مر گئے۔ نواب شجاع الدولہ کے بعد ان کے بیٹے **نواب آصف الدولہ**  
 نے چھ ہزار روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور نہایت عزت سے ان کو رکھا تقریباً  
 ۶۰ برس کی عمر میں <sup>۱۹۵۵</sup> میں وہیں انتقال کیا۔

سودا اردو کے سسٹم البشوت استاد ہیں۔ انھوں نے تقریباً تمام  
 اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر اردو میں قصائد کا کتنا۔ اور یہ  
 اس دھوم دھام سے۔ اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر پہنچتا امن کا  
 پہلا نمونہ ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ غافل  
 و جہان ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے کلام کا زور  
 و شور انوری اور خاقانی کو دیتا ہے۔ اور نزاکت مضمون میں عربی و ظہوری  
 کو شرماتا ہے۔

مرزا کے کلام کے خصوصیات۔ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے  
 ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست گرد بیان ہے۔ جیسے اگل

کے شعلے میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی و ترتیب کی دہشتی سے لفظوں کو اس دور بست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں۔ گویا ولایتی پہنچ کی چاتیں جڑی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصہ ہے۔ خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں۔ تشبیہ اور استعارے بھی ان کے کلام میں ہیں۔ مگر اتنے جیسا کھانے میں نمک۔ ان کی طبیعت ایک ڈھنگ کی پابند نہ تھی۔ نئے نئے خیال اور قائلے جس پہلو سے جتے دیکھتے۔ جما دیتے تھے۔

جن اشخاص نے زبان آرو کو پاک صاف کیا ہے۔ مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ انھوں نے فارسی محاوروں کو سمجھا شامیں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے جو کہیں سے جدا نہیں معلوم ہوتے۔ ہندی زبان کو فارسی محاوروں اور استعاروں سے نہایت زور بخشا ہے انھیں کا زور طبع تھا۔ کہ جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترکیب پاکر تیسری زبان پیدا ہو گئی۔ اور ایسی قبولیت کا حاصل ہوئی۔ کہ آئندہ کے لئے وہ ہی ہندوستان کی زبان ٹھہری جس نے حکام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کر لیا۔

مرزا قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ مگر غزل میں میر کے برابر سوز و گداز نہیں۔ قصوف ان کا حصہ نہیں۔ وہ میر و رو کے حصہ کا مضمون ہے۔

### ۱۔ قصیدہ ساریہ

آٹھ گیا بہمن دوسے کا چستان سے گل	تیغ آردی نے کیا ملک خزان مستاصل
سچہ شکر میں ہے شہنشاہ ہر ایک	دیکھ کر باغ جہان میں کرم عود جل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض	ڈال سے بات تلک پھول سے لیکر تاپیل
واسطے خلعت نوروز کے ہر بلغم کے بیچ	آب جو قطع لگے کرنے روش پر مٹل
بخشتی ہے گل نورشتہ کی رنگ آمیزی	پوشش چھینٹ قلعہ کار بہر دشت و جبل

عکس گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جسکے آگے  
 تار بارش میں پروتے ہیں گہراے نگرگ  
 بار سے آب رواں عکس ہجوم گل کے  
 شلخ میں گل کی تزاکت پر ہم ہے پودچی  
 جوش روئیدگی تماک سے کچھ دور نہیں  
 دم حسی سے فزون فیض ہوا ہے بات تک  
 فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی  
 حد ایام کے پیش از مدد نامیہ سے  
 سبز ہوتا ہے فصیحی کے سبب سے ہر بار  
 دست گل خوردہ و شلخ گل و گلزار ہم  
 غنیمت پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ  
 آوے ہے انکے نظر لاکھ طرح کا وہ پھولی  
 یا سمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا  
 چشم نرگس کی بصارت کے زبں ہے درپے  
 اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح  
 آب جو گرد چمن لمعہ خورشید سے ہے  
 سایہ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر  
 رنگ نے ربیہ آئینہ کیا ہے پیدا  
 برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے  
 لو کھڑائی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم  
 اتنی ہے کثرت لغزش بہ زمین ہر باغ

کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اول  
 ہار پہنائے کو اشجار کے ہر شوبادول  
 لوستے ہے سبزہ یہ از بس کہ ہوا ہے بے گل  
 شمع سماں گرمی نظارہ سے جاتی ہے بچل  
 شلخ میں گاؤ زمین کے بھی جو پھولے گول  
 دین میں قسم جمادات سے شاید ہو خلل  
 کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات پل  
 بچہ مرغ جن تخم سے آتا ہے نکل  
 جو زباں سے سخن اب طوطی کے آکا ہے نکل  
 بہمان نشوونما کرنے میں ہیں ضرب مثل  
 گل ہم پونچے ہے عقدہ ہو کسی طرح کامل  
 ان گلوں چھٹ جو نگہ کے ہیں مستل  
 جاہتی ہے بہماجت کرے سبز سے بدل  
 غنیمت لالہ نے سرمہ سے بھری ہے مکمل  
 چشم سپار گلستان میں جھپکتی نہیں پل  
 خط گلزار کے صفحہ یہ طلائی جدول  
 ساغر لعل میں جوں کیجئے زمرہ کو حل  
 تیج کسمار ہوئی بس کہ ہوا سے صیقل  
 گل کو دیکھو تو نگہ جارہے سنبل پر پھل  
 پانوں رکھتی ہے صبا چمن میں گلشن کے شہل  
 جو ٹر شلخ سے آٹرا سو گرا سر کے بل

فیضی تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے  
دانہ جس شور زمین میں نہ پھلا دہقان سے  
کشت کرنے میں ہر اک تخم سے اوفیض ہوا  
جو ہری کو چمنستان جہاں میں اس فصل  
تاکجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی  
شہد تیکے جو لگے نشتر زنبور عسل  
سفر وال دانہ شبنم سے ہوا ہے جنگل  
گرنے گرتے بڑے بڑے برگ و براتا ہے نکل  
اگیا لعل و زمرود کے پیر کھنے میں خلل  
اٹکرا ز فیض ہوا سبز شود و ر منقل

### قصیدہ - ۲

ہو جب کفر ثابت ہے وہ نفعائے مسلمانی  
ہنر پیدا کر اول ترک کیجو تب لباس اپنا  
فراہم در کا کرنا باعث اندوہ دل ہووے  
خوشامد کہ برس عالی طبیعت اہل دولت کی  
عروج دست بہت کو نہیں کچھ قدر پیش و کم  
کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی  
اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا  
ادیت وصل میں وونی جدائی سے ہو عاشق کو  
موقع جہاں اباب ہنر کو بے لباسی میں  
ہر رنگ کو رہ تماموں حرف ناسزا سن کر  
یہ روشن ہے ہر رنگ شمع ربط بادو آتش سے  
نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا  
کوہ ہے وہر زینت ظالموں پر تیرہ در در کی کو  
طلح مہر ہو پا مال حسرت آسمان اوپر

نہ لوثی شیخ سے زناں تسبیح سلیمانی  
نہ ہو جو تیغ بے جوہر و گر نہ تنگ عربانی  
نہیں کچھ جہ سے غنچہ کو حاصل جہ پیشمانی  
نہ بھارے آستین ککشاں شاہوں کی پیشانی  
سدا خورشید کی جگ پر مسادی ہے زرافشانی  
ہوئی جب تیغ زنگ آلود کم جاتی ہے پیمانی  
ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمر خضر طولانی  
بہت رہتا ہے نالای فصل گل میں مرغ بستانی  
کہ ہو جو تیغ با جوہر اسے عزت ہے عربانی  
کہ تابد گو صدا غیب سے سینے پیشانی  
موافق گرد نہ ہووے دوست ہے وہ دشمن جانی  
قفص جھینک ہے داغ دل سے نصرت کی کو پیمانی  
کہ زیب ترک چشم یاد سرمہ ہے صفا جانی  
لکھوں گا پھر غزل گراں نہیں تیں طلح جانی



## مطلع ثنائی

فلک بال ہا کوئل میں سوئے ہے کس رانی  
کہ چشم نقش پاسے تا عدم نکلی نہ حیرانی  
وگر نہ دیکھ آئینہ کو پتھر ہو گئے پانی  
کہ ہے جمعیت خاطر مجھے ان کی پریشانی  
گرہ غنچہ کی کھولے ہے صبا کیونکر ہا سانی  
کہ اعضا دید و زنجیر کی کریمے ہیں مرہ گانی  
مگر زانو سے آب باقی رہا ہے ربط پیشانی  
نقطہ غامے کے سر کوٹے گی ایسی زبان دانی  
ادائے چمن پیشانی و لطف زلف طولانی  
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پیشانی  
مگر بہار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی

عجب نادان ہیں جنگوئے عجب تلخ سلطانی !  
نہیں معلوم آن نے خاک میں کیا کیا لاد کھیا  
ہماری آہ دل تیرا نہ تراوے تو یا قنعت  
توڑی زلفوں سے اپنی رو سیاہی کہ نہیں سکتا  
زمانے میں نہیں کھلتا ہے کار بستہ حیراں ہوں  
جنوں کے ہاتھ سے سر تا قدم کا بسیدہ اٹا ہوں  
نہ رکھا جگ میں رسم و رتی اندھ و روزی سے  
سینہ بختی میں اے سودا نہیں طول امل لازم  
سمجھ اسے نا قباحتم نم اب تک یہ بیان بگا  
خدا کے واسطے باز آ تو اب ملے سے خواہاں کے  
نظر رکھنے سے حال آنکے چشم و زلف کے اوپر

## غزلیات

جوں شمع سراپا ہوا گر صرف زباں کا  
کھلتا ہے ابھی بل میں طلسمات جہاں کا  
جوں شمع حرم رنگ جھلکتا ہے بتاں کا  
جب چشم کھلی گئی کی تو عالم ہے خواں کا  
لیکن نہیں خواہاں کوئی داں جس گراں کا  
مضمون ہی ہے جڑیں دل کی فغاں کا

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا  
پردے کو نقین کے در وں سے اٹھاوے  
نک دیکھ صغم خانہ عشق آن کے لے شیخ  
اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن  
و کھلائے بیجا کے چھ مصر کا بازار  
سودا جو کبھی نکوش سے بہمت کے سنے تو

ہستی سے عدم تک نفس چنڈکی ہے راہ دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

۳

کرتا ہوں سیر جب سے باغ جہاں بنایا  
اک نام تو سنا ہے۔ دیکھا نہیں کسٹوٹے  
جتنے ہیں خبر ویاں سب دل ستان میں لیکن  
جنس دوم کو اولیٰ بزار کھولتا ہے  
صدرتے میں تیرے یارب ہم سوں کو کر کے پیل  
ویر و حرم کو دیکھا۔ اللہ رے فضولی  
تو مت پچار اس کو اسے باغبان اکہم نے  
عالم کے غمری آسا ہے طوق بندگی کا  
اکثر نشان بنے ہیں عالم میں نام خاطر

۳

ایا تھا آہ کس لئے اور کیا میں کر چلا  
اس روز و شب کے صحنے میں میں اب تو چلا  
عزت کبھو نہ دی یہ کہ پوچھے دیکھ کر چلا؟  
دامن کو میرے سامنے گل چھاڑ کر چلا

۴

سیر جن غرجو کی ہم نے تو کیا بیچ؟  
شیشے کو بھی توڑو تو نکلتی ہے اک آواز  
اسباب جہاں دل نے کیا جب نظر انداز  
اس جامہ پہ اتنا ناچھر بلبلے کی طرح

رنگین ہے جوانی کا گل اس میں سونپا بیچ  
عاشق ہی کا وہ دل ہے کہ ٹوٹے تو صدا بیچ  
پوچھا جو میں کیا دیکھے ہے دیوانے کہا "بیچ"  
جامہ پہ تڑپو بیچ ہے تو غیر ہوا بیچ

کیا قافلہ عمر سبک رہے کہ جس میں  
شہابان سے سوال اپنا عونیت شکنی ہے

۵  
دل نا آشنائے نالہ سے صدر رہے جس بہتر  
نہ دیکھی خوش دلی جز یک چشم ہم نے غم میں  
وفا کے گل میں لے چشم مر دوت باغیاں میں ہے  
نظر میں آنکلی جنگو دولت استغنائی بخشی ہے  
بلند آتش جہاں ہوئے ہوائے بخشش اب سے  
بگر دہل ہے طوف کعبہ سے نرواپنے لے شہم  
کسے ہے دیکھ کر شائے کو یہ سوارے دیوانہ

۶  
جاتے ہیں لوگ قافلہ کے پیش و پس چلے  
کیوں صبا! سلام ہمارا ہمار سے  
اے غنچہ آنکھ کھول کے نگ تو چمن کو دیکھ  
تیرے سخن کو میں بہ سرو چشم ناصحا!  
نکلا جو دلی سے نالہ تو سینے سے دھڑکے  
صیاباب تو کیجے قفس سے ہمیں رہا  
کام اس گلی میں سر سے یہ سودا گزر چکا

نوحہ میر درد  
وفات دہلی ۱۱۹۹ھ  
پیدائش دہلی ۱۱۷۱ھ  
درد و تخلص نوحہ میر نام زبان اردو کے چار رنگوں میں سے ایک رنگ

ہیں۔ خواجہ محمد ناصر عذلیب ان کے باپ تھے اور شاہ گلشن صاحب سے  
نسبت ارادت رکھتے تھے۔ نملاندان ان کا دلی میں بباغت پیری و مریدی کے  
نمایت معزز اور معظّم تھا۔ علوم رسمی سے آگاہ تھے۔  
ان کا دیوان اردو مختصر ہے۔ سوا غزلیات اور ترجیع بند اور رباعیوں کے  
اور کچھ نہیں قصائد و مثنوی وغیرہ۔ کہ عادت شعرا کی ہے۔ انھوں نے نہیں لکھی  
بادجو اس کے سودا اور میر تقی کی غزلوں پر جو غزلیں لکھی ہیں۔ ہرگز آن  
سے کم نہیں۔

تصنیف کا شوق طبیعت میں خدا داد تھا۔ علم تقوٰت میں بہت سے رسالے  
اور بڑی بڑی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ان کی غزل ۷ شعر و شعر کی ہوتی ہے  
مگر انتخاب ہوتی ہے خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحر میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے  
گویا تلواروں کی آب داری نشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور  
متین تھے۔ کسی کی ہجو سے سودا کی طرح ان کی زبان آلودہ نہیں ہوئی تقوٰت  
جیسا انھوں نے کہا۔ اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا  
خواجہ صاحب ۲۲ صفر یوم جمعہ ۱۱۹۵ھ ۶۸ برس کی عمر میں شہر دہلی میں فوت  
ہوئے کسی مرید یا اعتقاد سے تاریخ کسی رع دو حیف دنیا سے سد معار و وہ خدا  
کا محبوب۔

## غزلیات

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے ترن کا؟  
اُس مستِ عزّت پہ کہ تو جلوہ نما ہے  
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہن  
ہے خون اگر جی میں تو ہے ترے غضب سے  
مانند جہاب آنکھ تو اسے درد کھلی تھی  
حقاً کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا  
کیا تاب گذر ہووے تعقل کے قدم کا؟  
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا  
اور دل میں بھر و سا ہے۔ تو ہے ترے کرم کا  
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

۳  
مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بستخانہ تھا  
وہ نادانی کہ دقت مرگ یہ ثابت ہوا  
جیٹ کتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزان  
ہو گیا مہمان سرسبز کثرت موبہوم کہ  
بھول جائے خوش رہے بھٹ وہ سابقہ مت یاد

۴  
اکسیر پر مٹوس اتنا نہ ناز کرنا  
کب دل ملے کسی کا ہم غمزدون سے کھل کر؟  
اے آنسوؤ! نہ آؤ گے کچھ دل کی بات منہ پر  
تو اپنے ہاتھوں آپ ہی پڑتا ہے تقریب میں  
ہم جانتے نہیں ہیں اسے درو کیا ہے کعبہ؟

۵  
مثل نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا  
یارِ ابد دل ہے یا کوئی مہمان سرسبز ہے؟  
ساتی ابرے بھی دل کی طرف تک نگاہ کر  
تلو بار سوز دل نے ہے دی آگ پر ہنوز  
ہم کب کے چل بسے تھے یہ اے مژدہ وصال!  
از بسکہ ہم نے حرفِ دولی کا اٹھا دیا

۶  
ہم سبھی مہمان تھے وہ تو ہی صاحبِ بستان تھا  
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا ہوتا افسانہ تھا  
آشنا اپنا بھی وہاں اک سبز بیگانہ تھا  
وہ دلِ خالی جو تیرا خاص خلوت خانہ تھا  
درو یہ مذکور کیا ہے؟ آشنا تھا یا نہ تھا

۷  
بہتر ہے کمی سے دل کا گدا کرنا  
ہے اپنے دل سے لازم چون غنچہ ساز کرنا  
لڑکے ہو تم۔ کہیں مت افشاں ساز کرنا  
اسے امتیاز نادان ملک امتیاز کرنا  
جیدھر ہے وہ ابرو او دھرم ساز کرنا

۸  
ہم روسیہ جاتے رہے نام رہ گیا  
غم رہ گیا کبھی کبھو آرام رہ گیا  
لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا  
دل وہ کباب ہے کہ جگہ خام رہ گیا  
کچھ کچھ ہوتے ہوتے سرا بنام رہ گیا  
اسے درو اپنے وقت میں ایہام رہ گیا

۹  
جگ میں اگر ابرو او دھرم دیکھا  
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی  
نالہ فریاد آہ اور زاری  
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی  
زور عاشق مزاج ہے کوئی

جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا  
آپ سے ہوش کا سو کر دیکھا  
ہم نے نلو نلو طرح سے خر دیکھا  
درو کو قصہ مختصر دیکھا

۶

اگرچہ دل نہ ستاتا رہے گا  
میں جاتا ہوں دل کو تیرے پاس چھوڑے  
گلی سے تیرے دل کو لے تو چلا ہوں  
جفا سے غرض امتحان وفا ہے  
فقس میں کوئی تم سے اے ہم صفیرو  
خفا ہو کے اے درو مر تو چلا تو

تو اک دنِ مہاجی ہی جاتا رہے گا  
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا  
میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہے گا  
تو کہ کب تلک آتا رہے گا  
خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا  
کساں تک ہم اپنا چھپاتا رہے گا

۷

دنیا میں کون کون نہ یکبار ہو گا؟  
پھرتی ہے میری خاک صبا در بدر لے  
آگاہ اس جہاں سے نہیں غیر بیخودان  
طوفانِ نوح نے تو ڈبائی زمیں فقط  
واعظ کسے ڈرائے ہے یوم الحساب سے؟  
پتھو لے گی اس زبان سے گلزارِ معرفت  
آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاجِ دہر  
اے درو جسکی آنکھ کھلی جس جہاں میں

پر نہ پھر اس طرف نہ کیا اس نے جو گیا  
اے چشمِ اشکبار! یہ کیا تھکو ہو گیا  
جاگادہ ہی ادھر سے جو منہ آنکھ سو گیا  
میں ننگِ خلق ساری خدائی ڈبو گیا  
گر یہ مرا تو نامہ اعمال دھو گیا  
ہاں مین زمینِ شعر میں یہ تخم بو گیا  
میں گرچہ گرم و سرد نہ مانہ نہ سو گیا  
شبِ نیم کی طرح جان کو اپنی وہ رو گیا

تجھی کو جو یاں پلوہ فرمانہ دیکھا  
مرا غنچہ دل ہے وہ دل گرفتہ  
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں  
اذیت مصیبت ملامت بلائیں  
کیا مجھ کو داغوں سے سر درخشاں  
تفاؤل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے  
جواب رخ یار تھے آپ ہی ہم  
شب و روز اُسے درو پہ پہن گئے

ہوں نورِ نظیر تیرا تصور  
جدا اہل صفا بتا تو جوں عکس  
کس نے یہ ہمیں بھلا دیا ہے؟  
تقاعسالم جبر کیا بستائیں  
جس طرح ہوا اسی طرح سے  
افسوس نہ درو اسکو جب تک

کچھ لائے نہ تھے کہ کٹو گئے ہم  
جوں آئینہ جس پہ یاں نظر کی  
ما تم کدہ جہاں میں جوں ابر  
ہستی نے ٹٹک جکا دیا تھا

تھا پیش نظر جدھر گئے ہم  
اے آئینہ کس کے گھر گئے ہم  
معلوم نہیں کہ صر گئے ہم  
کس طور سے زلیت کر گئے ہم  
پیمانہ عمر بھڑ گئے ہم  
ہو دے ہے خبر گذر گئے ہم

تھے آپ ہی ایک سو گئے ہم  
ساتھ اپنے دو چار ہو گئے ہم  
اپنے تین آپ رو گئے ہم  
پھر کھلتے ہی آنکھ سو گئے ہم

یاروں ہی سے درد ہے یہ چرا۔ پھر کوئی نہیں ہے جو گئے ہم

۱۱

گلیم بخت سپہ ساریہ وار کھتے ہیں  
بسان کاغذ آتش زدہ مرے گلوں  
بلایا ہے نشہ دنیا کہ تا قیامت آہ  
جہاں کے باغ سے ہم دل سوانہ بھل پایا  
ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں چھپر؟  
فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلوں گزرتی  
ذبح تھے ہیں۔ شہرہ نہ شعلے سب اب  
جنھوں کے دل میں بگڑی ہے نقشِ عبرت  
وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا

۱۲

کیا فرق دل و گل میں کہ گل میں فونہ؟  
جو کچھ کہ ہم نے کی ہے۔ نمنا ملی۔ مگر  
جوں شمع جج ہو میں گدا اہل زباں ہزار  
جوں صبح چاک سینہ مراے رفوگران!  
اے دردِ زنگ صورت اگر اس میں جا کرے

۱۳

اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے  
فلح ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی  
حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ  
یوح ہزار بھی جرمی چھائی پہ سنگ ہے  
خطرہ جو ہے سو آئینہ دلی پہ زنگ ہے  
یاں تک بھی جسکی آنکھ کھلی ہے سودا گستا



اس ہستی خواب سے کیا کام تھا ہمیں  
گلگیرِ منہ پسار نہ تو شمع کی طرف  
عالم سے اختیار کی ہر چند ضلع کل  
میں کیا کہوں تجھے نظر آیا نہیں ہے کیا؟  
غیرِ شکستہ ہو دے ہے ہو دے کہ ہمیں درو

۱۴  
ارض و سماں تیری وسعت کو پاسکے؟  
وحدت میں تیری حرفِ دوئی کا نہ اُسکے  
میں وہ فساد ہوں کہ بغیر از فنا مجھے  
تا حد! نہیں یہ کام ترا اپنی راہ سے  
غافلِ انہد کی یاد پہ مت بھول زینہار  
یارب یہ کیا طلسم ہے اور اک فہم یوں  
گو بخت کر کے بات بھٹائی۔ یہ کیا حصول  
مستِ شراب عشق وہ بچو وہ بچو جس کو حشر

۱۵  
شہتِ چند اپنے دے دھر چلے  
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے؟  
کیا ہمیں کام ان گلوں سے ہے صبا؟  
دوستو! دیکھا تماشا یاں کالیں  
شمع کے مانند ہم اس بزم میں  
موجود نہ تھے ہیں آپ سے اس کو پرے  
جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے  
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں کر چلے  
ایک دم آئے ادھر ادھر چلے  
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے  
چشمِ نم آئے تھے دامنِ تر چلے  
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا۔ دے  
جوں شرار ہستی بے بود! یاں  
ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ  
دروہ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب

ساتھ اپنے اب آسے لیکر چلے  
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے  
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے  
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

### رباعیات

جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان میں دیکھا  
جوں غنچہ ہجر اک دل صد ہچاک نہ پایا

جو کچھ کہ سنا تجھے میں سنا انسان میں دیکھا  
منہ ڈال کے جب میں نے گریہاں میں دیکھا

دلِ ناداں کو یاد کر کے صبا! <sup>۲</sup>  
نیم بسمل کوئی کسو کو چھوڑ

اتنا کہنا جہاں وہ قاتل ہو  
اس طرح بیٹھنا ہے غافل ہو

بیگانہ گھر نظر پر سے تو آشنا کو دیکھ  
آہن ہو یا ہوسنگ ہے سب جلوہ گاہ یار

بندہ گر آوے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ  
جوں آئینہ ہر ایک گزریں صفا کو دیکھ

یہی پیغام ورد کا کستا <sup>۴</sup>  
کون سے رات آن ملے گا؟

گر کوئی کوے یار میں گزرے  
دن بہت انتظار میں گزرے

ہمارے جائزہ میں نہیں کچھ اور بس باقی <sup>۵</sup>  
ایک ایک عشق کی آتش کا شعلہ اس قدر بھڑکا

گریباں میں ہے مثلِ صبح اک تارِ نفس باقی  
نہ چھوڑا سر زمینِ دل میں کوئی خاموش باقی

۶  
گر معرفت کا چشم بصیرت میں نور ہے تو جس طرف کو دیکھئے اُس کا ظہور ہے  
آتی ہے دل میں اور ہی صورت نظر ہے شاید یہ اپنے ہی کسی کے حضور ہے

۷  
پیدا کرے ہر چند تقدس بندہ مشکل ہے کہ ہو جس سے دل بکڑا  
جنت میں بھی اکل و شرب سے کیا؟ دوزخ کا بہشت میں بھی ہو گا دھندا

۸  
پیری چلی اور گئی جوانی اپنی اے درو کماں ہے زندگانی اپنی؟  
کل اور کوئی بیان کرے گا اسکو کہتے ہیں اب آپ ہم کسی اپنی

۹  
ہر نبی کے لئے کب تئیں مرتے رہئے؟ کب تک یہ کفر دل میں بھرتے رہئے؟  
اب درو جو کچھ کہ زندگی باقی ہے اللہ کو اپنے یاد کرتے رہئے

## میر محمد تقی میر

۲۱۹  
پیدائش اکبر آباد ۱۱۲۵ھ وفات لکھنؤ ۱۲۲۵ھ

میر غلام محمد تقی - نام - خلیفہ میر عبداللہ شرفائے اکبر آباد سے تھے باپ کے مرنے کے بعد وہی میں آئے۔ اور سراج الدین علی خاں آرزو جوان کے رشتہ دار تھے کے پاس انھوں نے پروش پائی۔ فن شاعری میں وہ کمال پیدا کیا۔ کہ ہر چند ان کا تخلص میر تھا۔ مگر گنجہ سخن کی بازی میں آفتاب ہو کر چمکے۔ قدروانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی ٹنگا ہوں۔ دیکھا۔ اور نام کہ پھولوں کی ٹمک بنا کر آٹا بیا۔ ہندوستان میں یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر، غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر میں لے جاتے تھے۔

دلی کی سلطنت کے زوال کی وجہ سے تنگدستی سے پریشان ہو کر ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ آئے۔ ایک سرائے میں اترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی قدیمانہ وضع کو دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بھی اسے غریب الوطن زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی شکستہ دل تھے۔ اور بھی دل تنگ ہوئے۔ اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی۔ تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ درحضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے فوراً ہی یہ قطعہ لکھ کر غزل طرچی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو۔ یورپ کے سناگو بہکنا غریب جان کے ہنس ہنس بچار کے  
دلی چو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے  
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویزاں کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی آہڑے دیار کے  
سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی۔ کہاں کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے  
شہر میں شہرہ ہو گیا۔ کہ میر صاحب تشریف لائے۔ رفتہ رفتہ نواب  
آصف الدولہ مرحوم نے سنا۔ اور دونوں روپیہ مہینہ کر دیا۔ لیکن بد  
دماغی اور نادک مزاجی نے جو آن کے ذاتی مصاحب تھے۔ یہاں بھی ان کا ساتھ  
نہ چھوڑا۔ ایک دن نواب صاحب سے کسی بات پر گہڑائی۔ دربار کا آنا جانا چھو  
دیا۔ اور بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے۔ اور فقر و فاقہ میں گزارہ کرتے رہے۔  
آخر ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے۔ تئو برس کی عمر پائی۔ تاسخ نے تاریخ کسی رخ  
”وادیلا فرد شہ شاعران۔“

کلام کے خصوصیات۔ میر صاحب کی زبان شستہ۔ کلام منہا  
بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو سب کی طبیعتوں  
کے مطابق ہیں۔ محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں۔

اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دیدی ہے۔ کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہیں۔ وہ گویا اردو کے سعدی ہیں۔ ایشیا کے تمام شعرا حسرت۔ مایوسی۔ ناگامی کا دکھڑا روتے ہیں۔ مگر ان کے تمام مضامین خیالی ہیں۔ اور میر صاحب کے حالی اس لئے کہ میر صاحب کی ساری عمر مصیبت اور غم میں گزری اور ان کی طبیعت قدرتی درخیز اور دل حسرت انگیز تھا۔ کہ غزل کی جان ہے۔ ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے۔ کہ جس دل سے نکلی کہ آیا ہوں۔ وہ غم و درد کا پتلا نہیں۔ حسرت و اندوہ کا جنازہ تھا۔ ہمیشہ وہی خیالات پسے رہتے تھے۔ بس جو دل پر گزرتے تھے وہی زبان سے کہہ دیتے تھے۔ کہ تنہا والوں کے لئے نشتر کا کام کر جاتے تھے۔ ان کی غزلیں ہر کھر میں ہیں۔ کہیں شربت اور کہیں شیر و شکر ہیں۔ مگر چھوٹی چھوٹی بھرون میں فقط آجیات بہاتے ہیں۔ جو لفظ شہ سے نکلتا ہے۔ تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے۔ ان کی غزل اصول غزلیت کے لحاظ سے سوو اسے بہتر ہے۔

ان کا صاف اور سلیجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے۔ اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے۔ اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دل عزیز رہے۔

چونکہ مطالب کی وقت مضامین کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شان و شکوہ بندش کی سبقتی لازمہ قصائد کا ہے وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کا ثمر ہوتا ہے۔ اسی واسطے میر صاحب کے قصیدے کم ہیں۔ اور اسی قدر درجہ میں بھی کم ہیں انھوں نے طالب سخن پر روشن کر دیا ہے۔ کہ قصیدہ اور غزل کے دو میدانوں

میں دن اور رات کا فرق ہے۔ اور اسی منزل میں اگر ستودا اور تمیر کے کلام کا حال ٹھٹھاتا ہے۔ انقاد بن سخن کی یہ رائے ہے کہ جو مرتبہ مرزا کا قصیدے میں ہے وہی مرتبہ تمیر کا غزل میں ہے۔

## غزلیات

خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ملہو تھا  
پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا  
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا  
ایک شعلہ برقی خرمین صد کوہ طور تھا  
کیا شمع کیا تینگ ہر اک بے حضور تھا  
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا  
میں بھی کبھو کسو کا سر پند غور تھا  
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا  
ہنگامہ گرم کن جو دل نا صبور تھا  
ہو نچا جو آپ کو تو میں ہو نچا خدا کے تئیں  
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم!  
مجلس میں رات ایک تیرے پر تو سے بغیر  
کل پاؤں ایک کا سہ سر پر جو آگیا  
کنے لگا کہ ”دیکھ کے چل راہ بے خیر!“  
تھا وہ تو رشک جو رہشتی ہم ہی میں تمیر

۳

کل اُس پہ ہیں شور بے پھر نوہ گری کا  
اسباب لٹاراہ میں یاں ہر سفری کا  
اب سنگ ملا ہے اس آشفقہ سری کا  
انصاف طلب ہے تری پیداگری کا  
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا  
ملکہ ہے ترا اشک عقیق جگری کا  
تھا دست نگر پنجہ مرگاں کی تری کا

جس سر کو غور و رنج ہے یاں تلخ وری کا  
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت؟  
زندگیاں میں بھی شورش نہ لگتی اپنے جوں کی  
یہ زخم جسکے داور محشر سے ہمارا  
وہ موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے  
اس رنگ سے جھلکے ہے پلک پر کہ کسے تو  
کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جاکر

سے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام  
ٹک تمیر جگر سوختہ کی جلد خسارے

۳۳  
بیناب جی کو دیکھا دل کو کسب دیکھا  
پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا  
آباد جس میں تم کو دیکھا تھا ایک مدت  
لیتے ہی نام اسکا موتے سے چونک اٹھے ہو

۳۴  
جب جنوں سے ہمیں توسل تھا  
بسترا تھا چن میں جوں ببل  
اک نگہ کو وفا نہ کی گویا  
اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار  
خوب دریافت ہو کیا ہم نے

۳۵  
دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا  
اگرچہ عمر کے دن دن یہ رہے خاموش  
ہزار جان سے قربان ہے پری کے ہیں  
نمود کر کے وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا

۳۶  
گل و ببل بہار میں دیکھا  
جل گیا دل سفید ہیں آنکھیں  
ایک تنہا ہزار میں دیکھا  
یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا

آجے کا بھی ہونا دامن گیر  
تیرہ عالم ہوا یہ روز سیاہ  
جن بلاؤں کو تمیر غفلتے تھے  
تیرے کوچے کے خار میں دیکھا  
اپنے دل کے غبار میں دیکھا  
اُن کو اس روزگار میں دیکھا

غلط تھا آپ سے غافل گذرنا  
چہن کی وضع نے ہم کو کیا دلغ  
گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا  
کرو گے یاد باتیں تو کہو گے  
جہاں پڑے فسانے سے ہمارے  
مگر دیوانہ خطا دل بھی کسو کا  
نہ دیکھا تمیر آوارہ کو لیکن  
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا  
کہ ہر غنچہ دل پر آرزو تھا  
جدھر دیکھا بدھ تیرا ہی رو تھا  
کہ کوئی رفتہ بسیار گو تھا  
دماغ عشق بہکو بھی کبھو تھا  
کہ پہاڑن بھی ستو جاگم رفو تھا  
غبارِ اک لاثواں سا کو بکو تھا

ابتداء عشق ہے روتا ہے کیا؟  
قافے میں صبح کے اک شور ہے  
سیر ہوتی ہی نہیں یہ سرزمین  
یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں  
غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز  
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟  
یعنی غافل! ہم چلے روتا ہے کیا؟  
تخم خواہش دل میں تو روتا ہے کیا؟  
دلغ چھاتی کے عیش و ہوتا ہے کیا؟  
تمیر اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا؟

بارہا گور دل جھکا لایا  
قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل  
دل کہ اک قطرہ خوں نہیں ہے بیش  
اب کی شرطِ وفا بچا لایا  
سارے عالم میں میں دیکھا لایا  
ایک عالم کے سر بلا لایا



سب پہ جس بارے گرائی کی  
دل مجھے اُس نگلی میں لیجا کر  
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار  
اب تو جاتے ہیں بنگرے سے میسر

۱۰  
غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا  
حسن تھا پیرا بہت عالم فریب  
دل نہ پہنچا گوشہ داماں ملک  
ستلے ہیں لیالے کے خیے کو سیاہ  
جامہ احرام زاہد پر نہ چا  
میرے مرنے کی حقیقت جس میں تھی  
صبح پیری شام ہونے آئی میسر

۱۱  
غلط ہے عشق میں اسے بواہوں اندر شہ لسن کا  
زمین ایک صفحہ تصویر پہیوشاں سے مانا ہے  
ہماں جلو سے اُس محبوب کے کیسے لبالب ہے  
ہو تو آوارہ لیالی ہے جانِ رفته مجنوں کی  
خرابی دل کی - اس حد ہے کہ سمجھا نہیں جاتا  
قدم ٹک دیکھ کر رکھ میسر بردل سے کائے کا

۱۲  
جو اس مشور سے میسر روتا رہے گا  
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

میں وہ رُونے والا جہاں سے چلا ہوں  
مجھے کام رُونے سے اکثر ہے ناصح  
بس اے گر یہ آنکھیں ترے کیا نہیں ہیں؟  
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے  
بس اے تیرے مرگن گان سے پونچھ آنسوؤں کو

۱۳

الہ رے غور و ناز تیرا!  
ہم سے کہ تجھی کو جانتے ہیں  
کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر  
کہتے نہ تھے میرے من گڑھا کر

۱۴

ہستی اپنی حباب کی سی ہے  
چشم دل گھول اُس ہی عالم پر  
بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں  
میں جو بولا کس کتہ پہ آواز  
آنش غم میں دل بٹھنا شاید  
دیکھئے ابر کی طرح آب کی  
میر ان نیم باز آنکھوں میں

۱۵

فیضان آئے صدا کر چلے  
جو تجھ بن نہ جیے کو کہتے تھے ہم  
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے  
شوہن عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی  
 وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے  
 کوئی نا امید نہ کرتے نگاہ  
 بہت آرزو تھی گلی کی تری  
 دکھائی دے یوں کہ بیخود کیا  
 جہیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی  
 پرستش کی یاں تک کہ اے بت! تجھے  
 جھڑے پھول جس رنگ گلین سے یوں  
 نہ دیکھا غم و دوشاں شکر ہے  
 گئی عمر در فکر بند غزل  
 کہیں کیا جو پوچھے کوئی نام سے میر

کہ مقدور تک تو دوا کر چلے  
 ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے  
 سو تم ہم سے متحد بھی چھا کر چلے  
 سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے  
 ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے  
 حق بندگی ہم ادا کر چلے  
 نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے  
 چمن میں جہاں کے ہم آ کر چلے  
 ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے  
 سو اس فن کو ایسا بڑھا کر چلے  
 جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

## شیخ امام بخش ناسخ

وفات لکھنؤ ۱۲۵۴ھ

پیدائش فیض آباد

شیخ صاحب کی شاعری کا وطن لکھنؤ ہے۔ مگر کمال سے لاہور کو فخر کرنا چاہئے  
 ہو کہ ان کے والد کا وطن تھا۔ خاندان کے باب میں فقط اس قدر کہہ سکتے ہیں  
 کہ یہ خدا بخش خیرہ دوز کے بیٹے تھے۔ اور بعض اشخاص یہ کہتے ہیں کہ اس  
 دولت مند لا ولد نے منبہی کیا تھا اصنام والد عالم غربت میں مشرق سے  
 مغرب کو گئے۔ فیض آباد میں ان کی قسمت سے یہ ستارہ چمکا۔ کہ خلیفہ نظم  
 کا آئینہ ہوا۔

خدا کی دین کا موٹے سے پوچھے احوال کہ آگ لینے کو جائیں پیر ہی ہو جائے  
 غریب باپ سے صاحب نصیب بیٹے کے سوا وہاں بھی نصیب نے رفاقت نہ کی۔ مگر اس

دولت مند سوداگر نے کہ لا ولد تھا۔ بلند اقبال بڑے کو فرزند ہی میں لے کر ایسا تعلیم و تربیت کیا کہ بڑے ہو کر شیخ امام بخش ناسخ ہو گئے۔ اور اس چھڑی باپ کی بدولت دنیا کی ضروریات سے بے نیاز رہے لکھنؤ کے دار الخلافت ہو جانے سے وہاں آئے۔ اور وہیں عمر بھر کی یکساں ایک محلہ مشہور ہے۔ اس میں بیٹھ کر شعر کے چاندی سونے پر سکہ لگاتے تھے اور کھوٹے کھرے مہمنوں کو پرکھتے تھے۔

فارسی کتابیں حافظ وارث علی لکھنوی سے پڑھی تھیں۔ اور علمائے فرنگی محل سے بھی تحصیل کتابیں حاصل کی تھیں۔ اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی۔ مگر رواج علم اور صحبت کی برکت سے فن شاعری کی ضروریات سے پوری واقفیت تھی۔ اور نظم سخن میں ان کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا۔ شوق ہمیشہ مشاعرہ میں بجا کر دل میں آسنگ اور طبیعت میں جوش بڑھاتا تھا۔ اور آسودہ حالی اکثر شعرا اہل فہم اور اہل کمال کو ان کے گھر کھینچ لاتی۔ ان کی صحبتوں میں طبیعت خود بخود اصلاح پاتی گئی۔ رفتہ رفتہ خود اصلاح دینے لگے۔

کسی کی نوکری نہیں کی۔ مراد خدا داد اور جوہر شناسوں کی قدردانی سے نہایت خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ پہلی دفعہ آبادی میں آئے ہوئے تھے راجہ چندو لال نے ۱۲ ہزار روپے بھیج کر بلا بھیجا۔ انہوں نے لکھا کہ میں نے نیک کار امن پڑا ہے۔ اسے چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ یہاں سے جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا راجہ موصوف نے پھر خط لکھا بلکہ ۱۵ ہزار روپے بھیج کر بڑے اصرار سے کہا کہ یہاں ٹھہرنا لائیے گا۔ تو ملک الشعراء کا خطاب دواؤں گا حاضری دربار کی قید نہ ہوگی۔ ملاقات آپ کی خوشی پر رہے گی۔ انہوں نے منظور

نہ کیا۔ ۱۲۵۲ھ میں انتقال فرمایا۔ میر علی اوسط رشک نے تاج لکھی  
 ”ع“ دلا شعر گوئی مٹھی لکھنؤ سے؟ عمر میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں ۱۵۰۴ء  
 برس کی عمر تھی۔ مولانا رومی کہتے ہیں۔ ”کہ تقریباً سنو برس کی عمر ہوگی“۔

تین دیوان ہیں۔ مگر دو مشہور ہیں۔ ان میں غزلوں۔ رباعیوں۔ تارنجوں کے  
 سوا اور قسم کی نظم نہیں۔ قصائد کا شوق نہ تھا۔ چوکے کا نثر سے ان کا بڑا پکا  
 کلام کے خصوصیات۔ عموماً ان کا کلام شاعری کے ظاہری عجوبوں اور  
 لفظی سبقوں سے بہت پاک ہے۔ اور اس امر میں انھیں اتنی کوشش ہے۔ کہ اگرچہ  
 ترکیب کی پستی یا کلام کی گرمی میں فرق آجائے۔ مگر اصول ہاتھ سے نہیں جانے  
 دیتے۔ غزلوں میں شوکت الفاظ۔ بلند پروازی۔ نازک خیالی بہت ہے۔ اور تکب  
 ظرافت کا چٹھارا اور تاثیر کم۔ شوکت الفاظ کہتی ہے۔ اگر وہ قصیدہ کہتے۔ تو خوب کہتے  
 اس عہد تک شعراء لکھنؤ ان استادوں کے شاگرد تھے۔ جن کا درجہ کمال  
 دلی کے مرتبہ سے نکلا تھا۔ اور فصحاے لکھنؤ بھی ہر محاورے کے لئے دلی ہی  
 کو خیر سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ اکثر انھیں بزرگوں کے فرزند تھے۔ جنہیں زمانے کی  
 گردش نے اڑاکر وہاں پھینک دیا تھا۔ شیخ صاحب اور خواجہ حمید علی  
 آملیش کے کمال نے لکھنؤ کو دلی کی قید پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند  
 دی۔ اور ذہنی مستند ہوئی۔

ان کے چند مشہور شاگرد ہیں۔ خواجہ وزیر۔ برقی۔ رشک۔ بحر۔ میر شکوہ آبادی  
 نادر۔ یہ سب صاحب دیوان اور بجائے خود استاد ہیں۔

## غزلیات

دشمن سر پہ تری گرون کشی مانند شمع  
 دشمن سر پہ تری گرون کشی مانند شمع  
 زندگی میں صرف کرتا ہو سبک دوشی حصول  
 افسر زر شوق سے رکھ پر نہ اتنا سر اٹھا  
 مثل قاروں خاک میں جا کر نہ بار زراٹھا

یوں خرابی کے لئے دیوار اٹھایا در اٹھا  
بوجھ اُن سے سیڑیوں میں خاک کا کیڑا اٹھا  
زرا نکتہ سے اے قاسم تو اپنا سر اٹھا

چاہئے تعمیر دل جو ساتھ اٹھا بچائے گا  
بات جن نازک مزا ہوں سے نہ اٹھتی تھی کبھی  
کیا سخن سنی سے حاصل جب سخنداں ہی نہیں

آفتاب ایسا ہوا اُدنجا کہ تارا ہو گیا  
واں چھپا وہ ماہیاں دل پارہ پارہ ہو گیا  
پست ایسا میرے طالع کا ستارا ہو گیا  
آفتاب اپنی نظر میں اک شرارا ہو گیا

مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا  
باعث چاک کستاں ہوتا ہے جلوہ ماہ کا  
ایک درہم اور داخل گنج قاروں میں ہو  
بے ثباتی جو ہوئی عالم کی ثابت اے خلک

پھر مرا جام گدائی جام جسم ہو جائیگا  
دارغ افلاس اپنے سینے میں درم ہو جائیگا  
لال تجھ پر وہ ہوا دونا بھی کم ہو جائیگا  
دوست و دشمن کا وجود اک دن علم ہو جائیگا

میکشوا جس وقت ساقی کا کرم ہو جائیگا  
پھر دنگا دن ہمارے جب قلب دہر کا  
یہ خند کے ٹھٹھنے کی علامت ہے شفق کا پھولنا  
شکر و شکوہ ہے سو وہ جاوے گا اے قاسم یہی

جس سینہ میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا  
مرنا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا  
واعظ ترے ممبر کا یہ زمینہ نہیں اچھا  
جز کشتی درویش سفینہ نہیں اچھا  
مکہ نہیں اچھا کہ مدینہ نہیں اچھا

انسان کو انسان سے کینہ نہیں اچھا  
آواز یہ آتی ہے لب آب بقا سے  
پہونچا ہے کوئی آج حقیقت کو کب اس سے؟  
ہو سیر جو منظور دلا بحر جہاں کی  
ہے ہند بھلا کیا ترے رہنے کو کہ قاسم!

معل قیمت کو پہونچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

ہو وطن میں خاک میرے گوہر مضمون کی قدر

بچ اٹھائے کس قدر یوسف نے کنٹاں چھوڑ کر  
اٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیمان چھوڑ کر  
جائیکا فاش تیری لاش غریاں چھوڑ کر

ہوئی ہے غربت میں فروٹ پر بڑی انداز کے بعد  
عناد اصلا نہیں۔ گر ہے جہاں زیر نگین  
آج تو پوشاک پر مڑتا ہے توکل دیکھیو

۶

چڑھا جاتے ہیں پتھر لوگ آکر میرے دفن پر  
گریباں چاک ہو گل کا نہ کیوں لیل کے بیون پر  
کہ نازل ہوتی ہے آفت۔ ہوا کی منع روشن پر  
تو اے بڑا! پہلے باندھ پٹی چشم سوزن پر  
کہ جام و گل ہیں خندان شیشہ و بل کے بیون پر  
فلک بجلی گرا دیتا ہے فاسخ میرے خرم پر

میں وہ شوریدہ سردیوانہ تھا جو بعد مر وں بھی  
ہمارے نالما ہے پڑا نہ کی طرز آڑا تھی ہے  
جہاں میں تیرہ دل جو ہیں وہی بے رخ رہتے ہیں  
ہمارے زخم کے نظارے کی کب تابا ہے اس کو  
کسی کا درد ہو تا ہے کسی کو کب زمانے میں؟  
اگر ہوتا ہے اک وانہ بھی دین میں میری قہمت کا

۷

وہ زمیں ہے کون جس پر آسمان ہوتا نہیں؟  
دہر میں پیدا ہما کا آسپاں ہوتا نہیں۔  
ہے دلیل اس پر زباں میں استخوان ہوتا نہیں  
خوب بخل جاتی ہے جو شے پھر چلوں ہوتا نہیں  
زخم ماہے تیر مرگ کاں کا نشان ہوتا نہیں

خاکساروں سے ہے ہر جا سرکشوں کی سرکشی  
جو سعادتمند ہیں رہتے ہیں وہ بے خانان  
چلتے ہیں صاحب سخن ان کی طبیعت نرم ہے  
وہ ہے جب تک جسم عاشق میں ہے خالی کی دلیل  
عشق کا ہو درد اسے ناسخ نہ کیونکر لا دوا؟

۸

وہ کون جا ہے جہاں چاہ زیر کاہ نہیں؟  
ہزار شک کہ باطن مرا سیاہ نہیں  
شکستہ دل جو ہوا اسکے لب پہ آہ نہیں  
جہاں میں کون ہے وہ باغ جہیں چاہ نہیں؟

سوا سے مکر زمانے میں رسم و راہ نہیں  
میں گو کہ حسن سے ظاہر میں ظلیل ماہ نہیں  
ہوئی ہے جھگو جس سے یہ بات اب ثابت  
جگر کے داغ ہیں بے تلفت گر نہ ہونا سور

ہم کو اپنے لئے فکر و غور و حساہ نہیں  
سوائے قلعہ مرقد کہیں پناہ نہیں

ہمیشہ کام میں غیروں کے ہیں سعادتمند  
ہجوم فوجِ عدو سے جہاں میں اے ناسخ!

۹

طاہر نکلت خیالِ آشتیاں کرتا نہیں  
صبح میری شامِ عم کو ۲ سماں کرتا نہیں  
باغِ جنت کو خدا ہرگز خواں کرتا نہیں  
پیرِ گردوں طفلِ ظالم کو خواں کرتا نہیں  
نیشہ خیزے جس طرح کے کو نماں کرتا نہیں  
گو سکندر کی طرح سیرِ جہاں کرتا نہیں

مرد و ارستہ کہیں قید مکان کرتا نہیں  
روزِ اک شام و سحر کرتا ہے پیدا ہر خلق  
ہے ہر اک آفت سے امین مسکنِ اہل فنا  
رحم کر عشاق پر گر چاہئے غیرِ دراز  
عیب اپنے آپ کر دیتے ہیں ہم بدستِ فاش  
جامِ مے میں دیکھتا ہوں میں جہاں کو شلِ جم

۱۰

آگ ہم سنگ کے مانند نہاں رکھتے ہیں  
ہاتھ میں صبر کی جو لوگ عنایں رکھتے ہیں  
کھنے کو شمع کے مانند زباں رکھتے ہیں  
ہم فقط تجھ پہ خدا کرے کو جاں رکھتے ہیں  
پیر رکھتے ہیں پریٰ زو نہ کہاں رکھتے ہیں  
لوگ اکثر مرے جینے کا کہاں رکھتے ہیں  
گو نہیں حکمِ رواں طرح رواں رکھتے ہیں

دل میں پوشیدہ تباہ عشقِ تباں رکھتے ہیں  
نئے سواری تری دیکھیں تو ہوں گرد و نہال  
بزمِ جاناں میں کبھی بات نہ نکلی منہ سے  
مثل پروانہ نہیں کچھ زروال اپنے پاس  
طاہرِ روح کو کر دیتے ہیں کیہ فکرِ بے سلسل؟  
ہوا کی پہ سہ سخن کہنے میں یہ بعدِ وفات  
عوضِ ملک جہاں ملک سخن ہے ناسخ!

۱۱

گرد باد اسے واسے غفلت اس بیاباں میں نہیں  
کلِ بحرِ خفاش لیکن سققتِ ایواں میں نہیں  
آج جانے کی اجازت جس گستاخ میں نہیں

خوش قدروں کی خاک یہ اٹھتی ہے ہر دمِ سرو قد  
آج نقاشی کی چھت لگوا۔ نہیں مانع کوئی  
دیکھنا گلِ آپ سے کوئی نہ رکھے گا قدم



گل تو کیا کاٹنا بھی اک دن اس گلستاں میں نہیں  
آدھی کیا دیو بھی ملک سلیمان میں نہیں؟  
پڑیاں بھی تربت فغفور و خاقاں میں نہیں  
غیر روباہ و شغال اب آنکے اپواں میں نہیں  
کون سا فرعون ہے جو فکر ساماں میں نہیں  
وہ پری ہے تو کہ فرمان سلیمان میں نہیں  
آشنا نالوں سے ہرگز نئے یشتاں میں نہیں  
کیا رسائی بچو تاسخ اکو سے جاناں میں نہیں

دوست دشمن سب کے سب ہیں رفتی مثل نسیم  
نام خاتم رہ گیا ہے ہو گیا ہر باد سخت  
مگر چھل ناداں ہلاتے ہیں کسے حیران ہوں؟  
دم دبا جاتے تھے جن کے سامنے شیر زیاں  
آمد موی و باروں کی قوی ہے یہ دیسل  
جو تراجی چاہتا ہے بس دہی کرتا ہے تو  
بے وطن ہو کر زمانے میں ہوئے نالال بشر  
مثل مجنوں کس لئے صحرا ہے صحرا ہے خراب؟

۱۲

جس سر زمین کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں  
وہ کون سا چین ہے کہ جس کو خزاں نہیں  
پیری میں بھی خیال اجل کا یساں نہیں  
سورج چن ہے کون جو سرور و اں نہیں  
حاصل جہیں سے کیا جو ترا آسماں نہیں  
ابوسف بغیر کوئی یہاں کا رواں نہیں  
تنہا براے لذت دنیا زبان نہیں  
باغ جہاں میں فصل بہار و خزاں نہیں  
باغ جہاں میں زر بھی کم از زعفران نہیں  
اُن کا حد میں آج کوئی استخزاں نہیں

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں؟  
دور و ایک وضع پہ رنگ جہاں نہیں  
عزت کی جا ہے لاکھوں ہی طفل و جوان نہیں  
ہر گل ہے اس چین سے گرنیاں برنگا، تو  
آکھوں سے فائدہ جو نہیں تیری گوراء  
حاصل مجھے بھارت یعقوب ہو اگر  
منعم کے شکم میں بھی ہلائیں کبھی کبھی  
پہنچا مردہ ایک ہے تو شکستہ ہے دوسرا  
زردار جو ہیں کیوں نہ ہوں خنداں رنگ گل؟  
جن کے سروں پہ آپ گس راں رہے ہما

۱۳

کہ جیسے روح نہاں ہے بدن کے پردے میں

یہ جسم زار ہے یوں پرین کے پردے میں

سوائے اہل سخن ہو مشاہدہ کس کو؟  
 تلاش جسکی ہے دن رات تنگوائے فاضل!  
 جو عن لبیب کی آنکھوں سے دیکھے اور سمجھے  
 چین میں لائی صبا کس کی بوجو آج شہیم؟  
 خبر نہ شام غربی کی محکو تھی ناسخ!

۱۴  
 بیاں کیا ہو سکے عمرواں کی مجھ سے چالاک؟  
 اکیلا دل مرا فوج ترقا کے مقابل ہے  
 مڑ پھرتے جو ہے اسے خام طبعو! باغ عالم میں

۱۵  
 چھپر کھٹ کے عوض لازم جنازے کا بنانا ہے  
 ولیکن غافل اپنے غسل میت سے زمانہ ہے  
 بنے ہے برق جھلرا بر رحمت شایسا نہ ہے  
 کہ سر سبز ی سے ہے محروم سہم کا جو دانہ ہے  
 کہ تو آئے کو دیکھو پاس پانی کا خزانہ ہے  
 جو سو ذی ہیں ہمیشہ آنکے قبضے میں خزانہ ہے  
 رگہ جاں تو سن عمرواں کو تارِ یانہ ہے  
 خدا جانتے زمیں میں دفن یہ کیسا خزانہ ہے  
 بدن میں دم جو آیا ہے مقرر اسکو جانا ہے  
 اشلہ آدورفتہ نفس کا ہے یہی ہر دم  
 کی ہوتی نہیں نقد سخن کی یاں کبھی ناسخ!  
 ازل سے اپنے قابو میں متانی کا خزانہ ہے

۱۴

جلوہ برقی تجلی تھا شرارِ طور سے  
جائے آتش جوشِ پانی کا ہوا تپور سے  
مالگتا ہے کب کوئی جا کر عکسِ زہور سے  
بارِ غم دنیا میں اٹھواتے نہیں زہور سے  
آتش تھا جگہ نہایت ناسخِ مغیر سے  
بٹتے ہیں جامِ گدا خاکِ سرِ مغفور سے

طالبِ دیدار جبکا ہے دلا! وہ تجھ میں ہے  
مخلوق کے اعمال بد کرتے ہیں ایسا انقلاب  
منعمِ مودی کے گھر کو اہلِ حاجت ٹوٹ لیں  
باشطے کوئی کسی کا درد یہ ممکن نہیں  
دیکھتا ہوں جب کلامِ آسکا بہت آتا ہے یاد  
دیکھنا اسے اہلِ عبت! انتقامِ آسمان

۱۵

گردِ وساں بربادِ اک دن میری مشتِ خاک ہے  
دل ہوا جب صاف بس عالم سے جھگاڑا پاک ہے  
آسمان اس رتبیہِ عالی پہ زیرِ خاک ہے  
اشک بھی اس رتبہِ عالی پہ زبرِ خاک ہے  
اس لئے یہ آمد و رفتِ نفس کی ڈاک ہے

توسنِ عمر رواں ایسا ہی گر چالاک ہے  
آئے کو دوست رکھتے ہیں جہاں کے خوب دوست  
اسفلِ واعلیٰ جو ہیں طجائیں گے سب خاک ہیں  
پست تر کرنے کو گردوں سب کو کرتا ہے بلند  
روح ہے ہر جسم میں مشتاقِ انبارِ اجسل

۱۸

غمِ فرقت سے نہیں ہے کوئی سینہ خالی  
غریب کم ہوتا ہے دریا میں سفینہ خالی  
ورنہ ہو صرف سے قاروں کا خزانہ خالی  
جامِ ہر جاے جو ساقی تو ہو میسنہ خالی

کیا ہوں اشکوں سے مرے دیدہ بنیا خالی؟  
قلیمِ دہریہ رکھتا ہے جسمِ محفوظ  
کبھی ہو گی نہ یہاں گنجِ معانی کی کمی  
ایک کے نفع سے ہے ایک کو نقصان یہاں

کیا بھلا ہو و محبت کو جگہ ہوتا ناسخ!  
یار کے سینے کو کرتا نہیں کینہ خالی

# خواجہ حیدر علی آتش

وفات لکھنؤ ۱۲۶۳ھ

پیدائش دہلی

آتش - تخلص - خواجہ حیدر علی نام - آپ دہلی کے رہنے والے تھے -

لکھنؤ میں جا کر سکونت اختیار کی - خواجہ زادوں کا خاندان تھا - جس میں سند فقر بھی قائم تھی - اور سلسلہ پیری مریدی کا بھی تھا - مگر شاعری بھی اختیار کی - اور خاندانی طریقہ کو سلام کر کے اس میں سے فقط آزادی و بے پروائی کو رفاقت میں لے لیا - مصحفی کے شاگرد تھے - اور حق یہ ہے - کہ ان کی آتش بیانی نے استاد کے نام کو روشن کیا - بلکہ کلام کی گرمی اور چمک کی دمک نے استاد شاگرد کے کلام میں اندر میرے آجائے کا امتیاز دکھایا -

علی استعداد معمولی تھی - مشق کی کھوت سے اپنے زمانے میں مسلم الثبوت استاد ہو گئے - اور سیکڑوں شاگرد مثل میر وزیر علی صبا - رند - خلیل - جلیل - کشاد و رسلین نادر مرزا کے ان کے دامن تربیت میں پرورش پا کر استاد کہلائے -

۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے - یکایک ایسا موت کا جھوٹکا آیا - شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے - آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا - میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی - خواجہ حیدر علی اے وا مردند -

تمام عمر کی کمائی جسے حیات جاودانی کا مول کہنا چاہئے - ایک دیوان غزلوں کا ہے - جو کہ ان کے سامنے رائج ہو گیا تھا - دوسرا نثر ہے - کہ چھ مرتب ہوا - جو کلام ان کا ہے - حقیقت میں محاورہ اردو کا دستور اصل ہے - اور انشا پر فانی ہند کا اعلیٰ نمونہ - شرفاے لکھنؤ کی بولی چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے -

جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں - اسی طرح انھوں نے شعر کہتے ہیں - ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی - ان کا کلام مضامین بلند سے

خالی نہیں۔ طرز بیان صاف ہے۔ سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے۔ ترکیبوں میں  
استعارے اور تشبیہیں فارسیت کی بھی موجود ہیں۔ مگر قریب انہم۔

## غزلیات

عاجز نواز دوسرا تجھ سا نہیں کوئی  
بارغ و بہار آتش مزود کو کیسا  
موسے کو تیرے حکم سے دیا نے راہ دی  
طوفاں میں ناخدا کی کشتی نوح کی  
سائل ہوں مجھ کو قید کم و بیش کی نہیں  
دیکھا تو خار و گل کا مقام ایک شاخ ہے  
آتشش یہی دعا ہے خداے کریم سے

برابر گردن شاہ و گدا دونوں کو خم پایا  
تو اُس نے منزل مقصود کو زیرِ قدم پایا  
اُٹھاؤں دارغ میں تو آسمان سمجھے دم پایا  
شرار و برقی سے بھی عرصہ ہوتی کو کم پایا  
غنیمت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا  
صفائے قلب سے پہلوئیں پہنے جامِ جم پایا  
کبھی برقی غضب اس کو کبھی ہر گم پایا  
ہست رو بایں رُوح و تن کو جب شوقِ تم پایا  
سیاہی ہو گئی نایاب اگر ہم نے تلم پایا

محبت کا تری بندہ ہر اک کو اسے صغیر پایا  
برنگِ شمع جس نے دل جلایا تیری دوری میں  
نشانہ تیر ہمت کا ہے میرا اخیر طالع  
ہزاروں حسرتیں جاؤنگی میرے ساتھ تو نیا سے  
سوائے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس نرا ہے  
نظر آیا تماشا ہے جہاں جب بندگیں آنکھیں  
چلایا اور مارا حسن کی تیر نگ سازی سے  
فراق انجام کار آغاز و صلت کا بلا شک ہے  
ہوا ہرگز نہ خط شوق کا سماں درست آتش

۳

آشیار دی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُسکا  
معمورہ عالم ہے جو دیوانہ ہے اُسکا  
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُسکا  
عرصہ یہ دُور عالم کا چلو خانہ ہے اُسکا  
جالت کو کربے خیر وہ یارانہ ہے اُسکا  
قیمت جو دُور عالم کی ہے بیخانہ ہے اُسکا  
جامہ سے وہ باہر ہے جو دیوانہ ہے اُسکا  
آلودہ دُنیا جو ہے بیگانہ ہے اُسکا  
لبریز ہے شوق سے پیمانہ ہے اُسکا

حسن ہری اک جلوہ مستانہ ہے اُسکا  
وہ شوخ نہال گنج کے مانند ہے اُس میں  
جو چشم کہ حیراں ہوئی آئینہ ہے اُس کی  
دلِ قصہ کشمنشہ ہے وہ شیخ آئیں شہنشاہ  
وہ باد ہے اُس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو  
یوسف نہیں جو ہاتھ لے چند درم سے  
آوارگی نہایت گل ہے یہ اشارہ  
یہ حال ہوا اُس کے قیروں سے ہویدا  
خسکناہ ساتی ازل کرتا ہے آتش

۴

نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جہانی کا  
زمانے میں چلن ہے چاروں کی آشنائی کا  
بنایا کاسہ سرو اڑکوں کا سہ گدائی کا  
چمن کی سیر ہے انجام بلبس کو رہائی کا  
توجہ میں تری اسے یار! اثر ہے موسیائی کا  
کوئی آئینہ خانہ کا رخانہ ہے خدائی کا  
تناشا دکھیتا ہے حسن اس میں خود غائی کا  
بچا ہے اسے غم! جو چکو دعویٰ ہے خدائی کا

جباب آسمائیں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا  
تعلق رُوح سے محکو جسد کا ناگوارا ہے  
ہوئی منظور محتاجی نہ محکو اپنے سائل کی  
کھل اسے جان اتن سے تا وصال پار حاصل ہو  
شکست خاطر اجباب ہوتی ہے درست اس سے  
نظر آتی ہیں ہر سہ صورتیں ہی صورتیں محکو  
دل اپنا آئینہ سے صاف عشق پاک رکھتا ہے  
نہیں دیکھا ہے لیکن چکو بچانا ہے آتش نے

۵

نہال خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا

غبار راہ ہو کر چشمِ مردم میں محسّل پایا

زباں کھولی نہ لیکن بات کرتے کا نکل پایا  
موا فرزند اگر تو دارغ دل نسیم ابدل پایا  
صہیر کہنہ دیکھا دست خشک و پاے نفل پایا  
ماہجوم خواب سے زہر وئے آخر کو خلل پایا  
کبھی تازہ نہ لیکن اپنے دل کا یہ کنول پایا

برنگ شمع ہم دل سوختوں نے بزم عالم میں  
شکستہ دل نہواں ہاں عوض ہر شے کا ملتا ہے  
رعونت کون سی شے پر ہے ان عزالت گزنیوں کو  
غضب ہے منزل ہستی میں آسائش طلب ہونا  
ہمیشہ جوش گریہ سے رہا پانی میں اسے آتش

۶  
کستی ہے بھگو خلق خدا غائبانہ کیا؟  
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا؟  
مہر کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا؟  
دل صاف ہو ترا تو ہے آمینہ خانہ کیا؟  
دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے دم و دانہ کیا؟  
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟  
دیکھوں تو موت و مصونہ رہی ہے بہانہ کیا؟  
رستم کی داستان ہے ہمارا فسانہ کیا؟  
نبیل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا؟  
آتش غزل یہ توئے کمی عاشقانہ کیا؟

سن تو سہی جہاں ہیں ہے تیرا فسانہ کیا؟  
نہ بر زمیں سے آتا ہے جو گل سوز زکیت  
اڈتا ہے شوق راحت منزل سے اسپر عمر  
چاروں طرف سے صورت جانماں ہو جلوہ گر  
ضیاء و سیر و ام رگ گل ہے عندلیب  
طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ٹمک و مال  
آئی ہے کس طرح سے مری قفس روح کو؟  
ہوتا ہے زرو سن کے جو نامرد مدعی  
حنیاد گل عذار دکھاتا ہے سیر باغ  
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد کو نہ دے

۷  
وہ دشت ہے کہ جہاں چاہ زیر کاہ نہیں  
سوا اس خم سے بہتر کوئی سہاہ نہیں  
عمل جو نیک ہوں تو ایسی خواہجگاہ نہیں  
سوا خدا کے کرم کے کہیں پناہ نہیں

فریب کو دل اہل صفا میں راہ نہیں  
بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں  
صدایہ قبر سے بیدار دل کے آئی ہے  
عذاب گور ہے دنیا کے رنج سے بدتر

فقیر بن کے قدم اس میں مارے آتش! طریق احمد مسل ہے شاہراہ نہیں

جانب و شت عدم خمیر رواں کرنے دو  
سوز دل میری طرح سے نہ بیاں ہو دیکھا  
کوہ غم ٹوٹنے پر آہ ہے یاں کم ظرفی  
سامنے آہی کیا لشکر اندوہ و لالہ  
آہ کار تہ خاک ہے مسکن سب کا  
پھوٹ بنے دوا نہیں بار کے آگے آتش!

کام بہت سے جواں مرد اگر لیتا ہے  
ناگوارا کو چو کرتا ہے گوارا انساں  
منزل فقر و فنا جاے ادب ہے غافل  
عقل کر دیتی ہے انسان کی جہالت زائل  
غیرت نالہ و فریاد نہ کھو اے آتش!

یہ کس رشک مہیسا کا مکان ہے؟  
خدا پنہاں ہے عالم آشتکارا  
دل روشن ہے روشن گر کی منزل  
مکلف سے بری ہے سخن ذاتی  
برنگ بڑھوں گلشن میں میں بلبیل  
شکستہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ  
زمین یاں کی چہارم آسماں ہے  
نہاں ہے نیچ و پانہ عیاں ہے  
یہ آئینہ سکندر کا مکان ہے  
قبا ہے گل میں گل بوٹا کہاں ہے  
نعل غنچہ کی میرا آشتیاں ہے  
قناعت بھی بہار ہے نزاں ہے



بہت آتا ہے یاو اے صبر شکنیں !  
 تعلق ہوتا ہے خوشبو سے اس کی  
 وطن میں اپنے اہل شوق کی طرح  
 سحر ہو دے کہیں تنہم کرے کوچ  
 سعادت مند قسمت پر ہلکے شاکر  
 جوس کے ساتھ دل رہتے ہیں تلال  
 قد مجرب کو شاعر کہیں سحر و

۱۱

بازار دھرمیں تری منزل کہاں نہ تھی ؟  
 منزل ہی تو رہے جو یہ پہونچی نہیں ہنوز  
 دکھلائے سیر آٹکھیل کو باہم مراد کی  
 رہ جانا تجھیں جسم کا جاں سے عجب نہیں  
 تانہمی کی دلیل ہے یہ سجدہ سے ابا  
 افسوس کیا جوانی رفتہ کا کیجے  
 مالوں سے ایک دن نہ کئے گرم گوش یار

۱۲

مسافر کی طرح رہ خانہ بردوش  
 بغیر ہے دیدہ باریک ہیں کو  
 یہ مشت خاک ہو مقبول درگاہ  
 سفیدی ٹوکی ہو کافور ہر چند  
 نہ خوش ہو فریبی تن سے غافل  
 نہیں جائے اقامت وار خان  
 کرے عینک طلب یہ ناٹوانی  
 صبا کی چاہتا ہوں مہربانی  
 کوئی ٹٹتا ہے داغ نوجوانی ؟  
 شبک کرتی ہے مروے کو گرائی

موسے جو پیٹیر مرنے سے وہ لوگ  
ہوا کوئی نہ حال دل سے آگاہ  
خدا کے حکم سے ہے قوتِ نطق  
مرا دیوان ہے اسے آنکھِ خزانہ  
کفن سمجھے قباے زرد گانی  
رہی مشفق گوشتِ اپنی کہانی  
کلام اپنا ہے لائقِ کی زبانی  
ہر اک بیت اس میں ہے گنجِ معانی

## خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق

وفات ادلی ۱۲۷۷ھ

پیدائش دلی ۱۲۰۷ھ

شیخ محمد رمضان کے لڑکے تھے۔ جو ایک غریب سپاہی تھے۔ ذی الحجہ ۱۲۰۷ھ  
دلی میں پیدا ہوئے۔ ابتداءً حافظ غلام رسول صاحب شوق سے پڑھتے تھے۔ انھیں  
کچھ خدمت میں شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ اسی محلہ میں میر کاظم حسین صاحب  
بمقام ایک ان کے ہم سہن تھے۔ وہ بھی حافظ غلام رسول صاحب سے اصلاح لیا  
کرتے تھے۔ ایک دن وہ ایک غزل کہہ لائے۔ غزل اچھی تھی۔  
شیخ نے مسکرتہ کہا کہ "خوب شعر نکالے ہیں" انھوں نے کہا کہ "ہم شاہ نصیر کے  
شاگرد ہو گئے" شیخ مرحوم کو بھی شوق ہوا۔ ان کے ساتھ جا کر شاگرد ہو گئے  
برابر اصلاح لیتے رہے۔ ایک بار مرزا رفیع السودا کی غزل پر غزل کہی۔ شاہ  
صاحب کے پاس لے گئے۔ انھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی۔ کہ استاد  
کی غزل پر غزل کہتا ہے۔ اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اڑانے لگا؟ یہ  
دواں سے چپکے چلے آئے۔ اس دن سے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ خود کہتے اور شاعری  
میں پڑھتے یہاں تک کہ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلی  
پر اثر برقی کی طرح دھڑی۔ اور کلام کا چرچا بڑھا۔

اکبر شاہ نے دلی عہد ہرزا ابو ظفر کے بادشاہ ہو کر پہا در شاہ  
ہوئے۔ شعر کے شیدا تھے۔ اور ظفر شخص سے ملک شہرت کو مستحضر کیا تھا۔ دربار

شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے سب وہیں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ میر کاظم حسین بقیار ولیعہد کے ملازم خاص تھے۔ ان کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے۔ اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے۔ شاہ نصیر کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ وکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین صاحب میرنشی ہو کر شمسکار پور مسترحہ وغیرہ چلے گئے۔ چند روز کے بعد ایک دن ولیعہد نے ایک غزل جیب سے نکال کر دی۔ کہ ”ذرا اسے بنا دو“ یہ وہیں بیٹھ گئے۔ اور غزل بنا کر سنائی۔ ولیعہد بہما اور بہت خوش ہوئے۔ اور کہا کہ ”بھئی بھئی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو“ پھر بار بار انھیں سے اصلاح لیتے رہے۔ چند سال کے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ سنایا۔ جن کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کئے تھے۔ مطلع اس کا یہ تھا۔

”جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا سکن آب و ایلوہ ہوئے نشو و نما کے گلشن“  
اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

جب مرزا ابوظفر بادشاہ ہو کر بہما اور شاہ ہوئے۔ تو پہلے انھوں نے قصیدہ گزارنا اس پر تنخواہ میں ایک معتمد بہ اضافہ ہوا۔ آخر ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی۔ اور انھوں نے ایک قصیدہ غرا کہہ کر نذر گزارنا۔ تو طلعت کے علاوہ خطاب و خاتون بہما اور ایک ہاتھی مع حوضہ تقری انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہہ کر گزارنا۔ جس کا مطلع یہ ہے۔ ”عشپ کوئیں اپنے سر پر غلاب جا“ اس پر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا۔

۱۲ صفر ۱۰۸۵ھ ہجرات کا دن تھا۔ کہ ۱۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا۔  
”کہتے ہیں آج فوق جہاں سے گذر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے“

علوم متداولہ میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ تعقوت خوب جانتے تھے۔ نجوم رمل موسیقی میں بھی دخل تھا۔ غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون صفائی کلام۔ جیتی ترکیب۔ خوبی محاورہ ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ قصائد میں اصلی میزان ان کی طبیعت کا سمجھنا کے انداز پر زیادہ تھا۔ سودا کے بعد شیخ مرحوم کے سودا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا۔

کلام کو دیکھ کر یہ عام انداز معلوم ہوتا ہے۔ کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اتارے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انہیں ایسی شان و شکوہ کی گریسوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انہیں قادر کلامی کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی۔ کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں۔ کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارہ کی بوسے بناتے ہیں۔ کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دیتے ہیں۔ مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں۔ کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے۔ اور مجھ سے کبھی واہ اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے ہونٹوں میں شستہ اور جرتہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں۔ اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جسے جہاں بجا دیکھتے ہیں۔ وہ گویا دہریے کے لئے ہوتا ہے۔ وہ طیبہ کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے۔ کہ کون ہے۔ کہ سادگی میں رنگ دے جائے گا۔ اور کون رنگینی میں۔ کامل مصور کی تیزی قلم کو اس کے رنگوں کی شوخی روشن کہنی ہے۔ اسی طرح ان کے مضمون کی باریکی کو ان کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انہیں اس بات کا کمال تھا۔ کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے۔ گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا۔ کہ کاٹوں کے رستہ سے پلاوا ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتے۔ جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور دل پر اثر بھی کرتا ہے۔

## قصیدہ

مرزا ابو ظفر بہادر شاہ نے عالم ولیعہدی میں بیماری کے بعد

صحت کیا تھا۔ اس کی مبارکباد میں یہ قصیدہ لکھا گیا تھا۔

واہ واکہ معتدل ہے باغ عالم میں ہوا  
بھرتی ہے کیا کیا مہجانی کا دم باو بہا  
ہے گلؤں کے حق میں شلیم مریم زخم جگر  
ہو گیا موت یہ سودا کا بالکل احتراق  
ہو گیا لائل مزاج دہر سے ہاں تک جنوں  
ہوتا ہے لطیف ہوا سے اس قدر پیدا ہو  
پانی یہ اصلاح صفر لے کہ دنیا میں کہیں  
ہر مزاج بلغمی میں ہوتی ہے تولید جنوں  
ام کو اشیا میں سے تلخی سی سے سمیت  
کیا عجیب جگہ دار کی تاثیر گر رکھے زقوم  
فیش کی جانوش ہو دنیا لہ زبور میں  
راحت و آرام کا اس دور میں ہے دور دور  
موتیا بندھ آئینہ میں اپنی جو رکھتی ہے صند  
آگیا اصلاح پر ایسا دماغ کا مزاج  
نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہوا شافی طیب  
فرق چاہا یاں تک اعضاء بدن سے دور  
لاغول کو ہو کمال تاب و طاقت یہ شتاب

مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا  
نہ گیا گلزار عالم رشک صد و اشفا  
شاح بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مویا  
لالہ ہے داغ سپہ پاسے لگا نشو و نما  
بید جنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا  
برگ میں ہر غل کے سرخی ہے جوں برگ حنا  
زرد پتھر آپ دیکھنے کو بھی نہیں ہے کمر یا  
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا  
نہ گئی تریاک افیوں زہر میٹھا ہو گیا  
کیا عجیب گر آپ حنظل دیوے فرشتہ کا مزا  
کام میں انہی کے ہو مہرہ بجائے آبلہ  
چاہئے واقعہ ہو دوران سر سے آسیا  
آپ رکھے ہے روشنی مثل دل اہل صفا  
تا زبان خامہ بھی آتا نہیں حرف دوا  
کشتا ہے بہار دہس کر جھجکوا بالکل ہے شفا  
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی سب ہیں جلا  
کیسے دو ہفتہ ہلال اک شہب میں ہو بد رالہ جلا

صحیح صادق کے ہے گو سر میں سفیدی آگئی ق  
 بھوک کی شدت سے اس کو اک نفس دھت نہو  
 رات بھر ٹوٹکا کیا انجم کے دانے چرخ ہیر  
 پہونچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانے میں  
 کوں بچھو لائے خوشی سے لٹخ کا کیا دخل ہے؟  
 ہضم کامل اس قدر معرہ لے پہونچا یا بہم  
 ہے مزاج اہل عالم یہ قریب اعتدال  
 رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس؟  
 دیگا طاؤس اپنے باور سے سارے نقش و صو  
 اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج  
 واقعی کس طرح سے صحت مر اک عالم کو ہو؟  
 وہ ولی عہدِ دماں مرزا محمد یوسف  
 تقدیر کا یہ اثر ہو عام۔ جو ہیں برگ زد  
 شادی صحت سے اسکی آج ہو کر شاد و شاد  
 میں بھی اس رشکِ چمن محفل میں وہ مطلع پڑھو

## مطلع دوم

آج ہے عالم میں وہ روزِ سعادت انتہاء  
 مژدہ جاں بخش صحت ہے نرما ماءِ احیات  
 ہے بقاے عمر سے تیری بقاے عمر خلق  
 قطرہ افشانی سے آب غسلِ صحت کے نرے

لیکن اس پیری میں بھی صاف ہے ایسی اشتها  
 قرص سے خورشید کے جب تک نہ کرے ناشتا  
 پھر جو دیکھا صبح کو اصل شکم میں کچھ نہ تھا  
 لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرتا  
 جوں جناب اسکے نہیں مطلق شکم میں استلا  
 جید الکینوس ہے جو خلق سے اتری غذا  
 ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بختِ استوا  
 بارغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا  
 پھینک دے گی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختہ  
 نام گلشن میں نہیں ہے ترس بیمار کا  
 جب کہ ہوا اس کی نوید غسلِ صحت جاں فزا  
 اس کی قوت گر ضعیفوں کو بناوے اقویا  
 ہوں مقوی دل و جاں میں اوراقِ طلا  
 تہنیت نوائی میں ہیں سرگرم سب برت سرا  
 ہنس تصویرِ سنمکر بول اٹھے مرجا

ہو دوس استحال یا قوتی میں وہ موتی اگر  
 جسم کو کل کل کے دھویا تو نے جس دم و قوت  
 دل حد و نگدل کا تھا شقاوت سے جو سخت  
 خورہ دل کو صبا لائی تصدق کے لئے  
 شادی صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ کج؟  
 چھپرے تار شمع کو گرنا سخن موج نسیم  
 لب پہ ساغر کے پے ہوں موج تبسم موج کے  
 جزم تصویرات فانوس خیالی کی طلسم رح  
 کر رہا صحن چمن میں پے کیا طاؤس رقص؟  
 خانہ ہا سے چشم میں بھی پتیلیوں کا رقص ہے  
 چھوٹی آتش بازی ایسی جس کی گلکاری کو دیکھ ق  
 صنع آتش باز پر حیرت زدہ ہوتی ہے عقل  
 ہو گئی تاثیر اس کی یہ کہ ہر گل رہ نہ رہے  
 گنج چھپتے تھے ستاروں کے عجب انداز سے  
 منہ ہے کیا جو رنگ سے مہتاب کے ہوتا ہوا؟  
 برج جو اڑ کے ہوئے قندیل شب زیر فلک  
 فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ اسکے روبرو  
 ہے زبان خامہ عاجز آگے بس تشریف میں  
 رکھے صحت سے ہمیشہ شامی مطلق نہ کھتے  
 جو تر سے بدخواہ ہوں وہ سچ میں ہوں مبتلا

## قصیدہ مسدس دعائیہ

سر پر ایسے گردوں جب تک سلطان خاور ہو  
عطار و میر منشی زہرہ ناظر آسمان پر ہو  
سرفراز آسمان جب تک کہ دورِ بخت اختر ہو  
رہے نام سلیمان تا نگین حکمرانی سے  
رہے دارا کو تا نام آوری تلخ کیانی سے  
ترزاے خسرو والا حشم عالم مستخر ہو  
بخار راجن سے تا ابرہہ اور ابرہ میں پانی  
زمین میں تا ہو کان اور کان میں ہو جوہر کافی  
ترکی شمشیر جوہر دار میں نصرت کا جوہر ہو  
رکھیں تا خود کو آتش پہ اور آتش کو جہر میں  
رہے ناف میں مشک اذ فرا و تو مشک اذ فر میں  
ترے ابر کرم سے بلغ عالم نازہ و تر ہو  
طریق رہبری میں فقر ہو جب تک ہدایت فن  
رہے اور بس تا قطع لعل سے جہاں مسکن  
چراغ عمر سے تیرے جہاں سارا منظور ہو  
شفیق گلگونہ ہو جب تک سحر کے دے نیکو کو  
نور یا نور تن تا کہ کشاں سکے ہو سے بازو کو  
لب باں خور و دشمن کے لہو سے تیرا خور ہو  
گستاخ میں ہو تا گل اور گل سے شاخ ہو زیبا

قر و ستار اعظم صدر اعلیٰ سعد اکبر ہو  
زحل میر عمارت ترک گردوں میر لشکر ہو  
اکی یہ بہادر شاہ شاہ ہفت کشور ہو  
رہے نام فریدوں تا درفش کاویانی سے  
سکندر تا ہونامی سکندر کشورستانی سے  
سریر سلطنت پر تو ہمیشہ داؤ گستر ہو  
رواں پانی سے تا دریا ہواور دریا کو طغیانی  
پئے جوہر ہو قیمت اور قیمت کو فراوانی  
ترے قبضہ میں بحرِ پُر گہر اور کان پر تر ہو  
گل تر تا ہو گلستان میں تری ہو تا گل تر میں  
صدف میں تا ہو گوہر اور ہو تا آب گوہر میں  
شیم غلق سے تیرے جہاں یکسر معطر ہو  
سمارا ہووے تا بہر غرق الیاس کا دامن  
میسجا کا ہو بالا خانہ تا خورشید سے روشن  
فردین اسلام کو پور و فنی دین ہمہ گیر ہو  
کرے آراستہ تا شام اپنے تھوے کیس کو  
کرے دسمہ سے تا قوس قزح سہراپنے ابرو کو  
سربدخواہ خندق تیرے انگشت سنال پر ہو  
نیشاں میں ہوتاے اور تے سے نغمہ ہو پیدا



نہال تاک میں انگور ہو انگور میں صربا  
شربہ عیش سے خالی بھی تیرا نہ ساغر ہو  
قلم راستی پیشہ ہو اور کاغذ صفا آئین  
زباں پر تاسخ ہو اور سخن میں معنی نگین  
نظم صبا میں ہو اور ہو نظم جب تک نشاط افرا  
ہمیشہ جشن جمشیدی سے تیرا جشن بہتر ہو  
قلم زن تا ہو مشک فشان کاغذ خط سے مشک نگین  
سخن تا دو چاہے اور تا اہل سخن تختیں  
ہمیشہ تملیت خواں ہو دعا گو ہو ثنا گو ہو

### سہرا

ذباب زیت محل کو بادشاہ کے مزاج ہیں بہت دخل تھا۔ ہڑا جوان بخت  
ان کے بیٹے تھے۔ اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر  
سے ان کی ولیعهدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ ان کی شادی کا موقع آیا۔  
بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے بیگم کے ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا  
کمر زر نگار کاغذ پر لکھ کر ایک تونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ  
صلور میں گزارا۔

خوش ہوا سے بخت! کہ ہے آج تیرے سہرا  
کیا ہی اس چاند سے کھٹے پر پھلا لگتا ہے!  
سر پہ چڑھنا تجھے بھینتا ہے پرے طوق کلاہ!  
تاؤ بھر کہہ ہی پروئے گئے ہوں گے موتی  
آج پہ دو طہاکے جو گرمی سے پسینا پڑکا  
یہ بھی رک ہے ادنیٰ تھی کہ قبا سے بڑھ جائے  
جی میں اترا میں نہ موتی کہ ہیں ہیں اک چیز  
جب کہ اپنے میں سائیں نہ خوشی کے مارے  
نخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چاک

باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پر سہرا  
پتے زرخین دل افروز کا زیور سہرا  
مجھ کو ڈرتے کہ نہ چھینے تیرا نمبر سہرا  
تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا  
ہے رگ ابر گز بار سہرا سہرا  
رک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا  
چاہئے چھوٹوں کا بھی ایک منظر سہرا  
گو ندھے چھوٹوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا  
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

ہمارے شیخ کا نہیں ہے یہ رہ گئے اب ہمارے  
ہم سخن فلم ہیں غالب کے طوقدار نہیں

جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ طال ہوا۔  
فوق مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ استاد اسے تو دیکھو  
انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیرو مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا  
تم بھی ایک سہرا کہدو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھدو۔ اور کہا کہ  
مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی حضور دیکھا۔ عرض بیٹھ گئے۔ اور عرض کیا۔

اے جواں بخت! مبارک تجھے سر سہرا  
آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ اکہم سے فلک  
تاجش سخن سے مانند شمعِ نورِ اشید  
وہ کہنے "صل علی" یہ کہنے "سبحان اللہ"  
تاجے اور بنی میں رہے اخلاص بہم  
وہ صوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی  
گروے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار  
ایک کو ایک پہ تزیین ہے دم آرایش  
ایک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا  
پھرتی خوشبو سے ہے اڑائی ہوئی باو ہمار  
سہرے پہ طرہ ہے موزن تو گلے میں بڑھی  
رؤنائی میں تجھے دے سو خورشیدِ فلک  
کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشا یوں کے  
دُرِ خوش آبِ مضامین سے بنا کر لایا

آج ہے یکن و سعادت کا ترے سر سہرا  
سکشتی زر میں مہ نو کی لگا کہ سہرا  
زنجِ بے نور پہ ہے تیرے منور سہرا  
دیکھئے نکھرے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا  
گو تھئے سورۃِ اخلاص کو پڑھ کر سہرا  
گائیں مرفانِ نواج نہ کیونکر سہرا  
تارِ بارش سے بنا ایک سہرا سر سہرا  
سہرے دستار پہ دستار کے اوپر سہرا  
نیرا بنوایا ہے بے کے جو گوہر سہرا  
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا  
کنگنا ہاتھ میں نہیہا ہے تو سر پر سہرا  
کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا  
دمِ نظارہ ترے رُو سے نکو پر سہرا  
واسطے تیرے ترا فوقِ شن کر سہرا

جن کو دعوئے ہو سخن کا یہ ستاد و آن کو دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا  
ہرزا برے اداس تھے۔ جب اُن کو اس کی خبر ہوئی۔ سمجھے کہ کیا کٹا کچھ اور

ہو گیا کچھ اور۔ یہ قطعہ کمر حنور میں گذرانا۔ سب طرف سے تعریفیں ہوئیں۔  
منظور ہے گذارش احوال دائمی  
ننوا پشت سے ہے پیشہ آہا سپہ گری  
آزادہ روہوں اور راسلک ہے صلہ گل  
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں  
استاد شہ سے ہو مجھے پر خاش کا خیال  
جام جہاں نا ہے شہنشاہ کا ضمیر  
میں کون اور رنجیت ہاں اس سے دعا  
سہرا کھٹا گیا زردہ اقبال امر  
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات  
رُوسے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسہا ہ  
قسمت بڑی سہی بہ طبیعت بڑی نہیں  
صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ

## غزلیات

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا  
جس انسان کو سگ و نیا نہ پایا  
مقدار ہی ہے گر شود و زیاں ہے  
سُرخ عمر رفتہ ہاتھ کیا اُسے ؟  
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا  
فرشتہ اُس کا ہم پایا نہ پایا  
تو یاں ہم نے نہ کچھ کھویا نہ پایا  
کہیں جس کا نشان پایا نہ پایا

کرے کیا سیر دل ملک فنا کی؟  
 رہ گم گشتگی میں ہم نے اپنا  
 رہا ٹیڑھا مثال پیش کر دوں  
 ملک کے گنبد بے در سے ہم تو  
 جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا  
 جوں داغ لے کر دل میں ڈھونڈا  
 وہ از خود رفتہ ہوں جسکو خودی سے  
 یہی ہر دم سے زخم دل کا رونا  
 لکھی تو اور کبھی تیرا نام  
 نظیر اسکا کہاں عالم میں اسے زوق

کہ اس بازار میں سودا نہ پایا  
 غبارِ راہ کبھی عتقا نہ پایا  
 کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا  
 مکمل جائے مگر رستہ نہ پایا  
 کبھی ہم نے مجھے تنہا نہ پایا  
 اثر پر صبر و طاقت کا نہ پایا  
 خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا  
 دین پایا لب گویا نہ پایا  
 عرض غالی دل شیدا نہ پایا  
 کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

میرے سینہ سے تیرا تیر جب اسے جنگ جو نکلا  
 مرا گھر تیرا منزل گاہ ہوا بیسے کہاں طالع؟  
 پھر اگر آسمان تو بنو تو میں تیرے ہی سرگرداں  
 میرے عشق کا تھا تھانہ افلاک پر ڈھونڈا  
 کہیں جھگوڑے پایا کچھ ہم نے کہ جہاں ڈھونڈا  
 خجل اپنے گناہوں سے ہوں یاں تک میں کہہ پایا  
 مجھے سب ناخون تیرا اور توئی سرسوزن  
 اسے عیار پایا یا مجھے زوق ہم جس کو

وہاں زخم سے خون ہو کے حزن آرزو نکلا  
 خدا جانے کدھر کا چاند آج اسے ماہر نکلا  
 اگر خورشید نکلا تیرا گرم جسے نچو نکلا  
 کہ تھا لہریں غم اس نمکدہ سے چپ ہو نکلا  
 پھر آخر دل ہی میں دیکھا غل بی بی نکلا  
 تو جو آنسو میری آنکھوں سے نکلا سرخرو نکلا  
 مگر تھا دل میں جو کا نشانہ ہرگز وہ نہ نکلا  
 جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ غم نکلا

لکھے اسے خط میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا  
 پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اٹھ نہیں سکتا

پہاڑ بڑا صورت تھویر ہنسالی  
 آتی ہے صد اسے جس ناقہ لیلے  
 ہوں دانہ روئیدہ تہ خاک ہمارا  
 ہر داغ معاصی مرا اس دامن ترے  
 اتنا ہوں تری بیخ کا شرمندہ احسان  
 پردہ در کعبہ سے اٹھانا تو ہے آساں  
 کیوں اتنا گراں بار ہے؟ جو راہ سفر بھی  
 دنیا کا زوال کیا جمع تو کیا فوق؟

نالہ کہتا ہے کہ "تا چرخ زحل جاؤں گا  
 کج اگر راہ نہ پاؤں گا تو کل جاؤں گا  
 دل سے کہتا ہوں کہ تو ساتھ نہ لیجا مجھ کو  
 مدرسہ میں بھی اگر جاؤں گا تو جاسے کتاب  
 دل یہ کہتا ہے مجھے سینہ روزن سے نکال  
 اٹکھ سے افک صفت مجھ کو اگر نہ اٹھا  
 گر پڑا آگ میں پروانہ دم گر جی شوق  
 کہتا پیراہن گل ہے یہ نزاکت سے نسیم  
 سستے ہو زاہد و ناصح جو ہیں سمجھاتے مجھے  
 میں وہ مشتاق شہادت ہوں کہ سر دیئے کو  
 جنبش برگ صفت بارغ جہاں میں اے فوق

بلکہ میں توڑ کے اُسکو بھی ٹکڑ جاؤں گا  
 کوچہ یار میں پر سر ہی کے بل جاؤں گا  
 جا کے میں وال ترے قابو سے نکل جاؤں گا  
 شیشہ بادہ لئے زیر بغل جاؤں گا  
 ورنہ توں ہو کے میں آنکھوں میں سے نکل جاؤں گا  
 دل نہیں ہیں کہ سنبھالے سے سنبھل جاؤں گا  
 سمجھا اتنا بھی نہ کم نجات کہ جل جاؤں گا  
 "ہاتھ مجھ کو نہ لگانا کہ ٹکڑ جاؤں گا"  
 کیا بدل دیوں گے یہ اور میں بدل جاؤں گا  
 پاسے کو باں نہ شمشیر اجل جاؤں گا  
 کچھ نہ ہاتھ آئے گا تو ہاتھ توکل جاؤں گا

برق کیا ہے؟ تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 سیکھے۔ مگر اپنا چھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 اپنے ہاتھوں کھر لٹکانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 سچ تو یوں ہے سکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 درد دل اپنا جتنا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 چھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 تیوروں کا تار جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 کیا سکھائے گا سکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 لیکن آنکھوں میں سنا کوئی ہم سے سیکھ جائے

اگر کیا ہو؟ اسنو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے  
 پوچھے نکالے۔ جسے کرنا ہو سجدہ سہو کا  
 تیر و پکیاں جتنے دل میں تھے۔ دے تپنے نکال  
 دیکھ کر قاتل کو بھرائے عرش دل میں توں  
 خطا میں لکھو اگر آنکھیں بھیجا تو مطلع درد کا  
 تیغ تو اوجھی پڑی تھی۔ مگر پڑے ہم آپ سے  
 جب کہا ”مرنا ہوں“۔ وہ بولے ماسر کاٹ کر  
 واں پے ابرو یہاں پھیری نگلے پر پہننے تیغ  
 سن کر آمد آن کی از غور رقم ہو جائے نہیں ہم  
 پہننے پہلے ہی کہا تھا ”تو کسے گا ہم کو قتل“  
 جو سکھایا اپنی قیمت نے۔ وگرنہ اسکو غیر  
 کیا ہوا اسے ذوق ہیں جو مرد کا ہم رویا؟

یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے  
 مژدہ خار و شت پھر تلوار اٹھالے ہے  
 استخوان میں رہا کس کس مزے سے چلے ہے  
 وکیلے لب تک خدا کس طرح سے چلے ہے  
 رحم جوش گریہ! چھاتی پھر اٹھی کھرتے ہے  
 اُفاری بنیابی! کہ یاں تو دم ہی نکالے ہے  
 جانب درد دیکھ لے ہے جبکہ جوش آجائے ہے

سر و قوت ذبح اپنا۔ اس سکھ ڈیر با ہے  
 رخصت اسے زنداں! جوں بڑھیر و کھڑکاسے ہے  
 واہ دانشور محبت! خوب ہی چھڑکا نمک!  
 دم کی ہے سیدہ میں! اگر ضعیف سے یہ گفتگو  
 بس کرم سوز دردوں! جتن جائیگے دل اوپر  
 بل بے استغنا کہ! وہ یاں آئے آئے ہو گئے  
 نرس میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار

دیوان چندو لالی دارالمہام چیلہ رآپاؤنے کئی ہزار روپے بھیکر بلا بھیجا  
اور صبح اپنی طرح مشاعرہ کا بھیجا۔ ذوق مرحوم نے زمین مذکور میں دو غزل کہہ کر  
بھیج دیا۔ اور روپیہ نہ لیا۔ اسی سے یہ چند اشعار انتخاب کر کے یہاں لکھے گئے ہیں۔

کل گئے تھے تم جسے بیمار ہجرال چھوڑ کر  
طفل اشکبہ لسا گرا دامن مگر گال چھوڑ کر  
پہل بسا وہ آج سب ہستی کا سماں چھوڑ کر  
پھر نہ اٹھا کوچہ چاک گر سب ال چھوڑ کر  
ورنہ جائے دغ عصیاں میرا دامن چھوڑ کر  
رہ گیا بس فشی قدرت جبکہ و ال چھوڑ کر  
لعل کیوں اس رنگ سے تباہ نشاں چھوڑ کر  
دوڑے سارے کو کبھی آدھی نہ انسان چھوڑ کر  
کون جائے ذوق پر خلی کی کیاں چھوڑ کر

بیل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر  
کیا ڈھونڈے وقت گم شدگی میں تھکے کہ ہے  
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر  
عقلمارے چراغ سے دور اور شکستہ پر  
مُرخان کوہ وراغ سے دور اور شکستہ پر  
تخم سے الگ ایساغ سے دور اور شکستہ پر  
اُس شوخ نوش دغ سے دور اور شکستہ پر  
پہلے نشانِ دغ سے دور اور شکستہ پر  
کوسوں پہ وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

لائی حیات آئے رقصاے چلی چلے  
یہ ستر تو ہے یہی کہ نہ رہا سے دل لگے  
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے  
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہونگے اس بساط پہ ہم جیسے بد قرار  
ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ  
نازاں ہو خرد پہ۔ جو ہونا ہو ستو ہی ہو  
دنیا نے کس کا آہ دنیا میں دیا ہے ساقیہ؟  
جائے ہو اسے شوق میں ہیں اس جہنم کے شوق  
جو چال ہم چلے شو نہایت بڑی چلے  
ہم کیا رہے یہاں؟ ابھی آئے ابھی چلے  
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے  
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے  
اپنی بلا سے باوجود اب بھی چلے

## انتخاب از کلیات غالب

### قصیدہ

ہاں مہ تو مائیں ہم اُس کا نام  
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح  
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟  
اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا  
عذر میں نہیں دن نہ آنے کے  
اُس کو بھولا نہ چاہئے کہنا  
ایک ہیں کیا کہ سب نے جان لیا  
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟  
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں  
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش  
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو  
مہر تاباں کو ہو تو ہوا سے ماہ

جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام  
یہی انداز اور یہی اندام  
بندہ عاجز ہے گردش اکرام  
آسمان نے بچھا رکھا تھا دام  
لے کے آیا ہے عید کا پیغام  
صبح جو جاے اور آئے شام  
تیرا آغاز اور تیرا انجام  
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں گم نام  
ایک ہی ہے امید گاہ انام  
غالب اُس کا مگر میں ہے غلام  
تب کہتا ہے بطور استفہام  
قرب ہر روزہ بر سبیل دوام



تجھ کو کیا پایہ رُوشناسی کا  
 جانتا ہوں کہ آسکے فیض سے تو  
 ماہ بن مانتا بن میں کون؟  
 میرا اپنا جدا معاملہ ہے  
 ہے مجھے آرزوے بخشش خاص  
 جو کہ بخشے گا تجھ کو فروغ  
 جب کہ چوگاہ منازلِ فلکی  
 تیرے پر نوست ہوں فروغ پذیر  
 دیکھنا میرے ہاتھ میں لہر نہ  
 جزیہ تہذیبِ عید ماہ صیام  
 پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام  
 تجھ کو کیا بانٹ دیگا کیا انعام  
 اور کے لین دین سے کیا کام  
 مگر تجھے ہے امید بخشش عام  
 کیا نہ دے گا مجھے بے گفام  
 کر چکے قطع تیری تیزی گام  
 کو بے و مشکوے و سخن منظور بام  
 اپنی صورت کا اک بلوریں جام

### آفتاب

صبح دم دروازہ خاور کھلا  
 خسرو انجم کے آیا صحن میں  
 وہ بھی غنی اک سیما کی سی نمود  
 ہیں کو اکب کچھ - نظر آتے ہیں کچھ  
 سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو  
 صبح آیا جانبِ مشرق نظر  
 غنی نظر بندی کیا جب رُوحِ  
 لاسے ساتی نے جلوہ کی کے لئے  
 مہر عالم تاب کا منظر کھلا  
 شب کو تھا بختیہ گہر کھلا  
 صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا  
 دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا  
 موتیوں کا ہر طرف زلور کھلا  
 اک نگارِ انشیں سج سر کھلا  
 بادِ گل رنگ کا ساغر کھلا  
 رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

### در صفتِ اُتبہ

ہاں اول ورد مند زمرہ ساز  
 کیوں نہ کھولے در خزینه راز؟

خائے کا صفحہ پر رواں ہونا  
 مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھئے؟  
 بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے  
 آم کا کون مرو میڈاں ہے؟  
 تاک کے جی میں کیوں رہے اڑاں  
 آم کے آگے پیش جاوے خاک  
 نہ چلا جب کسی طرح مقدور  
 یہ بھی ناچار جی کا کھوتا ہے  
 مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے؟  
 نہ گل آس میں نہ شلخ و برگ نہ ہا  
 اور دوڑا پیئے قیاس کہاں؟  
 جان میں ہوتی گر یہ شیرینی  
 جان دینے میں آس کو کیا جان  
 نظر آتا ہے یوں مجھے یہ مرق  
 آتش گل پہ قند کا ہے قوام  
 یا یہ ہوگا کہ فطر رافت سے  
 انجلیں کے بجائے رب الناس  
 یا لگا کر خضر نے کشاخ نبات  
 تب ہوا ہے مرفشاں یہ نخل  
 مٹھا ترنج زر ایک خسرو پاس  
 آم کو دیکھتا اگر ایک بار  
 شلخ گل کا ہے گل فشاں ہونا  
 نکتہ ہائے خسرو فرما لکھئے  
 خامہ نخل مطب فشاں ہو جائے  
 مٹرو شلخ گوئے و چوگاں ہے  
 آئے یہ گوئے اور یہ میڈاں  
 بھڑتا ہے جلے پھپھو لے تاک  
 بادۂ ناب بین گیا انگور  
 شرم سے پانی پانی ہوتا ہے  
 آم کے آگے ٹیشکر کیا ہے؟  
 جب شراں آئے تبا ہوا سکی بہار  
 جان شیریں میں یہ ششاس کہاں؟  
 جان میں ہوتی گر یہ شیرینی  
 جان دینے میں آس کو کیا جان  
 نظر آتا ہے یوں مجھے یہ مرق  
 آتش گل پہ قند کا ہے قوام  
 یا یہ ہوگا کہ فطر رافت سے  
 انجلیں کے بجائے رب الناس  
 یا لگا کر خضر نے کشاخ نبات  
 تب ہوا ہے مرفشاں یہ نخل  
 مٹھا ترنج زر ایک خسرو پاس  
 آم کو دیکھتا اگر ایک بار  
 شلخ گل کا ہے گل فشاں ہونا  
 نکتہ ہائے خسرو فرما لکھئے  
 خامہ نخل مطب فشاں ہو جائے  
 مٹرو شلخ گوئے و چوگاں ہے  
 آئے یہ گوئے اور یہ میڈاں  
 بھڑتا ہے جلے پھپھو لے تاک  
 بادۂ ناب بین گیا انگور  
 شرم سے پانی پانی ہوتا ہے  
 آم کے آگے ٹیشکر کیا ہے؟  
 جب شراں آئے تبا ہوا سکی بہار  
 جان شیریں میں یہ ششاس کہاں؟

رونی کار گاہ برگ و نوا  
دہر و راہِ خلد کا گوشہ  
صاحبِ شاد و برگ و بار ہے آم  
نازشِ دُور مان آب و ہوا  
طوبیلا و سدرہ کا جگر گوشہ  
ناز پروردہ بہار ہے آم

### قطع

اے تازہ واروان ہوا ہے بساط دل !  
دیکھو مجھے جو دیدہ عہدِ سرست نگاہ ہو  
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط  
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدا ہے چنگ  
یا صبح دم جو دیکھتے آ کر تو بزم میں  
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی  
آتے ہیں عیب سے یہ مضامین خیال میں  
زہن مارا اگر تجھیں ہوسِ نائے و نوش ہے  
میری سنو جو گوشِ نصیحتِ نیش ہے  
داہانِ باغبان و کفِ گل و فروش ہے  
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے  
نئے وہ سرورِ سوزِ نہ جوش و خروش ہے  
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خوش ہے  
غالبِ صریحِ خامہ نواسے سروش ہے

### غزلیات

دوستِ غواری میں میری سعی فرمائیکے کیا؟  
سے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کہ نک  
حضرتِ صاحبِ گراہیں دیدہ و دلِ فرشِ راہ  
آج والی تیغ و کفن باندہ ہم سے جانا ہوا ہے  
گر کیا نامحس نے ہم کو قید اچھائیوں سہی  
غمانِ زورِ زلفِ پس زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟  
بہ آب اس معمر میں خطِ غم الف اسد  
زخم کے بڑھنے تک ناخن نہ بڑھائیکے کیا؟  
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیکے کیا؟  
کوئی مجھ پر تو سمجھا دو کہ سمجھا دیکے کیا؟  
عذر میرے عقل کرتے ہیں وہ آب لائیکے کیا؟  
یہ جنوںِ عشق کے انداز چھٹ جائیکے کیا؟  
ہیں گرفتارِ وفا زندان سے کھڑائیکے کیا؟  
ہمے دانا یہ کہ دلی میں رہیں سکھائیکے کیا؟

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا  
کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا  
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا  
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا  
مجھے کیا برتا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا  
نہ بھی بھانڈا اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا  
جو دلی کی ٹوکھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا  
کچھ ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا  
مرنے سے وعدہ پر مجھے ہم تو یہ جاں چھوٹ جانا  
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بچے ہیں دوست ناصح؟  
رنگ سنگ سے پہنتا وہ لہو کہ پھر نہ ٹھمتا  
کیوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بڑی بلاتا  
ہوئے مرنے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ مرنے دیر؟  
اسے کون دیکھ سکتا کہ بیگانہ ہے وہ دیکھتا  
یہ مسائلِ ظنون یہ بڑا بیانِ غالب

کہتے ہیں جنت تو گزرتا ہے کہاں اور  
دسے اور دل اُنکو چوندے بگونیاں اور  
لے آئیں گے بازار سے چاکر دل و جان اور  
ہوتے جو کئی دیدہ خونناہ فشاں اور  
ہر روز دکھانا ہوں میں ایک لایع ناں اور  
کرتا جو نہ مرنے کوئی دن آہ و فغاں اور  
مرکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور  
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ہے ہیں کہ ہر اک اُنکے اشارے میں نشان اور  
یارِ وہ نہ سمجھتے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات  
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم؟ جب پھٹیں گے  
ہے خونِ جگر چوٹ میں دل کھول کے روتا  
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا  
یہ تار اگر دل نہیں دیتا کوئی دم چین  
پاتے نہیں جب راہ تو چرچر جاتے ہیں ناے  
ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور  
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھٹا کوئی دن اور

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور  
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"

کیا تیرا گھڑتا جو نہ مرنے کوئی دن اور  
پھر کیوں نہ رہا گھر کا نقشہ کوئی دن اور  
کرتا ملک الموت تقاطع کوئی دن اور  
پتھوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور  
کرنا تھا جواں مرگ گذرا کوئی دن اور  
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ہاں اسے خاک پر جواں تھا ابھی عارف  
تم ہاں مشبہ چار دہم تھے مرے گھر کے  
تم کون سے ایسے تھے گھر کے داؤد سند کے؟  
مجھ سے تجھیں نفرت سی پیر سے رطائی  
گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش  
مادام ہر جوتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غائب

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک؟  
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گھر ہونے تک  
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک؟  
خاک ہو جائیگے ہم تم کو خسر ہونے تک  
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک  
گر می بزم ہے اک رقص شر ہونے تک  
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک  
وام ہر مہج میں ہے حلقہ صد کام ہنگام  
عاشقی ضرر طلب اور تمنا ہے تاب  
ہم نے مانا کہ تقاضا نہ کر دے - لیکن  
پرتو خورشید ہے شبنم کو فنا کی تعلیم  
اک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل  
غم ہستی کا اسمد کس سے ہو جز مرگ علاج؟

خاک میں کیا صدف بنیں ہونگی کہ نہاں ہو گئیں؟  
لیکن اب نقش و نگار طاق نشیاں ہو گئیں  
لیکن آنکھیں روز و رات دیوار زنداں ہو گئیں  
بلبلیں سن کر مرے نامے غر لخواں ہو گئیں  
میری آہیں بخیہ چاک گریباں ہو گئیں  
لہتیں جہاڑت کئیں اجڑا سا اہاں ہو گئیں

سب کہاں؟ کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں  
یا وہیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آہیاں  
قید میں یقیناً لے لی گو نہ پوست کی خسر  
میں جن میں کیا گیا گو یا دبستان کھل گیا  
بس کہ رو کا میں نے اور سینے میں میرے پے پر پے  
ہم موجد ہیں ہمارا کیش ہے ترک ٹر سوم

بچ سے ہو کر ہوا انسان ٹوٹ جاتا ہے رنج  
یوں ہی گرد و تار رہا غالب تولے اہل جہاں

ابن مریم ہوا کرے کوئی  
نہ سٹوگر بڑا کرے کوئی  
زوک لو گر غلط چلے کوئی  
کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند؟  
کیا کیا خضر نے سکندر سے؟  
جب توقع ہی اٹھ گئی غالب

پھر اس انداز سے بہار آئی  
دیکھو اے ساکنان خطہ خاک  
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتا سر  
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی  
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے  
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر  
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب

کوئی میسجبر نہیں آتی  
موت کا ایک دن معین ہے  
آگے آتی تھی حال دل پہنسی

کوئی صورت نظر نہیں آتی  
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی  
اب کسی بات پر نہیں آتی

جاننا ہوں قواب طاعت و زہد  
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں  
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہنگو بھی  
مرے ہیں آرزو میں مرنے کی  
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب  
پر طبیعت ادھر نہیں آتی  
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی  
کچھ ہماری خبر نہیں آتی  
موت آتی ہے پر نہیں آتی  
شہر مہنگو مگر نہیں آتی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟  
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار  
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں  
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود  
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟  
شکون رعب خفیں کیوں ہے؟  
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟  
ہنگو ان سے وفا کی ہے امید  
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا  
جان تمہرے نثار کرتا ہوں  
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب

آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟  
یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟  
کاش پوچھو کہ مہر کا کیا ہے؟  
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟  
غمزہ و عشوہ وادا کیا ہے؟  
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟  
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟  
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟  
اور درویش کی صدا کیا ہے؟  
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟  
مفت ہاتھ آئے تو بڑا کیا ہے؟

کی دعا تم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں  
آج ہم اپنی ہریشانی خاطر ان سے  
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو  
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں  
کہنے جاتے تو ہیں ہر دیکھتے کیا کہتے ہیں  
جوئے و نغمہ کو اندر رہا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو حضرت عائشہ سے  
 ہے پرے سے جہ اور اک سے اپنا سجود  
 دیکھ لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ  
 وحشت و شہید قتلہ اب مرثیہ کہیں شاید  
 اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں  
 قبیلہ کو اہل نظر قبیلہ نما کہتے ہیں  
 اس کی ہر بات پر ہم نام خدا کہتے ہیں  
 مرگیا غالب تم شفقتہ نوا کہتے ہیں

## میر بر علی اٹیس پیدائش فیض آباد سنہ ۱۲۱۷ھ وفات لکھنؤ سنہ ۱۲۸۷ھ

میر سخن حبیب کے بیٹے اور میر حسن دہلوی کے پوتے تھے۔ لکھنؤ میں تربیت پائی  
 اور ضروریات فن سے آگاہی حاصل کی۔ اپنے خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد تھے۔  
 ابتدا میں انھیں غزل کا بھی شوق تھا۔ ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے۔  
 اور غزل پڑھی۔ وہاں بڑی ترین ہوئی۔ شفیق باپ یہ خبر سنا کہ دل میں تو باغ  
 باغ ہوا۔ مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کو کہاں گئے تھے؟ انھوں نے حال  
 بیان کیا۔ غزل سنی۔ اور فرمایا کہ بھائی! اب اس غزل کو سلام کرو۔ اور  
 اس شخص میں زور طبع صرف کرو۔ جو دین و دنیا کا سراپہ ہیں۔ سعادت مند بیٹے  
 تھے اسی دین اُدھر سے قطع نظر کی۔ غزل نیکو کی طرح میں سلام لکھا۔ دنیا کو چھوڑ کر  
 دین کے دائرہ میں آگئے اور تمام عمر اسی میں صرف کردی۔ نیک بیٹی کی برکت سے  
 اسی میں دین بھی دیا۔ اور دنیا بھی۔

ان کی بلکہ ان کے گھر ان کی زبان اردو سے سنائی کے چھاننا سے تمام لکھنؤ میں  
 سند تھی۔ حسن بیان لطف محاورہ۔ کلام کی صفائی اس درجہ ہے کہ کسی دوست  
 کو نصیب نہیں۔ انھوں نے ایک مضامین کے دریا بہا دئے ایک مقرر کی مضمون  
 کو سیکڑوں نہیں۔ ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ گھوڑا نیا۔  
 انداز نیا۔ مقابلہ نیا۔ اور اس پر کیا منحصر ہے۔ صبح کا عالم دیکھو۔ تو سبحان اللہ۔ رات



کی رخصت۔ سیاہی کا پھٹنا۔ نور کا ظہور۔ آفتاب کا طلوع۔ مرغزار کی بہار۔  
شام ہے۔ تو شام غرباں کی آداسی۔ کبھی رات کا سناٹا۔ کبھی تاروں کی چھانٹا  
کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگا رنگ سے دکھانا۔ غرض جس حالت کو یا  
ہے۔ اس کا سماں بانٹ دیا ہے۔

سنہ ولادت کا کسی تذکرہ سے پتہ نہیں چلتا۔ مگر یہ معلوم ہے کہ تقریباً ۷۷ برس کی  
عمر پائی۔ اور ۲۹۔ شوال ۱۲۹۸ھ بروز جمعہ اس جہان فانی سے آپ نے رحلت کی۔

## مناجات

یا رب! چین نظم کو گلزارِ ارم کر  
تو فیض کا مبداء ہے تو بحر کوئی دم کر  
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے  
اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری  
ہر شے پر دم نہ دے یا حضرت باری  
وہ گل ہوں عنایت چین طبع نکو کو  
خواص طبیعت کو عطا کر وہ لالی  
ایک ایک لڑی نظم نرپا سے ہو عالی  
سب ہوں درمیکتا نہ علاقہ ہو کسی سے  
بھروسے درمقصود سے اس درج وہاں کو  
آگاہ کہ اندازِ تکلم سے زبان کو  
تحسین کا سموٹا سے غل تا بہ شک ہو  
تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں  
دورہ کی چمک مہر منور سے ملا دوں

اے ابر کرم! خشک زراعت پہ کرم کر!  
گننام کو اعجازِ ہیلوں میں رقم کر!  
اقلیم سخن میری قلمرو سے نہ جائے  
بلبل کی زبان پر ہے تری شکر گزاری  
پھل ہلو بھی مل جائے ریا صحت کا ہماری  
بلبل نے بھی شوگھا ہو نہ جن چھو کو گی ہو کو  
ہو جن کی جگہ تاج سرِ عرش پہ خالی  
عالم کی نگاہوں سے گرے قطبِ شمالی  
نذر آئے یہ ہو گئے جنھیں رشتہ بنی سے  
دربارے معافی سے بڑھا طبع رواں کو  
عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے سخنِ بیاں کو  
ہر گوش بنے کانِ ملاحظہ وہ ناک ہو  
قطرے کو جو دلِ آب تو گو ہر سے ملا دوں  
خاروں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں

گلارستہ معنی کوئٹہ و تنگ سے بانہ معلوم  
 گرم کی جانب ہو تو جسے دم تحریر  
 دیکھئے نہ کبھی صحبت انجم فلک پیر  
 دیوں تخت حسینان معانی اثر آئے  
 ساقی کے کرم سے ہو وہ دور اور جلیں جام  
 ہرست فراموش کرے گردش انعام  
 ہاں بادہ کشو اپوچھ پوچھ نہ نشیں سے  
 اوں طرف رزم بھی چھوڑ کے جب رزم  
 قطع سزا خدا کا ارادہ ہو جو با مجرم  
 جل جائیں عداوگ بھر کئی نظر آئے  
 مصرع ہوں صفا آرا صفت لشکر جزا  
 نقطے ہوں جو ڈھالیں تو الف خنجر خونخوار  
 غل ہو کبھی یوں فوج کو رٹے نہیں دیکھا  
 ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکن ماہی  
 جزا کا دھنی تو ہے یہ چلا میں سیاہی  
 ہر دم یہ اشارہ ہو وفات اور ظلم کا

اک بچوں کا مضمون ہو تو نورنگی سے بانہ معلوم  
 کھینچ جائے ابھی لکاشن فردوس کی تصویر  
 ہو جائے ہو بزم سلیمان کی بھی توقیر  
 ہر چشم کو پر یوں کا اکھاڑا نظر آئے  
 جس میں عوہل نشہ ہو کیفیت انجام  
 صوفی کی ذباں بھی نہ رہے فیض سے ناکام  
 کوثر کی یہ موت آنکھی ہے خلد یہیں سے  
 خیر کی خبر لائے مری طبع الوا العزم  
 دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکہ رزم  
 تلوار پہ تلوار پگھلتی نظر آئے  
 الفاظ کی تیزی کو نہ پہنچے کوئی تلوار  
 ہر آگے بڑھیں برہمچوں کو تول کے کیا بار  
 مفلس میں زن ایسا کبھی پڑے نہیں دیکھا  
 عالم کو دکھا دے ہر شے سیف الہی  
 لاریب تر سے نام پہ ہے سیکھ شاہی  
 تو مالک و مختار ہے اس طبل و حکم کا

## مناظر قدرت

عربی اور فارسی میں مناظر قدرت پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اور اردو میں تو گویا  
 سرے سے اس کا وجود ہی نہ تھا۔ میر تقی میر نے سب سے پہلے اس پر طبع آزمائی کی  
 لیکن وہ مضمون ہندی اور استعارات کو کلام کا اصلی جوہر سمجھتے تھے۔ اس لئے  
 اصلی حالت کو نہ ادا کر سکے۔ میر تقی میر نے اس صفت پر اگرچہ دو تین مٹی

لکھے ہیں۔ لیکن جو کچھ لکھا ہے۔ کمال کے درجہ پر پہنچا دیا ہے۔

## صبح کا سماں

ہونے لگا افق سے ہویا نشان صبح  
ہر سو ہوئی بلند سدا ہے اذان صبح  
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا  
در کھل گیا سحر کا ہوا بند باب شب  
دفتر کشائے صبح نے آئنی کتاب شب  
سلطان غیب و شرق کا نظم و نسق ہوا  
پہن لے چین سے بھولوں کو جس طرح باغیاں  
مرجھا کے رہ گئے مٹ و شاخ ککشاں  
پڑ مردہ ہو سکے رہ گئے خنجرِ نجوم کے  
یا و خدا میں زمزمہ پر وادی طیور  
ننگی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو مرد  
جاری تھا ذکر قدرت حق ہر زبان پر  
وہ بارور و زرخیز وہ صحرا وہ سبزہ زار  
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامن کو ہمار  
آتے تھے سر و سر و سر وہ جھوٹے نیچم کے  
نظا و نور و در تک شب محتاب کا سماں  
مہر فرات بیچ میں تھی مشعل ککشاں  
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

طے کر چکا جو منزل شب کا روان صبح  
کردوں سے کوچ کرنے لگے اختران صبح  
پہناں نظر سے روتے شب تار ہو گیا  
خورشید نے جو رخ سے اٹھائی نقاب شب  
انجم کی فرد فرد سے لیکر حساب شب  
گردوں پر رنگ چہرہ محتاب حق ہوا  
یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے عیاں  
آئی ہمار میں گلِ محتاب پر خزاں  
دیکھلائے طور بادِ سحر نے ستوم کے  
چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور  
وہ رونی اور وہ سر ہوا وہ فضا وہ نور  
الساں زمیں پہ چھو ملک آسمان پر  
وہ سحر حق شفق کی آدھر چرخ پر ہمار  
شبنم کے وہ گلوں پہ گھر لے آبدار  
ناتے تھے ہوئے وہ گلوں کے چشم کے  
نقص و شست کہ بلا کی زمیں رشک آسماں  
چھٹکے ہوئے ستاروں کا دروں پہ تھا گماں  
سر سبز جو درخت تھا وہ نخل طور تھا

## ایضاً

چھو لاشفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح  
 کرنے لگا فلک زرا بچم نشاۃ صبح  
 تھا چرخ اختری پہ یہ رنگ آفتاب کا  
 چلتا وہ باد صبح کے جھوکوں کا دمدم  
 وہ آب و تاب بہر وہ موجوں کا پیچ و خم  
 کھا کھا کے اوس اور بھی بہرہ ہر لہو  
 وہ نور صبح اور وہ صحرانہ سبزه زار  
 چلتا لہو صبح کا رزہ زہ سکے بار بار  
 دانستے در یکے بارے بہشت نعیم کے  
 آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سسکاں  
 ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں  
 ہر غلے پہ ضیاء سے سرگودہ طور تھی  
 وہ بچوں کی شفقت کا وہ دینا سے لہجہ زور  
 کتنی کتنی چھو نکات کرتا دم اپنا ہوا سے سرد  
 وصوتا تھا دل کے داغ چن لالہ زار کا

گلزار شب خزاں ہوا آئی ہزار صبح  
 سرگرم ذکر حق ہوسے طاعت گزار صبح  
 کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا  
 مرغاب بارغ کی وہ خوش الحانیساں ہم  
 سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم  
 تھا تھوڑیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا  
 تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار  
 گو گو وہ قہقروں کی وہ طاؤس کی چکار  
 ہر سرداں تھے دشت میں چھوٹے شیم کے  
 تھا جس کی ضو سے وچہیں طاؤس آسماں  
 تھر تھرتیج میں تھی شہل کھکشاں  
 گویا فلک سے بارش باران نذر تھی  
 محفل سی وہ گیہ وہ گل سبز و نیل و زرد  
 یہ خون تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد  
 سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ چھار کا

## گرمی کا سماں

گرمی کا سماں شعراے فارسی نے باندھا ہے۔ لیکن نہایت مبالغہ اور دُوراز کار  
 خیالات سے کام لیا ہے۔ میر انیس بھی اگرچہ رواج عام کے اثر سے۔ نیچرل  
 حالت سے۔ جا بجا تجاوز کر گئے ہیں۔ تاہم ان کا اصل جوہر بھی نمایاں ہے۔

وہ نوب - وہ آفتاب کی جڑت وہ تاب و تب  
 خود نہ غلامی کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب  
 اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا  
 آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور  
 مردم تھے شہادت پردوں کے اندر عرق میں تر  
 سگرہ کھجور سے نکل کے ٹھہر جاتے راہ میں  
 موسوں کی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار  
 ہنسنا تھا کوئی گل نہ لکھتا تھا سبزہ دار  
 گرمی نہ تھی کہ زیت سے دل سے کھیر تھے  
 شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کھجور سے  
 آئینہ ہر کا تھا مگر خبر سے  
 گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر  
 گرداب پر تھا شعلہ جوالہ کا گماں  
 منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں  
 پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی  
 آئینہ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب  
 سب سے سوا تھا گرم مزابوں کو اضطراب  
 بھڑکی تھی آگ گنبد جرجر اشریں

منظر

کسی خاص واقعہ یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچنا۔ جس کو انگریزی میں  
 سیلین کہتے ہیں۔ واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے۔ عام واقعہ نگاری اور بہن ہیں

یہ فرق ہے کہ واقعہ نگاری میں ہر واقعہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ بخلاف اُس کے  
میں اُس کیفیت کا نام ہے۔ جو متعدد واقعات یا واقعہ کے متعدد جزئیات کے مجموعہ  
سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اس شعر میں ۵

”کوں جلتی ہے۔ خاک اڑتی ہے۔ بے نگر کا ہنگام تنہا یہ چلی آتی ہے۔ اُٹدی سببہ شام“  
لوں کا چلنا۔ خاک کا اڑنا۔ نگر کا وقت ہونا۔ فوجوں کا امنڈنا۔ ہر چیز کو الگ الگ  
لیا جائے تو واقعہ ہے۔ اور ان سب کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو سینہ ہے۔  
میسر اٹلیس نے شاعری کی اس صنف کو جس کو کمال تک پہنچایا۔ اردو سیکھاؤ  
فارسی میں بھی اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ ہم چند مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں

## گر می کی شدت میں لوگوں کی حالت

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت  
وہ بے ہوئے پسینوں میں تپتی غازیوں کے رخت  
راکب عبا بیتن چادر سے چہرے پہ ڈاکے ہیں  
وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرنا نہیں سفر  
رکچ و مسافرت میں ہیں سلطان بحسرو پر  
آتی ہے خاک اڑ کے عین و سیار سے

پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایہ درخت  
سونا گئے ہیں رنگ بھو انانیک نیک سخت  
توٹے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں  
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر  
لب برگہ گئی سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر  
گیسوئے مشک بار اٹے ہیں غبار سے

## فوجوں کی آمد اور جنگ کی تیاری

ہے شور آمد آمد فوج فلک سریر  
دعوت کے واسطے ہیں سنانیں لئے شہریر  
پانی پہ چوکیاں ستم آرا بٹھاتے ہیں  
تیغیں سلاح خانہ سے نکلی ہیں بے شمار

فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہے پہرہ  
حضرت کے پیشکش کو کمان ہیں اور تیر  
دریا کے گھاٹ بھجپوں سے رکتے جاتے ہیں  
ہے جا بجا درستجا اسباب کارزار

ہوتے ہیں لیس تیروں کے دستے کمی ہزار  
نکویں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر  
نخچر ہوئے ہیں ذبح کو پیاسوں کے آبدار  
پھل برچھپوں پہ چڑھتے ہیں پرچم نشان پر

## گرمی کی شدت

مخفی تھے شر شدت گرما سے جس میں  
بکریں راحت تھی کسی دل کو نہ میں  
چلتی تھی یہ لوں آگ بھڑکتی تھی جگر میں  
جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ سہتہ تھیں  
پایا ہاتھ گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے  
سٹوئیں بھی نہ آتی تھیں کنوئیں ٹھکاپہ تھے

## گرمی سے بچنے کی تدبیریں

بھڑتا تھا دم سرد پریشاں کوئی ہو کے  
بچتا تھا کوئی لوں سے روا چہ پہ رو کے  
دامن سے ہوا دیتا تھا منہ کو کوئی دھوکے  
رکھ لینا تھا سر پہ کوئی زوال بھوکے  
ہڑتی تھیں جو چھینٹیں نومزاد تھاپانی  
جھک کر کوئی چلو ہی سہی لیتا تھا پانی

## فوجوں کا داخلہ اور تیاری جنگ

خیمہ میں اترے یاں تو شہر عرش بارگاہ  
موسوں کلم کیلے تھے جدھر کیجئے نگاہ  
آم کے آس طرف بھی اترنے لگی سپاہ  
یاں تاک کہ بند ہو گئی چاروں طرف سے راہ  
فوجوں سے تیار صبح زمین دن کی بھر گئی  
اس کشت سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم  
اکثر ہیں یکہ نماز جو امان شام و روم  
اب کل سے بدو بہت لڑائی کا ہو گیا  
یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشان  
مٹاڑ میں یہ نظم کا دریا سے بیکراں

موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش ہیں روں  
 ہلتا تھا دشت کیں۔ دُہل اُٹھ بچتے تھے  
 جنگی وہ مریوں کے پرے شامیوں کے کوں  
 مکار و اہل ناز و دغا باز پُر و غل  
 بدخواہ خاندان رسالت پناہ تھے  
 تلواریں کھینچے بڑھ کے جے دو طرف سوار  
 دُکھ کی دہم دم تھی جدا آسمان کے پار  
 گھوڑوں کے گرد پیش رُسیان شام تھے  
 لہراتے تھے ہوا سے علم مثل باد باں  
 باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گر جتے تھے  
 خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشہٴ اُجس  
 فکلیں مہیب دیو سے قدر توں پہل  
 ایسے چلے ہوئے تھے کہ چہرے پیاد تھے  
 نقل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار  
 آگے بڑھے چلو یہ نقیبوں کی کتنی چکار  
 زریں کمر بولیں کئی سو غلام تھے

### رزمیہ

رزمیہ شاعری اگرچہ واقعہ نگاری ہی کی ایک قسم ہے۔ لیکن وسعت اور ہمت  
 کے لحاظ سے اس کے لئے جدا عنوان قائم کیا گیا۔ اردو بلکہ عربی میں بھی رزمیہ شاعری  
 کو چنداں ترقی نہیں ہوئی۔ اردو میں میر تقی میر کے چند اشعار  
 ہیں۔ جو نفل اور سیلی کے قبیلہ کی لڑائی کے موقع پر لکھے ہیں۔ مرثیہ ہیں  
 میر تقی میر نے رزمیہ کی ابتدا کی۔ لیکن وہ بالکل نقشِ اُویں تھا۔ میر تقی  
 نے جس طرح اس صنف کو کمال کے درجہ تک پہنچایا۔ اس کے لحاظ سے اردو  
 شاعری کو فارسی کے برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ لیکن عربی سے کسی طرح چھپنے  
 رزمیہ شاعری کا کمال امورِ ذیل پر موقوف ہے۔ سب سے پہلے لڑائی کی تیاری  
 معرکہ کا نورِ شہر۔ تلاطم۔ ہنگامہ بخیزی۔ ہل چل۔ شور و غل۔ نقاروں کی گونج  
 ٹاپوں کی آواز۔ ہتھیاروں کی جھنجھار۔ تلواروں کی چمک دک۔ تیروں کی چمک  
 کمانوں کا سڑکنا۔ نقیبوں کا گرجنا۔ زن چڑوں کا اس طرح بیان کیا جائے  
 کہ آنکھوں کے سامنے معرکہ جنگ کا سماں چھا جائے پھر بہادروں کی میلان  
 جنگ میں جانا۔ مبارز طلب ہونا۔ باہم معرکہ آزمائی کرنا۔ لڑائی کے وافیوں کے



بیچ دکھانا۔ ان سب کا بیان کیا جائے۔ اس کے ساتھ اعلیٰ جنگ اور دیگر  
 سامان جنگ کی الگ الگ تصویف بھی جائے۔ پھر فتح یا شکست کا بیان کیا جائے  
 اور اس طرح کیا جائے۔ کہ دل ڈہل جائیں۔ یا طبیعتوں پر اداسی یا غم کا عالم  
 بچھا جائے۔ میرا بیس میں یہ سب باتیں پائی جاتی ہیں۔

## ہنگامہ جنگ

نقادہ دغا پہ لگی چوب یک بیک  
 شہر کی صدا سے ہر سال ہوسے ملک  
 شور و بل سے حشر تھا افلاک کے تلے  
 گھوڑوں سے گونجتا تھا وہ سب داوی بند  
 تھا چرخ چار میں پہ ترخ آفتاب زرد  
 گرمی ہجوم فوج سے وہ چند ہو گئی  
 کانپے طبق زمین کے ہلا چرخ لاہورد  
 اٹھ کر زمین سے بیٹھ گئی زلزلہ میں گرد  
 گرمی سے زن کی ہوش اڑے دھڑکے  
 اندر سے زلزلہ کہ لرزے تھے دشت و در  
 جہاں کانپ کانپ کے کہتے تھے ”اخذہ“  
 ”اندھیر ہے اٹھی برکت اب جہان سے  
 تھرا رہا تھا خوف سے میناے لاہورد  
 تھکان بھی زرد۔ دھوپ بھی زرد اور زمین بھی  
 اک تیرگی غبار سے تھی چشم مر میں

اٹھا غریب کوس کہ ہلے لگا فلک  
 قرنا چھٹکی کہ گونج اٹھا دشت و در تک  
 مڑے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے  
 گردوں میں مثل شیشہ ساعت بھری تھی گرد  
 ڈرتھا گرے زمین پہ میناے لاہورد  
 خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی  
 مانند کھر با ہوا مٹی کا رنگ زرد  
 تینوں کی آجج ویکھ کے بھاگی ہولے سرو  
 شیر اس طاق اتر گئے دبا کوہ کے  
 جنگل میں پھٹے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور  
 دنیا میں خاک اڑی ہے اب جائیں ہم کھر  
 ٹول گیا زمین کا طبق آسمان سے  
 ہلے تھے کوہ۔ کانپتا تھا داوی بند  
 خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کر بلا میں گرد  
 ٹاپو پڑے ہوئے تھے حیطہ سپر میں

## فوج کی تیاری اور سامان

تھے بچھڑیوں کے صورت مراض بھل پہ بھل  
وہ گرز جن کے ڈرے گرسے دیونھ کے بھل  
حلقوں پہ تھے چھپے ہوئے حلقے کند کے  
کر ہو گئے تھے شور سے کر دیوں کے گوش  
نیزے ہلاکے مکھلے سماران ورع پلوش  
صحرائیں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے  
نیزہ پہ نیزہ تیغ پہ سے تیغ آبدار  
ہر صف میں ہے سپر پہ سپر مثل لالہ زار  
گوشوں سے ہیں کمانوں کے گوشے پلے ہوئے  
تو کہیں وہ نیزہ ہیں کہ دلوں میں چمکتی ہیں  
نرکش کھیلے ہوئے ہیں کمانیں کر دکاتی ہیں  
تیغوں کے ساتھ گرز گراں سر اٹھاتے ہیں

اندھی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل  
خبر وہ جن کی آب میں تھی تلخی اجسل  
دو دو تہ تھے پاس ہر اک خود پسند کے  
وہ دھوم طبل جنگ کی وہ بوق کا خروش  
تھرائی یوں نہیں کہ اڑے آسمان کے ہوش  
ڈھالیں بھیں یوں سروں پہ واران شوم  
حد سے فردوں سے کثرت اخراج تابکار  
ہر سمت ہے سناں پہ سناں مثل کارزار  
پر کیاں ہم ہیں جیسے ہوں کل بے کھیلے ہوئے  
ہر صف میں بر چھپا ہوا کھی ہزاروں چمکتی ہیں  
نیزے تلے ہوئے ہیں سناں چمکتی ہیں  
سنگیں دلوں نے ہاتھوں میں پھراٹھائیں

## دو حرفیوں کی معرکہ آرائی اور فنون جنگ

چمکی آئی تو برق پیکاری کہہ الامان  
ڈانڈ آئی ڈانڈ ہر نو سناں سے لڑی سناں  
غل تھا کہ اڑوے سے وہ غنی لپٹ گیا  
قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر  
جھٹکا دیا کہ جھٹکا گئی گھوڑے کی بھی کمر

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزہ کو دی نکال  
راک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ”ہاں“  
بل کیا کہہ کہ زور ہی مووی کا گھٹ گیا  
جھٹلا کے چوہ نیزہ کو لایا وہ منسرق پر  
دو آنکھوں میں میں نیسندہ دشمن کو ختم کر

وٹوانگیوں سے کام لیا ذوالفقار کا  
قبضہ میں لی کہا نی لحد غضب  
یہ تو چڑھائے قاسم نوشاہ نے بھی تب  
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلے اتر گیا

یزہ بھی رب کے ٹوٹ گیا نابکار کا  
سنبھلا وہ بے شعوریہ جھٹکا اٹھا کے جب  
چلے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب  
تیر نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا

## گھوڑے کی تعریف

نعل اس کی ماہ نو ہیں تو ستم رشک آفتاب  
سرعت میں برق - گرم روانی میں جو ہے آب  
اک شور تھا قدم نہیں دریا کی منج ہے  
گردوں مسیر - باد پہ ہمایا - ڈ - برق دو  
دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اُس سے نہ جو  
سرعت میں کچھ کی تھی نہ پھل بل میں فرق تھا  
چالاک فہم و فکر سے - ذہن رسا سے تیز  
جائے میں اڑ کے ہر ہر شہر صبا سے تیز  
رہوار کیا ہوا پہ سلیماں کا تخت تھا  
چمکا - پھرا - جمال دکھا یا - ٹھہر گیا  
برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا  
ضرورت تھی نعل کی کہ سرودی کا وار تھا  
سرعت بلائیں لیتی تھی جھجھجھ جھوم کے  
نعل تھا یہ غول میں ہر سر سجد شوم کے  
یہ شوخیان تو مالیت آیام ہیں نہیں

لکھتا ہے ادب قلم اب سرعت عقاب  
پستی میں سیل ہے تو بلندی میں ہے سحاب  
اڑنے میں اُس غزل کو پرندوں پر اوج چا  
نازک مزاج - شیرین اندام - تیز رو  
اُس کا ناک قدم نہ زخمدیں ہرن کی سنو  
زخما میں ہوا تھا - اشارے میں برق تھا  
ضرر سے تند - بوسے شک زو - ہوا سے تیز  
طاؤس و کبک و نسرو عقاب و ہما سے تیز  
وی جاہ تھا - سعید تھا - فیروز بھی تھا  
سرتا - جما - اڑا - ادمر آیا - ادمر گیا  
تیروں سے اڑ کے برجھپوں میں بے خطر گیا  
گھوڑوں کا تان بھی ناپ سے اسکی دکا تھا  
پھرتا تھا کیا حقوں میں فرس جھوم جھوم کے  
پامال تھے پرے سپہ شام و روم کے  
سرنش ایسا روم و رے میں نہیں شام نہیں

سناچے ہیں تھے ڈھلے ہوئے سب اسکے جوڑ بند  
نازک مزاج و شوخ و سپہ چشم و سر بلند  
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا  
کبکب دری تھل - دلی طاؤس پاٹھال  
راک ڈو قدم میں بھول گئے چوڑی نرال  
چھل کل غضب کے تھے کہ چھلا وہ بھی گرد تھا  
آیا عرق - تو اب رہا رہا رہا رہا رہا  
نقطہ کبھی بنا - کبھی پکار بن گیا  
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا چھوڑ چھوڑ

## تحریف

خالی کئے پرے تو صفیں خوں میں پھر گئی  
ندی غضب کی تھی - کہ چڑھی اور اتر گئی  
ایسا توڑ و نیل میں بھی جذر و دہنیں  
کٹ کر کسی کی تیغ کسی کی سپر گری  
سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی - ادھر گری  
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہوئیں  
بہتی ہے جبکی آگ سے کوسوں لہو کی تہ  
اتری گئے سے چڑھ گیا سارے بدن میں مار  
جو ہر نہیں ہیں تیغ میں دندان مار ہیں  
چمکی آحد میں - خیر و خندق میں - پد ہیں

وہ جنت و خیر و سرعت و چالاکي سمند  
ستم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند  
گر ہل گئی ہو اسے ذرا باگ اڑ گیا  
آہو کی جست - شیر کی آمد - پری کی چال  
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال  
جو آ گیا قدم کے تلے گرد و برد تھا  
بجلی کبھی بنا - کبھی رہو رہا رہا رہا  
کہہ تلب - گاہ گنبد و دار بن گیا  
جبرائیل تھے اسکی گشت پہ لوگ اس جو کم

## تلوار کی

چمکی - گری - اٹھی - ادھر آئی - ادھر گئی  
کاٹے کبھی قدم - کبھی بالائے سر گئی  
فل رن میں تھامیہ کیا ہے جو تھامیں  
بجلی گری - کہ فوج پہ تیغ و دسر گری  
چمکی کبھی خاک پہ کبھی فرق پہ رگری  
زرہیں تنوں میں مثل کفن چاک ہوئیں  
اک شور تھا کہ "تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر؟  
ناگن ہے یہ کہ کاٹے کی جسکے نہیں پہ لہر  
زخموں سے جسم - ڈرے کیجے فگار ہیں  
یکتا برش میں - جو ہر ذاتی میں قدر میں

تیزی وہی تھی سانس کی۔ اس آئینہ و غریب  
 چھٹے ہوئے سپر سے تیار کیا ڈھنگ تھا  
 غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی یہ گری  
 ”ترکش کٹا۔ کمان کیانی۔ زرہ گری  
 آئی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح  
 سر توڑتے تھے برجھوں والوں کے ہر طرف  
 پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف  
 خاطر نشان نہ تھی کسی آفت نشان کی  
 کیا کیا چمک دکھائی تھی سر کاٹ کاٹ کے  
 پانی وہ خود پئے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے  
 کیا جانے ملتا تھا مزا کہا زبان کو؟  
 ہر باتھ میں آڑا کے کلائی۔ بکھل گئی  
 کاٹی زرہ۔ دکھا کے صفائی۔ بکھل گئی  
 چار آئینہ کے پار تھی اس آبا و تاب سے  
 کٹ کٹ کے ذوالفقار سے کرتے تھے خاک پر  
 قبضہ سے تیغ۔ بر سے زرہ۔ ہاتھ سے سپر  
 ترکش کہیں پڑے تھے نشان زری ہیں  
 جس صف پہ وار کرتے تھے۔ سلطان بخروبر  
 چھٹی تھیں۔ بھاگی جاتی تھیں۔ گرتے تھے خاک پر  
 پئے تھے قدم۔ گریز کے کوچ بھی بند تھے  
 چپے تھے وہ یوں دیکھ کے اس تیغ کی چمک

بڑھ کر سپر سے سپر میں گئی۔ سر سے صدر میں  
 راکب تھا۔ نہ فرس تھا۔ نہ زین تھا۔ نہ گنا تھا  
 برجھی سے اڑ گئے وہ سناں یہ گرہ گری  
 یہ سر آڑا۔ وہ خود آڑا۔ یہ زرہ گری  
 گرتی ہے برقی قہر الہی اسی طرح  
 ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف  
 پر کالے اڑتے پھرتے تھے ڈھالوں کے ہر طرف  
 انہار تھیں کٹی ہوئی شافیں کمان کی  
 ٹٹنی تھی بس تنوں سے زمیں ہاٹ پاٹ کے  
 دم اور پڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے  
 کھا جاتی تھی ہما کی طرح آستخان کو  
 کوئی دی۔ گری۔ زمیں میں سناں کی بکھل گئی  
 مچھلی تھی اک۔ کہ دام میں آئی۔ بکھل گئی  
 جس طرح برقی گر کے بکھل جاے آپ سے  
 پنچوں سے ہاتھ۔ شانوں سے بازو۔ تنوں سے  
 برجھی سے پھل۔ کمان سے زرہ۔ زین سے سپر  
 پر کال کہیں تھی شست کہیں تھی بری ہیں  
 آڑا تھی کٹ کے ضرورت کا غد ہر اک سپر  
 قبضوں سے تیغیں۔ جسم سے روحیں۔ تیر سے  
 شعلہ وہ تیغ تھی۔ سر اعدا سپر تھے  
 بھاگے شجاع مر سے بس طرح شہرک

اوج سہا سے لرزہ برپا تھا تا سماک  
 ہر شے تھی خوفِ جاں سے خضوع و خشوع میں  
 پچھم وہ تیغ کا تھا۔ وہ کاٹ۔ اور وہ آبِ تاب  
 سیکی تھی اک بری کے شکم پر۔ کہ اُسکی تاب  
 جو ہر سے اُس کا جسم جواہر نگار تھا  
 پیاسی بھی خونِ فوج کی اور آبدار بھی  
 بجلی بھی۔ ابتر بھی۔ خزاں بھی۔ بہار بھی  
 پانی نے اُسکے آگ لگا دی زمانے میں  
 نیزوں کے بند بند قلم۔ برچھیاں و دو نیم  
 چار آئینہ کٹے ہوئے۔ گرد گراں و دو نیم  
 سالم تھا پیش آئینہ تیغ جو نہ تھا  
 وہ تیغ سبب بڑھی صفت کفار ہٹ گئی  
 دم بچھ میں یوں صفوں کو اُلٹ کر پٹ گئی  
 دریا بھی آبِ تیغ سے بے ابرو ہوا

ہلکی وہ جب تو کانپ گئے چرخ پر مک  
 سجدہ میں تھی زمیں۔ تو خاک تھا کروچ میں  
 آنکھ کسی جگہ۔ کہیں بجلی۔ کہیں سحاب  
 تیزی زباں میں وہ۔ کہ فرشتوں کو دے جواب  
 گویا گلے میں خور کے ہیرے کا بار تھا  
 غلّ تھا۔ کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی مار بھی  
 تلوار بھی۔ چھری بھی۔ سپر بھی۔ ٹاٹ بھی  
 اک آفت جہاں تھی لگانے بچھانے میں  
 مثل قلمِ زبان و رازِ سنان و دو نیم  
 مشغفے کے تا کر جند پہلواں و دو نیم  
 لشکر میں کوسا تھا وہ کیتا جو دو نہ تھا  
 چکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سرٹ گئی  
 رن کی زمیں لہو کے ڈریڑوں سے کٹ گئی  
 غلّ تھا کہ تو فرات کا پانی لہو ہوا

## نفرت و دنیا و محبتِ عقیلی

اس منزل فانی میں دل اپنا نہ لگاؤ  
 یہ عار تھی جاہے۔ یہاں محکم نہ بناؤ  
 چلتے ہوئے۔ ہرگز کوئی کام نہ سکے گا  
 یاں رحمتِ اقامت کا نہ انجام ہے بیجا  
 عقیلی کے سوا یاں کا ہر اک کام ہے بیجا

اُلفت نہ کرو اس سے چلے چھوڑ کے جاؤ  
 پا بندی و دنیا سے بس آبِ ہاتھ اٹھاؤ  
 ہمراہ کچھ اسباب جہاں جانے سکے گا  
 اس منزلِ پُرفوت میں آرام ہے بیجا  
 مستند نگینِ آرزوے نام ہے بیجا

سینے میں یہ دم شعل چراغِ شہری ہے  
 آمیز نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام  
 یاں کام کرو ایسا کہ آئے جو وہاں کام  
 انہی نہ کوئی ملک نہ املاک سمجھنا  
 دنیا میں خدا ایک سار ہوتا نہیں احوال  
 اندر دفع کرتے ہیں لگتا ہے سہ و سال  
 خالی رہیں گے بعد فنا ہاتھ تھارے  
 بھائی نہ تو کام نہ بیگا اس وقت نہ فرزند  
 وہ کام کرو جس سے خدا ہو سے رضا مند  
 پیر کی کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے  
 ہیں زیر زمین صاحبِ شخت و علم و تاج  
 جو شاہ کہ شاہوں سے خدا لیتے رہے باج  
 درویش و غنی اسکے ہمیشہ رہے شاک  
 کیا سخت گھڑی ہوگی اجل آئے گی حیدم !  
 کیا دیکھیں گے ایک ایک کو حسرت سے بعد دم !  
 سب کے لئے اک روز یہ تکلیف دہری ہے  
 بھائی نہیں اپنے ہیں ۔ نہیں ہے پیر اپنا  
 زمانہ اسباب نہ زبور نہ زرا اپنا  
 ہر کچھ ساتھ پیچھے کیسی دیاس نہ ہوگا  
 اس نہایت چھوٹو نہ ۔ اجل کو بھی کرو پاؤ  
 دنیا میں عمارت نہ بسا کر ہو کوئی شاد

کر تو عمل خیر ہی ناموری ہے  
 ہستی کو سمجھو کہ ہے خورشیدِ لبِ بام  
 آپہونچے خدا جانے کب موت کا پیغام  
 ہونا ہے تمہیں خاک پہ سب خاک سمجھنا  
 ادوار ہے انسان کا کبھی اور کبھی اقبال  
 آجاتا ہے وہ غیر کے قبضہ میں زرد مال  
 ہر جگہ ہوا ہی کہ چلے ساتھ تھارے  
 عرصہ نہیں گزر جائیگا جب آگہ ہوئی بند  
 ہشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند  
 آرام کہ شاہ و گدا سب کچھ ہے  
 جو صاحبِ نوبت تھے نشان اُنکے نہیں کج  
 وہ بعد فنا آپ کفن کے رہے محتاج  
 بتلاؤ کہ دنیا نے کسی سے بھی وفا کی؟  
 کھینچ کھینچ کے ہر اک رگ سے کھینچے گئے کا دم  
 اتنی بھی زباں مل نہ سکے گی کہ "چلے ہم"  
 پھر بھی یہ غفلت ہے عجب بھڑی ہے  
 بیگانے ہیں سب ہو بیگانا جس دم سفر اپنا  
 دو گز ہے کفن ۔ قبر کا گوشہ ہے گھر اپنا  
 رہ جائیں گے سب وور کوئی پاس نہ ہوگا  
 گھر سیکڑوں یاں سیلِ فنا نے کئے براہ  
 اس قالمِ بھلائی کی عجب حسرت ہے بنیاد

کل اوج پہ جو لوگ تھے وہ دیر نہیں ہیں  
کس کس گل رنگیں کی نہ اس بلغم میں تھی وہ دم  
و کھلا رہی ہے رنگ عجب ہستی موہوم  
اس بلغم میں جس سر کو دیکھا تو رجاں بچا  
و دنیا یہ سدا غیرت و اندیشہ کی جا ہے  
جاتے ہیں چلے مرگ کا دروازہ کھلا ہے  
پہے راہ گری - زاد سفر پاس نہیں ہے  
پہے خال کا ڈھیر اب نہ کمال میں نہیں ہیں  
اک آن میں شبنم کی طرح ہو گئے معبود  
کیا قصد ہے گلچین اجل کا - نہیں معلوم  
جس گل پہ ہمارا آج ہے کل اسپہ خزانہ  
یاں کیسا مقام - آٹھ پہر کو بج لگا ہے  
زہ چاہے نہ کوئی "یہی آواز دراپے  
منزل پہ پہنچنے کی بہر اس نہیں ہے

## مرزا سلامت علی دبیر

خاندانی شاعر تھے - لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے - اس شوق نے میر کی سیرت  
سے مرثیہ گوئی کے عرش الگمال پہ پہنچا دیا - شیر مظفر حسین جتوئی کے شاگرد  
ہوئے - اندر جو کچھ استاد سے پایا - اسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا - بلبلیت  
ادبی گزار پائی تھی - جو اس فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی - ان کی سادگی  
نزدی پہرہزگاری - مسافر لڑائی - سخاوت - لئے صفات کمال کو زیادہ تر کوئی دی -  
تھی - شکریت الفاظ - مضامین کی آہ - جا بجا غم انگیز - اشارے - درو خیز گناہے -  
الم ناکہ اور وگداز انداز - جو مرثیہ کی غرض اصلی ہے - ان وصفوں کے ہاوشاہ ہیں  
۶۹ - محرم ۱۲۹۸ ہجری کو ۷ برس کی عمر میں انتقال کیا - اس مدت میں کم سے کم ۳ ہزار  
مرثیہ لکھا ہوگا - سلاموں اور نوحوں اور رہائیوں کا کچھ شمار نہیں - ان کے ساتھ  
ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا - نہ اب ویسا زمانہ آئے گا - نہ ایسے  
صاحب کمال پیدا ہوں گے -

## صبح کا سماں

پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی  
پنہاں درازی پر طافس شب ہوئی



اور قطع زلف پہلی زہرہ لقب ہوئی  
 فکرِ رونقِ چرخ ہنرمند کے لئے  
 یوسف غریب چاہ سیدہ ناگماں ہوا  
 یونس دہان ماہی شب سے عیاں ہوا  
 فرعون شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب  
 تھی صبح یا فلک کا وہ حبیب و ریدہ تھا؟  
 خورشید تھا کہ عرش کا اشک چکیرہ تھا؟  
 کسے نہ مہر صبح کے سیدہ پر داغ تھا  
 روزِ سفید یوسف آفاق شب نقاب  
 سقاے آسمان نے یہاں دلو آفتاب  
 یوسف کو دلو مہر میں بٹھلا کے چاہ سے  
 نکلا آفتاب سے عابد روشن ضمیر صبح  
 گھولا سفیدی نے جو مٹلاے پیر صبح  
 کرتی تھی شب غروب کا سجدہ و دور کو  
 ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نثر ہو گیا  
 گو یا کہ رنگ آئینہ سے دور ہو گیا  
 کیا پنچہ روشنائی تھی قدرت کے خط میں  
 جو زاعناؤں کے ہوا جولاں جو راہلور  
 ہمارے ہوئے جو حرف چراگاہ ایک بار  
 برباد سہرہ روش کشاں ہوا  
 پامال برج سنبہ آسمان ہوا  
 مجنوں صفت قباے سحر چاک سب ہوئی  
 دن چار کمرے ہو گیا ہیوند کے لئے  
 یعنی غروب ماہ بجلی نشان ہوا  
 یعنی طلوع شیر مشرق نشان ہوا  
 دن تھا کلیم اور پیر بیضا تھا آفتاب  
 یا چہرہ صبح کا رنگ پریدہ تھا؟  
 یا فاطمہ کا نالہ گروں رسیدہ تھا؟  
 آمید اہل بیت کا گھر بے چراغ تھا  
 مغرب کے چاہ میں تھا جودہ زیر آفتاب  
 اور رہیاں شمع کی ماندھی کاپ و تاب  
 کھینچا فوج شرق میں مغرب کی راہ  
 محراب آسمان ہوئی جلوہ پذیر صبح  
 پر سجدہ گاہ بن گیا مہر متیر صبح  
 سہارے ہفت عضو بنے تھے سجدہ کو  
 پھر مشکب شب جہاں سے کافر ہو گیا  
 باطل رسالہ شب و بجور ہو گیا  
 مضمون تھا آفتاب کا ذروں کے لئے میں  
 سہارے بھولے سیر و تماشاے روزگار  
 باقی نہ کمکشاں کی رہی کاہ زینہار  
 برباد سہرہ روش کشاں ہوا  
 پامال برج سنبہ آسمان ہوا

## شمشیر آبدار

شمشیر تھے چار لاکھ کہ کیا شے ہے لالہ! /  
 مشلول کے ہوں پنہ میں جیسے چھ امگیاں /  
 قبروں میں ایک عروس کی گردن پر سر نہ تھا /  
 بڑبڑائی نہی۔ صفائی نہی۔ کچ نہی نہی /  
 کہ زرد۔ کہ سفید۔ ہوا ہر جہ شرمی /  
 ڈوکر تھی اڑی ہوئی رنگت کو گھر /  
 گاہے عبادت پر جمبیل کرتی تھی /  
 بڑبڑ زیادہ چٹنے میں تعبیل کرتی تھی /  
 قلعہ پہرا ختر سے پار ہو گئے /  
 قالب میں تیرتی ہے مگر یہ رنگ ہے /  
 زن کی قسم یہ تیغ بڑی خانہ جنگ ہے /  
 سر پر بھ کے سب سے لڑتی ہے اور بگاہ ہے /  
 طوفان و شہر و قمر و ہلا کیا ہے؟ ہیں ہوں ہیں /  
 راہ عدم۔ دیار فنا کیا ہے؟ ہیں ہوں ہیں /  
 تو بہ کرو تو بھڑ میں میرے پناہ ہے /  
 وال اتفاق تھا کہ یہاں تھی کہیں نہ تھی /  
 لاکھوں کے قتل کر کے کوہاں تھی کہیں نہ تھی /  
 وال تھے جہاں زمین نہ تھی۔ آسمان نہ تھے /  
 قطع نظر بدن سے مگر کونہ تھی پہنشاہ

اللہ سے آمد آمد شمشیر دو زباں! /  
 جوش نہ باکتہ کو تھی نہ تیغوں کے دریاں /  
 ضرب کہ طرف کہ سایہ سے اسکے کفر نہ تھا /  
 اس سے اچھ گئی کبھی اس سے اچھ گئی /  
 اک سر سے لگ چلی۔ تو لگ سم ہوئے کئی /  
 بھاگے ہوؤں کو ضرب پہ لائی تھی گھر /  
 کہ ہڈی صو سسرا خیل کرتی تھی /  
 کہ تیغ مہراہ میں تھیل کرتی تھی /  
 مچو نظارہ عروم نظارہ ہو گئے /  
 ہر شو تھا شور تیغ کا کچھ اور ڈھنگ ہے /  
 داخل میان خانہ دل سے درنگ ہے /  
 حق تو یہ ہے کہ مسئلہ واں تیغ فنا ہے /  
 کہتی تھی بار بار فنا کیا ہے؟ ہیں ہوں ہیں /  
 دوڑخ۔ سقر۔ عناب خدا کیا ہے؟ ہیں ہوں ہیں /  
 حق سے ڈرو تو مردہ فضل اللہ ہے /  
 یاں سب کو تھا یقین کہ وہاں تھی وہیں نہ تھی /  
 ہر جا تھی۔ اور جو چھوٹا کہاں تھی؟ کہیں نہ تھی /  
 اس برق و افکار کے جلوے کہاں تھے؟ /  
 قالب کی یہ لوشن جاں تھی دم نگاہ

دعویٰ کے صدق کے لئے حجت تھی اور گواہ  
 آیا نظر رہتے ہوئے سبب کو  
 دل کر چلی فلک سے۔ تو بجلی جبراً ہوئی  
 پہنگی جو خود سر پہ قیامت بپا ہوئی  
 کھوسے زرہ کے ایک نظر میں ہزار بند  
 بے نام و بے نشان تھا ہر اک پہلوں کا اتم  
 سرائے کی شکل ڈھال خرائی تھی اپنا جہم  
 دل رشتہ رشتہ کر کے زرہ کو اڑا دیا  
 موش زرہ کا تیغ کی گرمی سے ٹھا یہ حال  
 جب یہ کڑی ہوئی تو زرہ ہو گئی ٹھال  
 جی پرہی زرہ کی جو صورت پکڑ گئی

سین لودیل قطعی اگر ہو کچھ اشتباہ  
 تیغ علی سے قطع کیا تھا نہ کچھ کو  
 ترپنی یہ زیر خاک۔ تو مچھلی ہوا ہوئی  
 روشن ہوئی جو سینہ پہ۔ جو سن بپا ہوئی  
 کائے ہزار طرح عناصر کے چار بند  
 تقسیم ضرب سے رہی باقی نہ کوئی قسم  
 یہ تیغ کے ہمرستے کہ جادو تھا یا طلسم  
 طائر کو جال۔ جال کو طائر پنا دیا  
 سسبہم کا جیسے صبح کو نور شید سے زوال  
 تولا وہ پہا عرق شرم کی مثال  
 کہا دن دھاڑے باغیوں پہ آہں لگتی

### گھوڑے کی تشریف

طاؤس فلک سیر دم جلوہ گری تھا  
 صبح سے عیاں تفرقہ کبک وری تھا  
 کاوہ کی ثنا کیجئے دل اس پہ ملا ہے  
 غل تھا کہ چکوروگ کو کھا کر نکل آیا  
 بے روح ہوا دل جو وہ پیکر اجل آیا  
 بے جان جگر و قلب ہم رہ گئے باقی  
 طاؤس اڑا نقش قدم رہ گئے باقی

یونگل میں تو گلشن میں نسیم سحری تھا  
 آہو تھا ہر ندوں میں پرندوں کی پری تھا  
 دریا سے کوئی عقدہ گرداب کھلا ہے  
 مرکب کا جگر پیر کے راکب نکل آیا  
 سینہ کا لہو یہ کے جو گردن میں ٹھل آیا

# مثنوی امیر اللہ تسلیم

پیدائش فیض آباد ۱۸۲۰ء وفات لکھنؤ ۱۸۹۱ء

مولوی عبدالصمد صاحب کے بیٹے۔ اور مرزا اصغر علی خاں تسلیم مولوی کے شاگرد تھے۔ سلسلہ میں ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ اور عربی کی کتب میں اپنے بھائی مولوی عبداللطیف صاحب سے پڑھیں۔ فن خوشنویسی مثنوی عبدالحی صاحب سندھوی سے حاصل کیا۔ کثرت تک آپ کا قیام لکھنؤ میں رہا۔ پھر مثنوی امیر احمد صاحب امیر بنیالی کے توسل سے رام پور تشریف لے گئے۔ وہاں تیس روپے ماہوار اور دوڑو روپے عید کے موقع پر آپ کو ملا کرتے تھے۔ بعد چند سے وہیں ڈپٹی انچیکٹر مدارس وغیرہ کے مختلف عہدوں پر مامور رہے۔ اس وقت تنخواہ پچاس روپیہ تک ہو گئی۔ جب نواب صاحب والی رام پور سفر انگلستان سے واپس تشریف لائے۔ تو ان کا سفر نامہ۔ نظم کر کے پیش کیا۔ اس صلہ میں چالیس روپیہ ماہوار بطور بخشش آپ کے لئے مقرر ہو گئے۔ آخر عمر تک پاسے رہے۔

آپ کے کلام میں فصاحت۔ بلاغت۔ متانت۔ مثنوی کمال درجہ کی ہے۔ قوت تخیلہ بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ دقیق مضامین اس سادگی اور صفائی سے ادا فرماتے ہیں۔ کہ اس کی تحریر نہیں ہو سکتی کلام کا رنگ دہلی کے شعرا کا سا ہے۔ آپ کو اسی طرز پر ناز تھا۔ خود فرماتے ہیں۔

”میں ہوں اے تسلیم شاگرد تسلیم مولوی“  
مجاہد طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض  
مثنوی میں آپ نے اہمیت کے رنگ کی تقلید کی ہے متعدد مثنویاں لکھیں۔ جو لکھنؤ والوں سے بالکل الگ۔ نازہ تسلیم۔ شام غریباں۔ صبح غمناں۔ دل و جان نغمہ مسلسل۔ شوکت شاہجہانی وغیرہ مثنویاں اور نظم اربند۔ نظم دل افروز۔

دفتر خیال - یہ دواہیں یادگار ہیں -

۲۸ مئی ۱۹۱۱ء کو پانچ بجے شام کو ۹۶ برس کی عمر میں کھنڈو میں آپ نے  
اس دارفانی سے رحلت فرمائی۔

## حمد از نالہ سلیم

نفس کا کلب نگین خندہ زن ہے  
اُترتے ہیں مضامین آسمان سے  
بھری ہے بے نیازی ندما میں  
بڑھی ہے ناتھامی گفتگو سے  
خیال آئینہ حیرت فزا ہے  
بنایا جس نے مقتل بوستاں کو  
لکھا ہے صفحہ اوراقِ گل پر  
عطا کی داغ لالہ کو سیاہی  
ہنسی لب پر - جگر میں زخم کاری  
پے نئے توہنی دورِ نفستہ  
شہیدوں کو طلسم نو دکھایا  
رگِ بے لیں کیا تارِ نظر کو  
دل عاشق کو بخشا خاک ہونا  
گھرِ دیزی کہیں کی چشمِ تر سے  
جیا غنچوں کو دی راہِ نہاں کی  
کہیں ہے جلوہ گرِ حسنِ حسیں میں

مبارک باد آغازِ سخن ہے  
عیاں ہے شوکتِ رفتِ بیاں سے  
سیرِ نگین ہے عرضِ التجا میں  
ہر مطلب سوا ہے آرزو سے  
دباں مصروفِ جگر بکریا ہے  
کفِ جلاؤ برگِ ارغواں کو  
شہادتِ نامہ بیلِ سراسر  
سراپا صورتِ مہر گواہی  
دیا نچے کو پاس پرہ داری  
دیا پیمانہ زخمِ شگفتہ  
ہنسا کر زخمِ تن کو خوں رولا یا  
سکھائی رقصِ بیاں جگر کو  
گریباں کو سکھایا چاک ہونا  
بھرے دامن کہیں تختِ جگر سے  
عناول کو ہوسِ بختی فغاں کی  
کہیں ہے خاطر اندوگہیں میں

نہاں و آشکارا جلوہ گر ہے  
غرض ہر رنگ میں نیرنگ امکاں  
شہر کو لاک نے رُو رو کے اکثر  
بھٹلا ہم کیا حقیقت کیا ہماری؟  
مناسب ہے نموشی آشنا ہوں  
زیادہ دہم سے حمد صمد ہے  
دعا مانگیں کریں قصد اور کچھ ہم  
تینا کا ہے خالی دست رنگیں

کہیں نکمت کہیں گلبرگ تر ہے  
ربا حیرت فروش چشم انسان  
کہا ارشاد لا آسختی یہاں پر  
لکھیں حمد و ثناءے ذات باری  
شریک اختصار مدعا ہوں  
خود مجروح تیغ دست رو ہے  
کہیں اجاب "آمین" مل کے باہم  
پنچا دیں خاتم ختم مضامین

### نالہ چند دعاے عاشقانہ

الہی! دے زبان نکستہ دانی!  
اجازت خواہ لطف گفتگو ہے  
نظر لوٹ سخن سے پار سا ہے  
تربیت نالہ بیدا ہوں میں  
دل مشتاق پابند الم ہے  
سحاب آسمان عطا کر چشم گریاں  
برنگ ابر تر رویا کروں میں  
پیش دے نالہ جان حزیں میں  
رہے بیداریوں کا حفظ آداب  
نہ کم ہو التفات بیقراری  
خرابی دوست رکھ ہر دم ہوا جی

دکھا دوں جلوہ سخن معانی  
نموشی بہر نصرت رُو رو ہے  
ابھی ناویدہ سخن مدعا ہے  
شریک صحبت فریاد ہوں میں  
نفس تار کند حبید غم ہے  
مصیبت دادہ ام غوش طوفان  
سکنا داغ جگر دھویا کروں میں  
اثر دے دُور آہ آتشیں میں  
نہوں آنکھیں کبھی مٹت کش خواب  
رہے تازہ خراش دل فکاری  
برنگ برق دے شعلہ مزاجی

نہ کم ہو کوئی دم سامان سودا  
 رہے سر منزل احسان سودا  
 برائے چاک دے دامن اگر دے  
 نہ بہر انتہائے سیم و زر دے  
 رہے دست جنوں ہر لحظہ چالاک  
 کبھی سینہ کبھی دامن رہے چاک  
 ترقی پر رہے شوق اسیری  
 رہے وحشت کو پاس و تنگیری  
 فلک کو لذت ذوق جفا سے  
 ندوں فرحت آقا ضاے بلا سے  
 جہیں سا خدمت پر نغاں میں  
 رہوں جب تک رہوں دیر جہاں میں  
 ٹھہر۔ اے شوق عرض عاشقانہ  
 کماں تک و تنہا لب غم کا قناد  
 سنا۔ دو چار شعر ایسے مہدارا  
 کہ جس سے معرفت کا ہو سیارا  
 جناب کبریا میں رو کے دن رات  
 پرٹھا کر صدقِ دل سے یہ نالچا  
 خدایا مقل کلمک سینہ افکار  
 سیہ رو ہوں۔ سیہ دل ہوں سیکار  
 بسر ہوتی ہے بیجا زندگانی  
 کوئی فعل زبوں ایسا نہیں ہے  
 گذرتی ہے عجب غفلت میں اوقات  
 لحاظ بندگی جاتا رہا ہے  
 گمان و وہم و جان درد آمیز  
 اگر چاہے یہ نفس کفر شیوا  
 پیشیاں۔ ختمہ۔ آوارہ جگر خوں  
 نگاہِ رحم سے فرما اشارہ  
 لب مایوس ہوں خنداں طرب سے  
 تنہاؤں کو دل میں شاد پاؤں  
 سوا تیرے مرا کوئی نہیں ہے  
 غلط بھی آسرا کوئی نہیں ہے  
 رہے سر منزل احسان سودا  
 نہ بہر انتہائے سیم و زر دے  
 کبھی سینہ کبھی دامن رہے چاک  
 رہے وحشت کو پاس و تنگیری  
 ندوں فرحت آقا ضاے بلا سے  
 رہوں جب تک رہوں دیر جہاں میں  
 کماں تک و تنہا لب غم کا قناد  
 کہ جس سے معرفت کا ہو سیارا  
 جناب کبریا میں رو کے دن رات  
 پرٹھا کر صدقِ دل سے یہ نالچا  
 خدایا مقل کلمک سینہ افکار  
 سیہ رو ہوں۔ سیہ دل ہوں سیکار  
 بسر ہوتی ہے بیجا زندگانی  
 کوئی فعل زبوں ایسا نہیں ہے  
 گذرتی ہے عجب غفلت میں اوقات  
 لحاظ بندگی جاتا رہا ہے  
 گمان و وہم و جان درد آمیز  
 اگر چاہے یہ نفس کفر شیوا  
 پیشیاں۔ ختمہ۔ آوارہ جگر خوں  
 نگاہِ رحم سے فرما اشارہ  
 لب مایوس ہوں خنداں طرب سے  
 تنہاؤں کو دل میں شاد پاؤں  
 سوا تیرے مرا کوئی نہیں ہے  
 غلط بھی آسرا کوئی نہیں ہے

کرے رحمت تری گر پردہ داری  
 بہت کچھ آرزو رکھتا ہوں دل میں  
 جو سن لے ایک بھی تو رحم کھا سکے  
 غم ہستی و مرگ و قبر و محشر  
 خلیل آسا جہنم باغ ہو جائے  
 ضعیفی میں شباب آرزو ہو  
 بڑھے ارماں سخی کی جیسی بہت  
 سراپا عید بن جاؤں خوشی سے  
 مبادا تو اگر نامہ دیاں ہو  
 نوید عید ہوں اہل ستم کو  
 زبان دوست و پاسپ دیں گواہی  
 جہنم ہو۔ عذاب آتشیں ہو  
 سسے لکونی نہ فریاد جسے کو  
 عزیز و خویش و احباب و بچانہ  
 نہ سمجھیں انتظار بیکسی کو  
 میں حدیثے اس بلائے ناگہاں میں  
 کہوں اس وقت کس سے پنے جی کی؟  
 دھوا اس کے کہ تو ہی مہرباں ہو  
 پیکاروں اسے خداوند بیگانہ  
 تری رحمت پہ ہم ناز آرزو کو  
 منہا از باب محشر سے بصد ناز

مری بگڑی ہوئی بن جاے ساری  
 ہزاروں گفتگو رکھتا ہوں دل میں  
 مکمل جائیں سب ارماں مدعا کے  
 یہ سب ہوں سینہ مضطر سے باہر  
 کل فردوس دل کا داغ ہو جائے  
 بہار بہشت بہشت رنگ رُو ہو  
 گھٹے غم جس طرح مسمک کی تبت  
 کہوں ہر دم مبارک باد ہی سے  
 ہر اک ذرہ بلا ہے جسم و جان ہو  
 سدا ترسوں پناہ نیم دم کو  
 اٹھاؤں تا ابد ناز شب بھی  
 گرفتار بلا جان حزین ہو  
 نظر آئے نہ جز شعلہ نظر کو  
 کریں پیر ملامت کا نشانہ  
 دکھائیں وردیں یہ اور جی کو  
 مرا ہو کون حامی دو جہاں میں؟  
 کسے پروا ہو میری بیکسی کی؟  
 بڑے کئے سے کئے میں رہاں ہو  
 کرم گستر خطا بخش زمانہ  
 وفا کر وعدہ لا تقطعوا کو  
 بہار کباد آزادی کی آواز



بس اے شہسوار ترک التجار  
بہت کچھ کر چکا فریاد و ماتم  
ٹھوٹی کو بیان بندھا کر  
کہاں تک حسرت افسانہ غم؟

## حمد باری تعالیٰ از شام غریباں

اجازت او خیال قاصد دل!  
طبیعت پھر رو کی کچھ ناز ہے  
کہ آ پہونچا دم تکلیف مشکل  
مغفایں پلٹے ہیں فکر رسائے  
کوئی مطلب مگر آغاز پر ہے  
بنایا جس نے کُن سے دو جہاں کو  
زباں جنبش میں ہے حمد خدا سے  
نہ و غورشید و سایہ کو فلک وار  
کیا پیدا زمین و آسمان کو  
نظر سے چھپ رہا صورت دکھا کے  
بلند و پست سب اس نے بنایا  
جہاں میں اہل بنیش کے عجب کو  
دکھایا رنگ ویرنگ جہاں کا  
وہاں کسی کو شام نہ کسی کو  
مرا و پتی رہی اندوہنا کی  
کسی کو عشق کی لذت عطا کی  
دکھائے جلوہ پاسے حسنِ نو بیاں  
بنایا صورت آئینہ حیراں  
چھپائے سیکڑوں جلوے دکھا کے  
بٹائیں صورتیں کیا کیا بنا کے!  
نہ خافل ہے نہ ہے فرزانہ باقی  
نقار ہن کے پھرتا جا رہا ہے  
تماشا دوست یار خود نما ہے  
کہیں شکوت ہے شانِ انبیا کی  
کہیں ہے تہمتِ اخوانِ یوسف  
کہیں غمت ہے عصمتِ واپانِ یوسف

شرار شعلہ افزا ہے کہیں وہ  
کہیں ہے لٹاس شوقِ دیدار  
کہیں طالب کہیں مطلوب ہے وہ  
سنبھل اے سرخوش پیانہ عشوق  
زیادہ تر نہ دے زحمتِ قلم کو  
کہاں تک ایک سی آہنگ فرماو؟  
لٹک مشتاق ہیں حرفِ دعا کے  
اویس ہوشِ موسے ہے کہیں وہ  
کہیں ہے محرمِ اسرار افکار  
غرض ہر رنگ ہیں کچھ خوب ہے وہ  
خراب یادہ خجائے شوق  
بے وحدت کے بدلے بیخِ دم کو  
بدل آب اور کوئی رنگ فرماو  
ظلم پر بھیج تحفے التجا کے

## انتخاب از کلیات حالی

مناظرۃ واعظ و شاعر

کل چوبیہ نے بستر راحت یہ جا کر دم لیا  
کی نصرت نے وہیں اک بزمِ رنگیں آشکار  
گرم تھا وہاں ہر طرف ہنگامہ بحث و نظر  
شیعہ استدلال میں روشن تھا فانوسِ بیاں  
تھے فراہم جن قدر اس بزم میں اہل کمال  
مولوی کہتے تھے ”غیر از علم دیں سب بیخ ہے“  
صوفی حافی ادھر کچھ کہہ رکھا تھا زرب لب  
شو و فروشی کا غرض تھا ہر طرف باز اگر ہم  
شاعر مشرق بھی ایک سمت خندان زیر لب  
جا کے پہنچا جب وہاں تک دو جہاں ہے سخن  
و نحو فیاضِ بابت اس کو زیبا ہے یہاں  
دل کو اک وقفہ غم دینا سے فرصت کا ملا  
مجلسِ اربابِ معنی جس کو کہنا ہے بجا  
سرخ و گلگونہ حجت سے تھا ہر مدعا  
چار سو ہنگامہ آرا تھی لم و لا کی صفہ  
تھا شوق کا اپنے اپنے فن کے سب کو آدھا  
فلسفی کہتے تھے ”ہر فن کی ہے حکمت پر بنا  
واعظ متعجب اُدھر کچھ کہہ رہا تھا بر ملا  
ساز گونا گوں تھے لیکن ایک تھی سب کی صدا  
سن رہا تھا لافِ اہل فضل اور خاموش تھا  
وقفہ ”مجلس سے اٹھا اور ہوا یوں خود نشا  
جو کوئی تلمیذِ حق تم میں ہو میرے سوا

سچے تفسیر میں ہمارے عرصہ و شت خیال  
 رہ روی میں ہم کو چشم و گوش پر تکبیر نہیں  
 صاف ہوتا ہے کیاں اپنا خاص و خاص خاک سے  
 اتفاقاً اگر کسی کی طرح پر آجائیں ہم  
 خاک کو چنے بریں بریں اگر نہ جس طرح ہم  
 وصف خواہاں ہم سے گریہاں ہاں سالک کیا  
 گر کریں ہم کل ریحوں کی بے وفائی کا کہاں  
 سیکھیں دیں گر خاطر مشتاق کی تصویر پر شوق  
 ہیں ہماری طرح کے ہیرو جواں امید دار  
 گرمی بزم حریفان ہے ہماری ذات سے  
 فکر اپنی لغزش اہل نظر سے پاک ہے  
 کچھ نہیں اپنا ضرر کہ ہو روایت میں خلل  
 دی نہیں گویا شریعت سے یہاں تکلیف کچھ  
 خود ستانی جو کسی کو جز خدا بچھتی نہیں  
 محض اور دشنام کو ملتا ہے یاں رنگ قبول  
 جب ہیہ بالاخانیہ شاعر کی دعا غنائے ہیں  
 شیوہ میرا بوالفطرت اور یہ لاف و گداز  
 اُمت برحق کے عالم میں جواز و سبب خبر  
 کیا ادب جاتا رہا انکا کچھ بھی تجھ کو اسے شبہ  
 کہ نہیں گنتی میں اہل علم کی یہ خاک  
 ہر سخن کا اک جدا ہوتا ہے موقع اور محل

کچھ نہیں معلوم جس کی ابتدا اور انتہا  
 ہیں ہمارے بال و پر اندیشہ فکر رسا  
 پاک ہو جیسے دساؤں سے دل اہل صف  
 خاطر و متن میں اس کا نقش آفت میں بٹھا  
 ماند ہو ورنے کے آگے مہر تاپاں کی جنبہ  
 ہو نہ ہو کہ نہ عجب عشق مجازی سے رہا  
 ہو نہ بیل پھر تین میں رز کے گل پر مبتلا  
 قیس کی کرنی پڑنے لپٹے کو جا کر انتہا  
 اور ہماری ہجو سے تھکاتے ہیں شاہ و گدا  
 بادہ گلگوں کا ہے ہر بات میں اپنی عزا  
 ہم جہاں چلتے ہیں وال مسدود ہے راہ خطا  
 جھوٹ سے ہوتی ہے یاں رونی عبادت کو سوا  
 جو نہیں جائز کسی کو ہے وہ سب ہکھو روا  
 آگے ہو جاتی ہے شاعر کی زباں پر خوشنما  
 گالیاں دے دے کے ہم سنتے ہیں اکثر مزاج  
 مسکرایا اور یہ فرمایا کہ اسے ہڈیاں سرا  
 پیشہ تیرا یا وہ خوانی - اور انسانا و عا  
 وارث علم نبی - قائم مقام انبیاء  
 بر سر مجلس ہے تو جو اس طرح بشکارنا  
 پرستے جاتے نہیں یہ تیرے دعوے ناروا  
 ہزل و سخریت کجا - بزم خرو منداں کجا

علم اور حکمت کے ہوں جس نرم میں دفتر کھلے  
 شعر مستحسن اگر ہوتا تو قرآن میں اُسے  
 نشان میں بالعلم نیزی جس کی آیا ہے صریح  
 چاہئے انھاس اہل الذکر سے ہو مستفید  
 خود ہونے کے علم۔ اور صحبت سے اہل علم کی  
 ہے یہی باعث کہ ہر ایک اچھے ہو تم بے اختیار  
 اس زبان یادہ گو گو اپنی کیا سمجھا ہے تو؟  
 بے حقیقت ہیں تو سارے خیالات بلند  
 ہے جہاں خالص کو تیرے خدمت مشتاطلی  
 بال سے باریک تر معشوق کی تیرے کمر  
 سشش بہت میں تو کہے بریا قیامت مانتا پار  
 تیج چو میں کی ہو کر پیش بیان کرنی چھو  
 ہو جہاں لکھنی چھو اس پتلی کی حسیت وغیر  
 تو ہوا لاج و شتاب میں جس کی سرگرم غلو  
 پرے درجے کا تکرار ہے اگر پھر اسے کو  
 بہمن و جہنمیاں بھارے کس گنتی میں ہیں؟  
 لکھنے کو اک کرہ مستکین کو سارا منزلت  
 فی انشل گر ہو ترا مروج اک برگیا کیسا  
 بادخوایوں سے سوا ہو تجھ کو فکر تہنیت  
 ہند میں غل ڈال دے تو مالہا ہے شوق سے  
 شعر کو الہام سمجھئے گر نصیبوں سے کہی

کہیں نے دی ہے تجھ کو وال اس ہرزہ گوئی کی رضا  
 کیوں خلافت شان ختم المریضیں کہنا خدا؟  
 فخر ہے اس شعر برکت یہ اسے فخر اوروں کا  
 ہو جس کو علم شہادت اور کتاب اللہ کا  
 بھلا گئے ہو جیسے شہید طال ہے ازاں سے بھاگتا  
 جو تمھارے تخت میں آتا ہے سزا اور ناسزا  
 جرم کو جھوٹا ہے اسکا۔ جرم ہے لیکن بڑا  
 باجوہ یہ تو بیہ اثر۔ اور جی ہے تو بے صفا  
 مورت اک پتھر کی ہے وال جو جنت سے سوا  
 رات سے تار یکا تر آج صدم میں دن ترا  
 یار سے اپنے اگر دم بھر کو ہو عاشق جدا  
 ہے تکرار کرتے پتھر اسے تو حق نقصا  
 اک ٹورے میں اُسے پہنچا دے تو فو فی السماء  
 اور آٹما خوہوں پر اُس کی پروہ پڑ گیا  
 جرم کو اُس کے درکار ہاں اور بہمن کو گدا  
 تنگ ہیں ہاتھوں سے جبرے امیا اور اولیا  
 اور کسے اک نعت سنگین کو تو یوسف لقا  
 اس میں ثابت کر کے چھوڑے تو صفات کہہ یا  
 خواب میں سن یا ہے گر تو کوس شادی کی صدا  
 چین میں شہر ہو کر اک شاہد تو خیر کا  
 کان میں پڑ جائے تیرے ایک جھوٹی واہ وا

نہ ہر شاعر میں جکا دین باطل نام ہے  
 سرسبز قول تیرے کچھ میں اور افعال کچھ  
 نشان میں آیا ہے جن کی قول کالا بے لعل  
 ایسے دروازے بہت کم پائیں گے آفاق میں  
 ہے زبان خامہ تیری تالیف فرمان حرص  
 طبع میں حد سے زیادہ جن کی کرتا ہے غلو  
 جیسے دروازوں سے پھرتے ہیں دعا و فکر فقیر  
 ہر دعا میں ہے مقدر شہرہ ان اعظمیٰ  
 بدوہ عرض ہنرمیں مانگتا ہے بھیک تو  
 زہر دل کا جب کہ واعظ نے لیا سارا انگ  
 شہن کے شاعر نے کہا "بہلے خدا کا نذرناں  
 چوٹ بھی تیری سخن پر۔ جا پڑی اخلاق پر  
 خروہ گیری کے لئے حاضر ہے شاعر کا کلام  
 تو اگر معصوم ہو تو کچھ کسی جساتی نہیں  
 کھیلے پھرتے ہیں میدان جہاں میں سب ہنکار  
 حرص و ثروتی جسم میں انسان کے گر جائے خوں  
 میں لے ان آنکھوں سے اسے و انتظار غلطیوں  
 خط ہے اکاٹھ کو۔ کمدوں گرہا مانو نہ تم  
 آپ میں پہنچ دو کرو طاعت و زہد و فرخ  
 میں تباہی آپ کو اچھٹوں کی کیا پہچان ہے  
 بات حق ہو کہ باطل تیری مرضی کے خلاف

ناستی اور صدق سے بڑھکر نہیں کوئی خطا  
 ہے زبان کو ہر افسانہ پر غم۔ اور دل میں لا  
 چشم بدوہ و آپ کے ہاوی ہیں وہ اور مقتدا  
 جس پر صبح و شام تو نے دی نہ ہو جا کر صدا  
 کام بجا کچھ نہیں تیرے مدح و قبح اعلیٰ  
 گالیوں دیتا ہے تو اکثر انہیں گویا بر ملا  
 طبع تو بھی ختم کرتا ہے یونہی دے کر دعا  
 صاف لعنت کا دعا میں تیری آتا ہے عزا  
 گر بھی ہے شاعری تو اس سے بہتر ہے گدا  
 اور نہ کوئی تیرا باقی اس کے ترکش میں رہا  
 ہے زبان تیری دہن میں یا انسان جاں گزا  
 تو نے چاک پیر ہن کو تا جسکر پہنچا دیا  
 اس سے کیا مطلب۔ کہ ہے وہ بندہ حرص و ہوا  
 پھنس رہا ہے در نہ اس پھندے میں شہا و گدا  
 آڑ میں ٹٹی کی لاکھوں اور ہزاروں بر ملا  
 شاعروں سے تیرے چہرے کی دھبہ ہوئی سو  
 جو فروغی کرتے دیکھتے ہیں بہت گندم شہا  
 آپ ہو بہارا اور آوروں کو دیتے ہو دوا  
 خوبیاں سب کچھ سہی پر دل کا مالک ہے خدا  
 جو ہیں خود اچھے وہ آوروں کو نہیں کہتے برا  
 اسے سے غلی اور کچھ تکفیر کا پہلو ملا

قتل انسان پر نہیں ملتی کہیں ایسی سزا  
 پہنچے جس سے ہوگئی کچھ پھر نہیں تو بخشا  
 ایسی آیات اور حدیثوں سے ہے تو جی میں تھا  
 اس چمن کو دیکھنا کوئی نہ پھر پھولا پھولا  
 لوگ ہوں بد راہ اور اُن کے ہو تم رہنا  
 ہیں اطلبنا چاہتے جس طرح امراض اور وبا  
 شوجھتی اکثر نہیں انسان کو اپنی خطا  
 شاعروں کے کذب سے بدتر ہے واعظ کی ریا  
 جھوٹ وہ ہے جو ہو پر دے میں تقدس کے چھپا  
 ایک بھی کی ہے نماز اس شوق سے تو نے ادا  
 ”دین قائم ہے ابھی پارو کرو شکر خدا“  
 مسجدیں بھی تو نے بنوائی ہیں اکثر جا بجا  
 اُس سے وہ چند آپ کے دیوان خانہ میں لگا  
 نیکیاں تیری ہیں جیسی پُر نظر روزِ حسرا  
 جس قدر مانا ہے زید و عمر نے مجھ کو بُرا  
 ورنہ اک منہ بپنچا یہ شایان شانِ انبیا  
 رہے افسوس ہے چا دو ہوا تری جو ہے ادا  
 گاہِ خوروں پر لیجا کر مانگتا ہے رونا  
 آسمان سے لے کے اُترے ہیں ابھی حکم خدا  
 جس نے پوچھا تجھ کو وہ فرسوس میں داخل ہوا  
 فرقہ ناجی ہے ہیں اک پلوہ سے والا ترا

ترک اولے پڑھتی جس قدر کرتا ہے تو  
 ہے فقط دوزخ تیری سرکاریں جنت نہیں  
 عاصیوں کی مغفرت جس سے نکلتی ہے صریح  
 گر خدا بھی واعظوں! ہوتا تمہیں ساختِ گیر  
 گرم بازاری اسی میں اپنی بس سمجھے ہو تم  
 چاہتے ہو ہم یہاں کثرتِ معاصی کی پو نہیں  
 آپ ان بانوں کو اک بہتان سمجھیں گے مگر  
 جو کہوں میں اُس کو باور کر نہیں اس میں خلاف  
 یہ بھی کوئی جھوٹ ہے ہم جس کے خود ہیں متصرف؟  
 دعوتوں میں سچ بتا جس شوق سے جاتا ہے تو  
 یا وہ ہے وہ تیرا کنا دیکھ کر کھانے بیٹھے؟  
 مدرسے کو شمش سے تیری گوئی ہے شہرِ شہر  
 پر یہ حیرت ہے کہ ان کاموں میں جولاکت لگی  
 مجرموں کے جرم شاید ہوں نہ اتنے خوفناک  
 ہے یقین اتنا ہی ہوگا اپنے دل میں تو حقیق  
 کر دیا رسوا تیری تہ و پر سے تزکیہ کو  
 لطف ہے تو دل رہا۔ اور تہ ہے تو دل فریب  
 کہہ سکتے ہیں ڈرا کر چاہتا رشوت سہ ہے تو  
 کو بچتا تمہارے ہے یوں بیٹھ کر گویا کہ آپ  
 ہاتھ میں نیزے ہے گویا تار و جوت کی کلید  
 نیکیاں برباد ہیں ساری بڑی خدمت، بشیر

اپنی اک اُمت الگ سب سے بنائے کے لئے  
 تیرے گھر میں مسلمانوں میں ہے جب تک نزاع  
 جس طرح جھگڑوں کے خواہاں ہیں عدالت میں کیل  
 چاہتا ہے قوم میں جوئی سدا چلتی رہے  
 شاعروں کو بس اسی تمھارے گدا کہتا ہے تو؟  
 کچھ گدا کہنے سے تیرے ہم گدا ہوئے نہیں  
 شاعری پر ہے بڑا یہ طعن حضرت کا کہ ہم  
 طعن کچھ بجا نہیں رکھتے ہیں پر اک غدر ہم  
 سب پر روشن ہے کہ ہم لوگوں کا اپنا پیہ پیہ  
 اپنے اپنے کام اور پیہ میں ہم ہوں پاکہ تم  
 وعظا میں دیتے ہو آخر داستان کی چاٹ تم  
 پیہ میں ہم بجا یونہی کرتے ہیں رنگا میریاں  
 پھول پہل سے سر کو بے ہوا جب پاتے ہیں ہم  
 سون و نسیم و گل ہیں جب و غاپاتے نہیں  
 ہر ہم اس پردے میں خود اپنا دکھاتے ہیں کمال  
 اس سے بڑھ کر جو ہو سکتی ہے کیا انسان کی؟  
 عدل میں لکھتے ہیں ہم تو شیر و ابن عمدا نہیں  
 حاتم وقت انکو کھدائے ہیں جن کا ذیل وجود  
 زیر کی میں ان کو کشتے ہیں از سطر و سہ زماں  
 کشتے ہیں کس شد و بد سے ہم آنکھیں ہزار منز  
 جو نا مانہ خوشامد کرتے ہیں حکما م کی

نعرے ڈالے ہیں دین حق میں تو نے جا بجا  
 اختلاف اُمت کا حق میں تیرے رحمت ہو گیا  
 مانگتا ہے تو یونہی باہم خلوصت کی دعا  
 کشتی اسلام کا پھر کیوں نہ ہو تو نا خدا؟  
 اے اسیرِ دامِ نفس! اے بندہ حرص و ہوا  
 ورنہ ہم بھی یوں کو کھدائے ہیں بعضوں کو گدا  
 حد سے بڑھ جاتے ہیں جب کرتے ہیں بیتِ افغا  
 غور کرنا غدر پر سپہ ششیوہ اہل حفا  
 جیسے تم لوگوں کا پیشہ ہے یہی مکر و ریا  
 کرتے ہیں ہوتا ہے جو کچھ مصلحت کا تقضا  
 راستی سے کام جب چلتا نہیں شیخ کا  
 جب بن ممدی پڑھتی نہیں سادی قبا  
 ایک طرہ اس میں آزادی کا دیتے ہیں لگا  
 وصف رنگ و بو سے ہم دیتے ہیں عیاں کا چھپا  
 ورنہ ایسی بیج ہے جدوج کے حق میں ہنجا  
 لکھتے ہیں اُمت کو بھیرا اور راہزن کو رہنما  
 ایک نگوہ کا حق ہوتا نہیں جن سے ادا  
 اس لئے ہے تاکہ حامل حاکموں کی ہو رضا  
 ہمارے ہیں احمق بناتے ہیں جنہیں صبح و سنا  
 جو نہیں واقف کہ آمد کیا ہے اور ہے شیخ کیا  
 ان کی آزادی پہ ہم کہتے ہیں سوسو مکر جا

اُن میں ثابت کرتے ہیں پھر دی نوح بشر  
 حامی اسلام دیتے ہیں خطاب اُن کو کہ جو  
 باوجود خلق اُن کو کہتے ہیں جنہیں اے و عطا  
 بیچ کی جانی ہے یاں اکثر اسی انداز سے  
 قطبِ دُور اُن ریاکاروں کو ٹھہرتے ہیں ہم  
 اُن فسوں سازوں کو ہم کہتے ہیں دُور اُن زماں  
 آپ چھٹ اِس کو کہتے جو ملیج وہ بے مغز ہے  
 پیچھے اور دیکھتی سخنور نے یہ کی تقریب  
 دل میں واعظ نے پڑھی لا حول اور سمجھا کہ میں  
 بر بظاہر داغ یہ دامن سے دھونے کے لئے  
 پوچھیں باتیں ہنسی کی اب کرو کچھ اور ذکر  
 کہنے فکر شعر کا ہوتا ہے اب بھی اتفاق  
 ہیں ہنسی کی اور باتیں کیجئے انصاف اگر  
 عرض کی شاعر نے ”حضرت کا ہے یہ سچا ن  
 قبلہ ۹ اب وہ دن گئے جو شاعری کی قدر تھی  
 شعر اگر کہتے تو روٹی جا کے کس گھر کھائیے؟  
 اب تو یہ کہتا ہوں شعر و شاعری کو چھوڑ کر  
 اِس گئے گذرے زمانے میں بھی یہ فن شریف  
 اب لوگوں کی تو اِس میں رہیں کرنی ہے محال  
 روز گرسوئے کی چڑیا گوشت ہاتھ آئی نہ آئے  
 کی سخن پر وازنے واعظ سے جب یہ گفتگو

آپ کو کہتے ہیں جو نوح بشر سے ماورائی  
 کرتے ہیں رسوا چلن سے اپنے نام اسلام کا  
 ہم کسی کے کام کا کہتے نہیں اپنے سوا  
 شیخ ہو محدود یا واعظ غنی ہو یا سگدا  
 آپ کو بھی جو سکھائیں مذقوں مکرو و عفا  
 بیٹھ کر نمبر پر جو انکھوں کا کاجل پس اڑا  
 نام اِس کا ملیج ہے تو جو ہے پھر چیز کیا؟  
 اور لگے سب مسکرائے دیکھ کر یہ ماجرا  
 چھپر کر اک بے ادب کو مفت میں رسوا ہوا  
 ہنس کے اک سنجیدگی سے اور تانتا سے کہا  
 ہزل و استہزا زیادہ حد سے ہوتا ہے بُرا  
 آپ نے دیوان مرتب کیوں نہیں اب تک کیا؟  
 ہر غزل میں آپ کے دیوان حافظ کا مزا  
 ورنہ میں کیا اور مرا مجموعہ اشعار کیا؟  
 شاعری اور نکتہ پر دازی میں ہے اب کیا دھڑکا  
 سیکڑوں پھرتے ہیں شاعر تلکدست اور بے نوا  
 وعظ میں شاگرد ہو جاؤں کسی استاد کا  
 کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا  
 ہر ہمیں بھی سیکھنے سے کچھ نہ کچھ آجائے گا  
 ہم گنہگاروں کا بیٹا ایسا نہیں ہے پھر کیا؟  
 قہقہوں سے چار سو مجلس میں اک غل طر کیا



خواب کا سا وہ سماں جتنا رہا سب یک بیک اور دی پہلو سے دل نے کان میں میرے صدا  
ہزل ہو یا جد نصیحت لیجئے ہر بات سے کہہ گئے ہیں اہل دل دُعا کا کدِ رُخِ خدا صفا

## رباعیات

کائنات ہے ہر اک جگر میں اٹکا تیرا حلقہ ہے ہر اک گوش میں اٹکا تیرا  
مانا نہیں جس نے تجکو جانا ہے ضرور جھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ منیاں نے راگ گایا تیرا  
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

بستی سے ہوا سے آتش و آب سے پاں کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ امراض عیاں  
پر تیرے غزانے ہیں ازل سے اب تک گنجینہ غیب میں اُسی طبع نہاں

کیا ہوگی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیادہ؟ دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہوشاد  
پر۔ جو کہ ہیں تجھ سے کو لگائے بیٹھے رہتے ہیں ہر ایک سچ و غم سے آزاد

مکان ہی نہیں کہ ہو بشرِ عیب سے دور پر عیب سے نیچے تا بقدر ضرور  
عیب اپنے گھٹاؤ پر۔ خبردار رہو گھٹنے سے کہیں آن کے نہ بڑھ جائے غرور

دنیا سے دلی کو نقشِ فانی سمجھو رُودادِ جہاں کو اک کمالی سمجھو  
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمرِ حسابِ دانی سمجھو

- ۷  
اے علم! کیا ہے تو نے ملکوں کو نہ سال  
غائب ہوا تو جہاں سے وہاں آیا زوال  
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال
- ۸  
ہیں یار رفیق - پر مصیبت میں نہیں  
ساتھی ہیں عزیز - ایک ذلت میں نہیں  
آس بات کی انسان سے توقع ہے بحث  
جو نوع بشر کی خود جبلت میں نہیں
- ۹  
عشرت کا شرمخ سدا ہوتا ہے  
ہر قسمہ سپاہ مہکا ہوتا ہے  
جس قوم کو عیش و دوست پاتا ہوں میں  
کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے
- ۱۰  
منزل ہے بید - باندھ لو زار و سفسر  
مکناج ہے بحر - رکھو کشتی کی خبر  
گا بک پچو کس ہے - لے چلو مال کھرا  
ہلکا کرو بوجھ - ہے کٹھن راہ گذر
- ۱۱  
اس وقت اب بگاڑ کا ہے سب کے چارہ  
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی  
پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا  
پھر غم نہیں - پھر جائے زمانہ سارا
- ۱۲  
کی طاعت نفس میں بہت عمر بسر  
کیفیت شب اٹھا چکے - اب حالی  
انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر  
مجلس کرو بر خاست - ہوا وقت سحر
- ۱۳  
چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال  
سراپہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی  
مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال  
اندیشہ فوت ہو نہ ہو خوف زوال

۱۴  
احساں کے بے گروصلہ کی خواہش تم کو  
تو اس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو  
کرتے ہو گرا احساں تو کرو اُسے عام  
راتنا کہ ہساں میں کوئی ممنون نہ ہو

۱۵  
یا دُاس کی بہاں و رد مدام اپنا ہے  
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جسام اپنا ہے  
کس طرح نہ لیجئے کہ بے نام اُس کا؟  
کس طرح نہ کیجئے کہ کام اپنا ہے

## ڈاکٹر شیخ محمد اقبال - ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

سلسلہ میں پیدا ہوئے۔ وطن ماہون آپ کا سیالکوٹ ہے۔ لاہور کالج  
میں تعلیم پکار ایم۔ اے کی فوگری حاصل کی۔ ابتدا سے سن تیز سے طبیعت  
شاعری کی طوت اہل تھی۔ فن سخن کا صحیح مذاق سخن آفرین نے آپ کی  
طبیعت میں ودیعت کیا ہے۔ سلسلہ میں دوستوں کے اصرار سے انجمن  
حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں آپ نے خالہ ٹیکیم کے عنوان سے ایک  
قابل قدر نظم پڑھی۔ یہ نظم دل گداز اور موثر ہونے کی وجہ سے کچھ اسی مقبول  
خاص و عام ہوئی کہ میٹم خانے کے لئے چندے کی بارش ہونے لگی۔  
اسی نظم نے اس شہرت کی بنیاد رکھ دی۔ جو آپ اطراف ہنرمیں پھیلی ہوئی  
ہے۔ آپ عربی اور فارسی میں بھی قابلیت رکھتے ہیں۔ اور مسکرت سے بھی آشنا ہیں  
آپ کے کلام میں بھرتی کے شعر کم پائے جاتے ہیں۔ کوئی شعر رد۔ وحدت  
اخلاق کی چاشنی سے خالی نہیں ہوتا۔ مولانا سنیلی فرماتے تھے کہ ”جب  
آزاد اور حالی کی کڑیاں خالی ہوں گی۔ تو لوگ آپ کو ٹھونڈھیں گے“  
آپ کو تلمذ اگرچہ حضرت واع سے رہا ہے۔ مگر مشکل پسند طبیعت کے  
اتقنا سے مرزا غالب کی پیروی کرتے ہیں۔

## شب و شاعر

کیوں میری چاندنی میں پھر ناپے تو پریشیاں  
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو  
یا تو میرے جبین کا تارا گرا ہوا ہے  
خاموش ہو گئے ہیں تار رباب ہستی  
دریا کی تہ میں چشمِ گرداب ستور ہی ہے  
بستی زمین کی کیسی ہو گا نہ آفریں ہے  
شاعر کا دل ہے لیکن نا آشنا سکون سے  
آزاد رہ گیا تو کیونکر مرے فسوں سے

میں تیری چاندنی کی کبھیتی میں گھر لوٹا ہوں  
دن کی مشورٹ میں نکلتے ہوئے شراستے ہیں  
بچھ میں فرماؤ جو پہاں ہے سناؤں کہیں کو  
برق ایمن مرے سینہ میں پڑی روتی ہے  
صفتِ شمع لحدِ مردہ ہے محفلِ میری  
عبدِ حاضر کی ہوا راست نہیں ہے اس کو  
چھپ کے انسانوں سے مانند خرقہ ہوں  
عزلیتِ شب میں مرے اشکِ ٹپک چائے ہیں  
طپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کہیں کو  
دیکھنے والی ہے جو آنکھ کہاں سوتی ہے  
آہ اے رات بڑی دور ہے منزلِ تیری  
ابھی نقصان کا احسان نہیں ہے اس کو  
ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں  
تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں  
(اقبال)

## ستارہ

آمر کا خوف کہ ہے خطرہ سحرِ تجکو  
آلِ حسن کی کبائیں گئی خبرِ تجکو؟

متعلق توڑ کے ٹٹ جانے کا ہے ڈر نہ جو  
 زمیں سے ڈور دیا آسمان نے گھر نہ جو  
 غضب ہے پھر تری ٹھنی سی جان ڈرتی ہے  
 چکنے والے مسافر اے عجب یہ بستی ہے  
 آجکل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت مہر  
 وداغ غنچہ میں ہے راوی آفرینش کل  
 سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں

### ترانہ

ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا  
 سمجھو وہیں ہیں بھی دل ہو جہاں ہمارا  
 وہ سنتری ہمارا وہ پاسیاں ہمارا  
 گلشن ہے جن کے دم سے رشک جنناں ہمارا  
 اتر اترے کنارے جب کارواں ہمارا  
 ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا  
 اب تک گزرے ماقی نام و نشان ہمارا  
 صدیوں رہا ہے وطن و در زمان ہمارا  
 معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا  
 سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا  
 غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں  
 پرست وہ سب سے اونچا ہمایا سماں کا  
 گودی میں پہنچتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں  
 اے آبِ زور رنگا وہ دن ہے پیا نہ جو  
 مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا  
 یونان و مصر و روم سب مٹ گئے جہاں سے  
 کچھ بات ہے کہ ہستی بستی نہیں ہماری  
 اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

### شوالہ

حق کہہ دوں اے برہمن گرتو برہمن مانے  
 جنم کدوں کے بت ہو گئے پڑائے  
 اپنوں سے غیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا  
 جنگ و جدل سکھایا دعا غطا کو بھی خدا نے

وا غلط کا وعظ چھوڑا چھوڑے تڑے فسانے  
 بوٹوں کو پھونک ڈالا اس پس بھری ہونے  
 خاک وطن کا جگوہر ڈرہ دیوتا ہے  
 بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دولی ٹھا دیں  
 آہِ کُنیا شوالہ اس دیں میں بنا دیں  
 داماں آسماں سے اس کا کلسِ بلا دیں  
 اس ہر دوارِ دل میں لا کر جسے بٹھا دیں  
 اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں ملا دیں  
 یعنی صنم کرے میں شانِ حرم دکھا دیں  
 ہر آتما میں گویا اک آگ سے لگا دیں  
 اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں  
 جھوٹے ہوئے ترائے دنیا کو پھر سنا دیں  
 سارے چچاریوں کو سنے پیت کی بلا دیں  
 آوازہ اڈال کو ناقوس میں چھپا دیں  
 دھرموں کے یہ کھیرے اس آگ میں جلا دیں  
 رونا۔ ستم آٹھانا۔ اور ان کو پیار کرنا

ہنگام کے پس نے آخرِ دیر و حرم کو چھوڑا  
 کچھ فکر چھوٹ کی کر۔ مالی ہے تو چمن کا  
 پتھر کی سورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے  
 آبل کے غیرت کے پردوں کو پھر اٹھا دیں  
 سونے پٹی ہوئی ہے مدت سے جی کی بستی  
 دنیا کے پیرتھوں سے ادبچا ہوا پنا تیر تھ  
 پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو  
 شکر ہو اس کی صورت چھپ اس کی ڈھنی ہو  
 زنا ہو گئے ہیں۔ تبلیغ ہاتھ میں ہو  
 پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا  
 آنکھوں کی ہے جو گنگا لے کے اس سے پانی  
 ہندوستان لکھ دیں مانگے پہ اس صنم کے  
 ہر صبح اٹھ کے گامیش مندر وہ ٹٹھے ٹٹھے  
 مندر میں ہو بلانا جس دم بہ بچاریوں کو  
 آگنی ہے وہ جو زنگن کہتے ہیں بہت جس کو  
 پتہ بہت عاشقوں کی تن من نشان کرنا

## ایک آرزو

کیا لطفِ انجمن کا جب دل ہی بچھ گیا ہو؟  
 ایسا سکوت جس پر تقسیم بھی خدا ہو  
 دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھوٹا ہو

دنیا کی مصلوں سے اکٹا گیا ہوں یا رب!  
 شورش سے ہوں گریزاں دل ڈھونڈتھا ہے میرا  
 مرنے والوں خاموشی پر یہ آرزو ہے میری

لذت سرو کی بو چڑیوں کے چھپوں میں  
 آغوش میں زمین کی سویا ہوا ہو سبزہ  
 گل کی کلی چمک کر پیغام دے کسی کا  
 صفت باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں  
 ہوں قرب ایسا کسار کا نظارہ  
 بھری لگائے سورج جب شام کی دھن کو  
 راتوں کے چنے والے بارہ جائیں تھک کے جہم  
 پچھلے پہر کو کھل وہ صبح کی مؤذن  
 کانوں پہ ہونہ میرے دیو نرم کا احسان  
 پچھلوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرائے  
 دل کھول کر ہواؤں اپنے وطن پہ آنسو  
 اس خاموشی میں جائیں اسنے بلند ناسے  
 ہر درد مند دل کو رونما راز لاسے

## راز حسی

زندگی انسان کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں  
 گل تبسم کہہ رہا تھا زندگی کو مگر  
 راز حسی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو  
 ہنسوں کی سمجھ گھڑانی سے پیری میں کام  
 زائران کعبہ سے اقبال یہ پوچھے کوئی  
 کیا حرم کا تختہ زم زم کے سوا کچھ بھی نہیں  
 دم ہوا کی موج ہے دم کے سوا کچھ بھی نہیں  
 شمع بولی گمراہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں  
 کھل گیا جس دم تو حرم کے سوا کچھ بھی نہیں  
 صبح کے دامن میں شبنم کے سوا کچھ بھی نہیں

(اقبال)

## خان بہادر سید اکبر حسین رضوی

اکبر - تخلص - اکبر حسین نام - الہ آباد کے رہنے والے - منشی غلام حسین صاحب و تحید الہ آبادی (شاگرد خواجہ آتش) کے شاگرد رشید - بلکہ سرمایہ نماز اور فخر استاد تھے - عربی فارسی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے - اور زبان انگریزی اور اُس کے علم ادب سے بخوبی ماہر تھے - مغربی خیالات کو بطور احسن ایٹھائی لباس پہنانے میں سامی رہتے تھے - اور عمدہ طور پر کامیاب بھی ہوتے تھے اکثر مشاہیر انگلستان کے کلام کا اردو میں بہت ہی خوش اسلوبی اور رنگ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے ایٹھائی طرز قدیم میں بھی بہت بلند پایہ ناظم و شاعر تھے - قوتِ مخیلہ و تمیز و دونوں میں اعلیٰ درجے کا حصہ نظر آتا آپ کی طبیعت میں وراثت ہوا ہے - چنانچہ قلم و تہذیب مغربی کا جو روز افزوں اثر ہمارے ہندوستانی نوجوانوں پر پور ہوا ہے - اور اُس سے جو نتیجہ پیدا ہوا ہے - اور پورے ہیں - اُن کے متعلق آپ اکثر نہایت قابلِ قدر خیالات ظاہر فرماتے رہتے تھے - زبان نہایت صاف اور پاکیزہ اور طرز بیان سید و دلکش ہے - لفظ کوئی اور بندہ سبھی آپ کی شوخ طبیعت کا ایک اونسٹا جو ہر ہے - مگر ساتھ ہی مضمون آفرینی اور نازک خیالی سے خالی نہیں - عاشقانہ رنگ کے شعر میں بات پیدا کرتی ان کی حدت پسند طبیعت کا ایک خاص مذاق ہے - کلام میں صفائی و سادگی اپنے اپنے محل و موقع پر دل آویز جھلک دکھاتی ہیں - انھیں آپ کا کلام برگزیدہ و پندیدہ خاص و عام ہے - عیوب شاعری سے بچتا و نقائص سے سراسر معزا ہے - ہر رنگ - ہر بحر - ہر زمین میں کامل دسترس تھی پر دیکھل اور سوشل معاملات میں آپ کی رائے نہایت منہج و مناسب ہوتی تھی - خیالات بھی نہایت شلیختہ ہوئے اور اکثر اچھوٹے ہیں اپنے طرز خاص میں مسلم الشہوت استاد مانے جاتے ہیں - آپ کے تین دیوان مرقب



ہو گئے ہیں۔ جو چھپر شائع ہو چکے ہیں۔ جو تھا بھی شروع ہو چکا تھا کہ اس جہان فانی سے آپ نے رحلت فرمائی۔

آپ نومبر ۱۸۸۷ء کو مقام بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ دینی مکاتیب اور سرکاری مدارس میں تعلیم پاکر ۱۸۹۷ء میں امتحان وکالت درجہ اولے پاس کیا۔ ۱۸۹۹ء میں ناٹ تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں ہائی کورٹ کے مسل خواں مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں وکالت درجہ اعلیٰ کی سند حاصل کر کے ۱۹۰۵ء تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں دوبارہ سرکاری ملازمت کی۔ منصفی سے درجہ ہدیرہ جی کر کے ۱۹۰۷ء میں سب جج اور ۱۹۰۹ء میں جج عدالت خفیہ درجہ اول۔ اور سیشن جج مقرر ہوئے۔ اور کئی سال تک ہزار بارہ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پاتے رہے۔ ۱۹۱۷ء میں اپنے مستقل عہدہ ججی عدالت خفیہ الہ آباد سے عیادت نیک نامی کے ساتھ پیشی لے کر علیحدہ ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں گورنمنٹ نے جڈیشل سروس کے صلہ میں شامی پور کا خطاب مرحمت فرمایا۔ الہ آباد میں جڈیشل کے فیلو بھی مقرر ہوئے۔

حضرت اکبر موجودہ عہد کے آن منتخب شعراء اردو میں سمجھے جاتے تھے جنہوں نے زمانہ کے میلان عام اور جدید اثرات سے متاثر ہو کر شاعری کے لئے نئی راہیں نکالیں۔ ان کے کلام میں سنجیدہ اور نتیجہ خیز ذوق کی آبروش ایک ایسا دلکش سخن ہے۔ جو ان کو اپنے تمام ہمعصرین میں نمایاں کرتا ہے۔

## غزلیات

کہو کیسے گا حفاظت مری خدا میرا  
خدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ  
زہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا  
تو ذرہ ذرہ عالم ہے آشنا میرا  
بجائے جنت سے تو پوچھے کوئی پتا میرا  
مری حقیقت ہستی یہ مشت خاک نہیں

آنکھیں ہے عقل جو محتاج غیر ہیں ہر دم  
غور آنکھیں ہے تو جھکو بھی ناز ہے اکبر  
مجھے ہے عشق کہ جو خود ہے مدعا میرا  
سوا خدا کے سب آن کا ہے اور خدا میرا

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا  
اس نے خدا کو مانا وہ ہور ہاتھوں کا  
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا  
عشق تھاں کو لیکن نقش قلوب دیکھا  
اور وہ پہ مسترض تھے لیکن جو آنکھ بھولی  
تو پایا نام خدا کو اکثر زیب زباں

بوجھ گیا - وہ کھانا - دانا کا نام چٹا  
رونا تو ہے اسی کا کوئی نہیں ہے اپنا  
اسے برہنہ ہمارا تیرا ہے ایک عالم  
یہ دھوم و دھام کیسی؟ شوق نمود کیسی؟  
بے عشق کے جوانی کتنی نہیں مناسب  
ہم خواب دیکھتے ہیں تو دیکھتا ہے سہیل  
کجی کو دل کی صورت آتا نہیں نظر بیا  
کیونکر کہوں کہ اچھا ہے چٹھہ کا دینا

لے گیا تھا طرغ گور غریباں دل زار  
وہ جو تھے رونق آبادی گلزار جہاں  
کل تلک محفل عشرت میں جو تھے صدر نشین  
بس کہ بی رنگی عالم پہ اسے حیرت تھی  
میر جہنم کے کا سے میں بھری تھی حسرت  
کیا کہیں تم سے جو کچھ داں کا تاشا دیکھا  
میر سے پاتا تھا آنکھیں خاک رو صحر دیکھا  
قریں کج آنکھیں ہے کس و ننہا دیکھا  
آئینہ خاک سکندر کو میرا دیکھا  
یاس کو مستغف ترست دارا دیکھا

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا  
دین ہو تا ہے ہزرگوں کی نظر سے پیدا

جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات  
برج و دنیا سے بہت مضطرب و محال تھا یہ

سب سے کر قطع نظر ہر خیالِ رُوسے دوست  
گوشِ عارف کے لئے قائم ہے صُورتِ سرمدی  
گردنِ ارض و سما ہے خضر راہِ معرفت

شورِ بلبل - جوشِ گل - موجِ نسیم - انوارِ صبح  
آفتابِ اوجِ سعادت کا ہے وہ روشِ شمس  
جلوہِ حق کے مقابلِ رُوسے بہت ہے بے فربہ  
واہ کیا کہنا ہے تیرا اے نسیم صبحِ خیر  
عاشقِ دنیا کو کیوں آئے خیالِ آخرت؟  
عہدِ پیری آگیا اکیر سے سمجھا لو اپنے ہوش

بہارا آئی کھلے گلِ زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر  
بچھا فرشِ زرد و بہتا ہم سبزہٴ نور میں  
عروجِ نشہ و تشو و نہاسے ڈالیاں تجھ میں  
بلا میں شلخِ گل کی لیں شہِ جگہ جگہ ہی میں  
جو اناں جن نے اپنا اپنا رنگ دکھایا  
کیا بھوؤں نے شہر سے وصلِ محبت گدڑاں میں  
ہو اسے شوق میں شاخیں چھکین خالق کے عہد سے کو

خیر خواہی وہ نہیں ہے جو پوڈر سے پیدا  
دل میں تسکین ہوئی نہ نہجِ اثر سے پیدا

یاں ہر اک شے کو سمجھ کے جس حالِ رُوسے دوست  
وڑہ وڑہ کہہ رہا ہے اس کے حالِ رُوسے دوست  
مہر و نہ ہیں شاید اوجِ کمالِ رُوسے دوست

اللہ! کس قدر میں دل کشا آثارِ صبح  
نورِ طاعت جس سے ظاہر ہو دمِ آثارِ صبح  
ہے پیامِ مرگ شمعوں کے لئے دیدارِ صبح  
تیرے دم سے ہے چین میں گرمی بازارِ صبح  
کس نے پروائے کو پایا شائستہ دیدارِ صبح  
خوابِ غفلت سے تھکھو پیدا ہوئے آثارِ صبح

عنادل نے جنائی و عہوم سرگرم فناں ہو کر  
چلی مستان و شش باوصیا غنیمتِ فناں ہو کر  
ترائے کائے فرغانہ جن سے شاد ویاں ہو کر  
ہوئیں کلیاں شگفتہٴ رُوسے نگینِ فناں ہو کر  
کسی نے یا نہیں ہو کر کسی نے ارغواں ہو کر  
صدائے نغمہٴ بے بسی اٹھی بانگِ اناں ہو کر  
ہوئی تیغ میں مصروف ہر تپ زباں ہو کر

زبان برگ گل نے کی وعا رنگیں عبارت میں  
نگاہیں کالموں کی ٹہری جاتے ہیں زمانے میں

۹  
فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں  
معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے  
خافلوں کے لطف کو کافی ہے دنیاوی خوشی  
کشتی دلی کی الہی! بحر ہستی میں ہو خیر  
خافلوں کو کیا سناؤں داستان عشقِ پیار  
زندگانی کا مزا ملتا تھا جس کی برہم ہیں  
صحن ظاہر ہو گیا سرمایہ زیب و صفا  
پہنچتے طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر  
شیخ صاحب برہن سے لاکھ برہن دوستی

۱۰  
نہیں جتنا کسی کا نقش اس دنیاے فانی میں  
سکون قلب کی دولت کہاں دنیاے فانی میں  
اجل کی نیند آجاتی ہے آخر سٹپنے والوں کو  
جہاں اپنی خودی سے بس یہی کہتا ہوا گذرا  
پوچھ اسے ہم نفس! وہ قصہء طیش و طرب ہم  
اسی صورت میں وکاش خوبی الفاظ ہوتی ہے  
زبان حال سے پروانہ بسمل یہ کہتا ہے  
فلک نے مصفل کر کے نہیں خس کرو یا آخر

حباب آسا رشا! ابھرا جو بحر زندگانی میں  
بس اس غفلت سی ہو جاتی ہے اور وہی حالی میں  
قیامت کا اثر پاتا ہوں دنیا کی کہاں میں  
نشاں تھا۔ ہولنے اک گرہ دے دیکھی پانی میں  
کسے آپ یاد ہے اک خواب دیکھا تھا جوانی میں؟  
کہ حسنِ یار کا پیدا کرے جلوہ معانی میں  
”حضور کی ہوا اگر حاصل مزا ہے ہم جانی میں  
پہنچے جاتے ہیں بے مقصود بحر زندگانی میں

اواسے شکر کر کے احراز واسطے ہے اسے اکبر  
ہزاروں آفتیں شامل ہیں ان کی مہربانی میں

۱۱

ختم کیا صبا نے رقص۔ گل پہ نثار ہو چکی  
رنگ ب پذیر مانہ کو دیکھو کے گل نے راہ لی  
رنگ ب نقشہ مٹ گیا۔ سنبھل تر نہیں رہا  
مستی لالہ اب کہاں؟ اس کا پیالہ لے کر کہاں؟  
مرث وہ جو بختی بدل گئی۔ آئی بس اور گل گئی  
اب تکہ اکی روش پہ ہے اکبر مست و بے خبر  
چوٹ نہ بٹا ہو چکا۔ علوت ہزار ہو چکی  
لطف نسیم ہو چکا۔ کاوش خار ہو چکی  
صحرا حرم میں زینت نقش و نگار ہو چکی  
دور طرب گذر چکا۔ آمد یار ہو چکی  
کتھی جو ہوا میں نکست مشکب تثار ہو چکی  
کہہ دے کوئی عزیز من ضیل بہار ہو چکی

۱۲

دلوں کو لذت مستی کا اب جس بھی نہیں باقی  
حدیث آرزو ہے قرب باری ہے نظر کس کی؟  
ہو اسے واویلا کہیں کہاں اب گلشن دل میں؟  
معاذ اللہ! غفلت باریاں یہ ابریز رہی ہیں  
بطارے نہ پناہی، شہینا کی حریفان ہیں  
جیسے دیکھو قلیل صورت دنیا سے فانی ہے  
خدا اک لفظ ہے اور شوق موسیٰ کی کہانی ہے  
مدہ آرزنی کا خرمن ہے نہ شوقیٰ ن ترانی ہے  
کوئی آلودہ آرز کوئی مصروف خیالی ہے  
جو اسے اکبر کچے فوٹ جیسا، جاودانی ہے

۱۳

دل مبتلا سے غفلت کو ہے محو وہ فانی  
جو کہہ گیا خودی سے کوہ علی کیا آئی ہے  
میں زبان پہ لاؤں کیچو وہ حدیث سخن شافی؟  
یہ کچھ کیا وہی ہے مرے پر وہ کس میں  
جو خدا کی یاد آئے۔ تو آئی کی مہربانی  
نہ ہو اسے رتبہ آرزنی نہ خدا سے کون ترانی  
کہ نہ بار لفظ اٹھائے گی نزاکت معانی  
مجھے اب تو سانس لینا ہی ہے لطف زندگانی

### رباعیات

کھولی ہے زبان خوش بیانی کے لئے  
آٹھا ہے غم گدہ فشانے کے لئے

آیا ہوں میں کوچہ سخن میں اکبرؑ نظارہ شاہر معانی کے لئے

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا؟ غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا  
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن کم تجھیں بخدا کہ جن کو بنایا پایا

انقلاب جہاں کو دیکھ لیا محبت دنیا سے قلب پاک ہوا  
کل کئی کھل کے ہو گئی تھی پھول پھول مچھلا کے آج خاک ہوا

لانڈی سے ہو نہیں سکتی فلاح قوم ہرگز گذر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ  
کبے سے بہت نکال دیے تھے رسول نے اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

پیری آئی ہوئی جوانی رخصت ہے اب تو اسی کا انتظار ہے اکبرؑ  
ساتھ اس کے وہ لطف زندگانی رخصت ہم کو بھی کرے جہاں فانی رخصت

دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد ڈوہی پڑیں ہیں بس محافظ دل کی  
انکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد عقیقہ کا تصور اور اللہ کی یاد

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش اکبرؑ تو سرور طبع کو غلم میں ڈھونڈھ  
ذلت ہے دراصل چاہ و شکوک کی تلاش محنت میں کر سکوں راحت کی تلاش

بے غیرت و خود فروشی و جاہل سے نابل حق سے جم ہو غافل ایسے غافل سے نابل

یکجا کر دیں حوادثِ دہر اگر جائز ہے کہ اُن سے مل۔ مگر دل سے نرمل

۹ اس رزم سے سب کے سب اٹھے جاتے ہیں  
تسکین کے جو تھے سبب اٹھے جاتے ہیں  
اک قوتِ مذہبی عقیدوں سے نکلی  
وہ بھی تو دلوں سے اب اٹھے جاتے ہیں

۱۰ اگر چہ میں زرنیں تو راحت بھی نہیں  
باز وہیں سکنت نہیں تو عورت بھی نہیں  
اگر علم نہیں تو زور و زہ سے بے کار  
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

۱۱ بے صبر و قناعت اک بڑی چیز اکبر  
لذت ابھی اس کی تو نے کچھ ہی ہے کہاں؟  
دنیا طلبی کے وعظ میں محو ہے تو  
یہ بھی تو ذرا سمجھ کہ رکھی ہے کہاں؟

۱۲ خاطر مضبوط دل تو انا رکھو  
آئینہ اچھی خیال اچھا رکھو  
ہو جائیں گی مشکلیں تمہاری آساں  
اکبر اللہ پر بھروسہ رکھو

۱۳ اعمال کے جن سے شغور نہا سیکھو  
اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو  
قربے سے مفسر نہیں بٹے چاہے اکبر  
بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

۱۴ اللہ کا صدقِ دل سے جو طالب ہو  
خیرت نہیں گر ملک کا ہم غالب ہو  
ہرگز نہ بڑھیں گے اُس سے نیچر کے مرتب  
مکن نہیں جہنم رُوح پر غالب ہو

۱۵ جس بات میں تم شکستِ ملت سمجھو  
اُس میں شرکت کو اپنی ذلت سمجھو

جو بندہ نفس ہو مخالف اُس کا قومی غیرت کی اُس میں قلت سمجھو

۱۶

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو باتیں جو بُری ہیں اُن سے پرہیز کرو  
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر اُس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

۱۷

دُنیا سے دُنی کی آہ ہو اُس جانے دو گلچیں ہو اگر تو خار و خِش جانے دو  
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

۱۸

اکتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی ”اپنی اپنی روش پر تم نیک رہو  
لاٹھی ہے ہوا سے دھری پانی بنی چاؤ موحوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

۱۹

تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی اور ذکر خدا سے جس نے راحت پائی  
کوئی نہیں خوش نصیب اُس سے بڑھکر بس دونوں جہاں کی اُس نے نعمت پائی

۲۰

خواہش ہے تجھے اگر غنی بننے کی دولت کی ہو اُس ہے اور دھنی بننے کی  
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے بندے! کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی





CALL No. ۸۹۱۶۴۳۴ ACC. NO. ۴۷۳۱  
 AUTHOR جلال الدین محمد جعفری  
 TITLE فتنہ دہلی

۵۳۹۸ ۸۹۱۵۲۳۲

تحریر عبد اللہ الحق

Date	No.	Date	No.

DATE AT THE TIME



**MAULANA AZAD LIBRARY  
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY**

**RULES:—**

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1.00 per volume per day shall be charged for text-books and 10 Paise per volume per day for general books kept over-due.

